ستمبر 2012

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

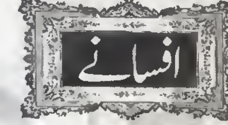
شعاع





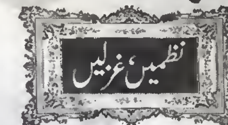
ناولٹ

سنڈریلا	فائزہ افتخار	234
دیدۂ بینا	ام طیفور	142



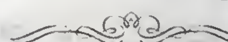
افسانے

دو ٹکے کا آدمی	کنیز نبوی	136
کھیل ختم	سمیرا حمید	224
چپ کے دکھ	فرح طاہر	60
وہ محتسب ہے	ام مریم	66



نظمیں، غزلیں

غزل	ساغر صدیقی	266
غزل	عینی زا سید	266
نظم	انور خالد	265
غزل	خمار بارہ بنکوی	265



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

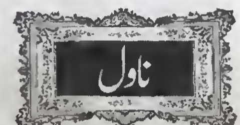
پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	10
حمد	اقبال عظیم	11
نعت	سراج المنیر تسنیم	11
نبیؐ کی باتیں	ادارہ	12



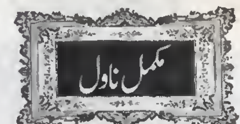
انٹرویو

بندھن	عائشہ گل	17
دستک	شاہین رشید	24
شاعری	امبر خالد	280



ناول

دلوار شب	عالیہ بخاری	36
ستارۂ شام	آمنہ ریاض	158



مکمل ناول

جنت کے پتے	نمرہ احمد	180
دل موم کا دیا	سائرہ رضا	74





مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	28
مسکراہٹیں	سائرہ غلام نبی	267
آئینہ خانے میں	تبصیر نشاط	282
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	271
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	286
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	278
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	274
خوبصورت بنیے	ادارہ	290

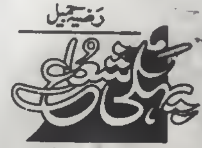
ستمبر 2012
جلد 27 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۱ اے، ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل



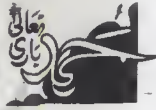
شعاع کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
پچھلا شمارہ سالگرہ نمبر تھا حسب روایت قارئین نے سالگرہ نمبر کی بھرپور پذیرائی کی۔ خط لکھ کر، فون کر کے اپنی پسندیدگی اور پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا۔ ان تمام خطوط کی اشاعت اور فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ ہم ان تمام بہنوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھے۔ آپ کے خطوط نہ صرف ہمارے لیے آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ ہمیں اپنی قارئین کی صلاحیتوں اور ذہانت سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ دور دراز کے کسی چھوٹے سے گاؤں سے آئے ہوئے یہ خطوط ہمیں بتاتے ہیں کہ شعاع کی شعاعیں کتنی دُور دُور پھیل رہی ہیں۔ شعاع کی قارئین کتنی ذہین اور باصلاحیت ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار وہ کتنی خوبصورتی سے کرنے پر قادر ہیں۔
شعاع آج مقبولیت کی اس منزل پر ہے جہاں بے شمار قارئین اسے پڑھتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہمارے لیے اس مقبولیت کو، اس اعتماد کو قائم رکھنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھنا بہت بڑا امتحان ہے۔ ہم ہر گھڑی اسے خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے میں آپ لوگوں کا تعاون، اعتماد، مشورے اور محبتیں ہمارا حوصلہ بندھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شعاع کا معیار ہمیشہ قائم رہے اور آپ کی محبتیں یونہی ہمارے ساتھ رہیں۔

اس شمارے میں،

انسان اس کائنات کی سب سے پیچیدہ اور غیر یقینی تخلیق ہے۔ وہ کس پل کیا کر جائے، کون سا روپ اختیار کر جائے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ناقابل فہم رویوں کی لاکھ توجیہیں پیش کی جائیں لیکن اس معمے کو حل کرنا آسان نہیں۔ کوئی دوسرا تو کیا کبھی کبھی انسان اپنے آپ کو خود بھی نہیں سمجھ پاتا۔ وہ اپنے رویوں کے پس پشت جذبات و احساسات سے لاعلم رہتا ہے۔
سائرہ رضا نے ایک ایسے ہی کردار پر مکمل ناول لکھا ہے۔ یہ ان کا قریبی مشاہدہ ہے، جسے انہوں نے بڑی خوبصورتی سے کہانی کا روپ دیا ہے۔ آپ اس ناول کو پڑھ کر اس کردار کے بارے میں اپنا تجزیہ ضرور لکھیں۔

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے ایک نئے موڑ پر،
- فائزہ افتخار اور ام طیفور کے ناولٹ،
- کنیز نبوی، سمیرا حمید، اُمّ مریم اور فرح طاہر قریشی کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- عائشہ گل اور محمد امین پراچہ کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ بندھن،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

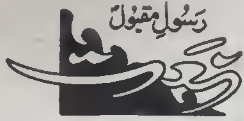
شعاع کا یہ شمارہ کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔



اقبال عظیم

تیری مدحت اور میں، معذور و سرتاپا قصور
میں کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ، اتنا شعور
صرف تیرے آسرے پر لب کشا ہوتا ہوں میں
اس سعادت کی مجھے توفیق دے ربِّ غفور
غنچہ و گل آئینہ تیرے جمالِ قدس کا
ماہ و انجم سے عیاں تیری تجلّی تیرا نُور
ہے رواں تیرے اشارے پر نظامِ کائنات
گردشِ افلاک بھی سجدہ کناں تیرے حضور
ذرّہ ذرّہ خاک کا تیری عظمت کا نقیب
بوٹا بوٹا گلستاں کا تیری قدرت کا ظہور
سرخرو ہیں تیری رحمت سے ترے سجدہ گزار
سرنگوں ہے تیرے آگے کفر و باطل کا غرور
مل چکا اقبال کو سب کچھ تری سرکار سے
بخش دے اس کی خطائیں بھی مرے ربِّ غفور

رسولِ مقبولؐ



سراج المنیر تسنیم

زبان پر محمدؐ کا نام میرے اللہ
درودوں کا لطف کلام میرے اللہ
روضۂ پاک خیر الانعام میرے اللہ
کس قدر ہے ادب کا مقام میرے اللہ
قرینہ سکھایا ہے جینے کا ہم کو
شریعت بھی کیا ہے نظام میرے اللہ
آسمان و زمین، چاند، سورج تارے
سبھی بھیجتے ہیں سلام میرے اللہ
دل ہے مسرور یادِ محمدؐ میں ایسے!
جیسے تسنیم و کوثر کا جام میرے اللہ
سامنے مصطفیٰؐ کے حقیقت کیا ان کی
پھول ہوں یا کہ ماہِ تمام میرے اللہ
دُعائیں قبول ہو گئیں تیری تسنیم
مدینے سے آیا پیام میرے اللہ

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

صبر کا اجر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا وہ مومن بندہ جس کی محبوب ترین چیز میں واپس لے لوں، لیکن وہ اس پر ثواب کی نیت (سے صبر و رضا کا مظاہرہ) کرے، اس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے۔" (بخاری)

فائدہ : بچے، بیوی اور والدین وغیرہ یہ سب انسان کے لیے محبوب ترین چیزیں ہیں۔ ان کی وفات پر اللہ کا حکم سمجھ کر صبر کرنا کمال ایمان کی علامت ہے اور بے صبری، جزع فزع اور اول فول بکنا ضعف ایمان کی دلیل۔ پہلی بات کا صلہ جنت ہے اور دوسری بات اللہ کی ناراضی کا باعث۔

عذاب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا۔

"یہ عذاب تھا، جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا، اسے نازل فرماتا۔ اب اللہ نے اسے مومنوں کے لیے رحمت (کا ذریعہ) بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو بندہ طاعون (کی بیماری) میں مبتلا ہو جائے اور وہ اپنے (طاعون زدہ) شہر ہی میں صبر کرتا ہوا ثواب آخرت کی نیت سے ٹھہرا رہے۔ اسے یقین ہو کہ اسے وہی کچھ پہنچے گا، جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے تو ایسے شخص کے لیے شہید کی مثل اجر ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ طاعون یا اسی قسم کی دیگر وبائی بیماری میں اللہ کی تقدیر و مشیت پر ایمان رکھتے ہوئے اسی شہر میں رہنا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں جزع فزع اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا، ایک مومن کو شہادت کے رتبے سے ہمکنار کر سکتا ہے، اسی طرح اور بھی بعض لوگوں کو یہ اجر ملے گا، مثلاً "غرق ہو کر مرنے والوں کو، حالت زچگی میں فوت ہونے والی عورت کو وغیرہ وغیرہ۔

2۔ یہ حکم اس لیے ہے تاکہ یہ وبائی مرض دوسرے شہروں میں نہ پھیلے۔ علاوہ ازیں دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے لیے حکم ہے کہ وہ طاعون زدہ شہر میں جانے سے اجتناب کریں۔

3۔ اس سے معلوم ہوا کہ حفاظت اور علاج کے اسباب اختیار کرنا، تقدیر الٰہی پر ایمان رکھنے کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح مرض پر صبر اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر رضامندی کی دلیل ہے، جو کمال ایمان ہے۔

4۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید بیماری از خود متعدی ہوتی ہے، اس لیے طاعون میں مبتلا شخص کو دوسری جگہ جانے سے روکا گیا ہے۔ جبکہ دوسری حدیث میں ہے کہ بیماری متعدی نہیں ہوتی۔ اس کی تطبیق یہ ہے کہ سد ذریعہ کے طور پر روکا گیا ہے کہ کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کا یہ عقیدہ نہ بن جائے کہ مجھے فلاں کی وجہ سے بیماری لاحق ہوئی

ہے۔

آنکھیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب میں اپنے بندے کو اس کی دو پیاری چیزوں کے ذریعے سے یعنی آنکھوں سے محروم کر کے آزماؤں، پس وہ اس پر صبر کرے تو میں اس کے بدلے میں اسے جنت دوں گا۔" (بخاری)

فوائد مسائل :

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بطور احسان ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ عدم بصارت (آنکھوں کا نہ ہونا) دنیا میں بہت بڑی محرومی ہے اور اللہ تعالیٰ جزا بھی بقدر مشقت عطا فرماتا ہے، اس لیے اس محرومی پر صبر بہت بڑا عمل ہے۔ جس کی جزا جنت ہے، بشرطیکہ نابینا ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔

جنتی عورت

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا۔ "کیا میں تجھے جنتی عورت نہ دکھلاؤں؟" میں نے کہا۔ "کیوں نہیں (ضرور دکھلائیے)!" انہوں نے فرمایا، ایک کالی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا "مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے، جس سے میں ننگی ہو جاتی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے اللہ سے دعا فرمائیں (کہ اس بیماری سے مجھے نجات مل جائے)۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تو چاہے تو اس تکلیف پر صبر کر، اس کے بدلے میں تیرے لیے جنت ہے اور اگر تو چاہے تو میں اللہ سے دعا کر دیتا ہوں کہ اللہ تجھے اس بیماری سے عافیت دے دے۔"

اس نے کہا "میں صبر ہی اختیار کرتی ہوں، تاہم (دورے کے وقت) میں ننگی ہو جاتی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے یہ دعا فرما دیں کہ میں ننگی نہ ہوا کروں"۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ رخصت کے مقابلے میں عزیمت کو اختیار کرنا، بشرطیکہ انسان اسے استقلال کے ساتھ برداشت کرے، بہت اجر و ثواب کا کام ہے۔ اسی طرح علاج معالجے کے ساتھ، بارگاہ الٰہی میں دعا سے بھی اجتناب نہ کیا جائے۔ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔

2۔ بیماری اور آزمائش سے عافیت طلب کرنی چاہیے اور صحت کو غنیمت سمجھنا چاہیے، تاہم بیماری کی حالت میں صبر کیا جائے۔ واویلا اور ناشکری سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس سے بیماری تو کم نہیں ہوتی البتہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

بیماری اگر طول پکڑ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونے اور شکوہ کرنے کے بجائے تقدیر پر راضی رہنا چاہیے۔

3۔ کسی سے دعا کروانا صبر کے خلاف نہیں ہے، تاہم دور حاضر میں مشکل کے وقت مزاروں اور قبروں سے مانگنا جائز نہیں۔ خاتون کے عقیدے کا بھی علم ہوتا ہے کہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ نہیں کہا اسے درست کر دیں بلکہ یہ کہا اللہ سے دعا کریں۔ مجھے درست کر دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ صحت اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، اس قسم کے اختیارات اسی کے پاس ہیں، اس کے علاوہ کوئی مختار کل، مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہے۔

دعوت حق

ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہ السلام میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، جنہیں ان کی قوم نے مار کر لہولہان کر دیا اور وہ اپنے چہرے سے خون

پوچھتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یااللہ! میری قوم کو معاف فرمادے' اس لیے کہ وہ بے علم ہے۔(بخاری و مسلم)

فوائدومسائل : 1۔ بعض کے نزدیک یہ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام اور بعض کے نزدیک خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اخلاق وکرم کا بیان ہے جس میں داعیان دین کے لیے بڑا سبق ہے کہ تبلیغ ودعوت کی راہ میں تکلیفیں برداشت کی جائیں' لوگوں کی بداخلاقی اور بدسلوکی کے مقابلے میں عفوو درگزر سے کام لیا جائے اور اللہ سے ان کے لیے معافی اور ہدایت کی دعا مانگی جائے' نیز جاہلوں سے جاہلوں والا معاملہ نہ کیا جائے۔ یہ اخلاقی خوبی اور کردار کی بلندی' ایک داعی دین کے لیے نہایت ضروری ہے۔

دنیا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے:

"دنیا ملعون ہے۔ اس میں جو کچھ ہے' سب ملعون ہے' سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس سے تعلق رکھنے والی اشیا کے اور سوائے عالم اور طالب علم کے۔"

فوائدومسائل :

1۔ لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی ہے' یعنی دنیا چونکہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے' اس لیے یہ لعنت کا باعث ہے۔

2۔ ہروہ چیز یا عمل جس کا اللہ کی یاد سے کسی بھی انداز سے کوئی تعلق ہو' اس پر یا اس کی وجہ سے رحمت نازل ہوتی ہے' چنانچہ تلاوت' نماز' اللہ کے لیے جانور کی قربانی اور حج وعمرہ کے اعمال سب رحمت کا باعث ہیں۔ ایسے اعمال انجام دینے والا اللہ کی لعنت سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح کعبہ' صفا ومروہ' منیٰ' عرفات' مزدلفہ اور ہر مسجد ومدرسہ اللہ کی رحمت کے مقامات ہیں۔ یہاں دین کی خدمات انجام دینا اور دین کے خادموں کی ضروریات مہیا کرنا' دینی کتابیں چھاپنا اور دوسروں تک پہنچانا' ان کی تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا' علماء وطلباء کی ضروریات پوری کرنے کی نیت سے حلال روزی کمانا' یہ سب اللہ کی رحمت کے اسباب ہیں۔

3۔ دین کے علم سے کسی بھی انداز سے منسلک ہونا اللہ کی رحمت کا باعث ہے' اس لیے اگر دنیوی علوم وفنون بھی خدمت دین کی نیت سے حاصل کیے جائیں تو وہ بھی دین کے خادم علوم ہونے کی وجہ سے لعنت کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو یہ علوم رحمت کا باعث نہیں ہوں گے۔

4۔ حلال روزی کمانا اللہ کا حکم ہے' اس لیے اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے حلال روزی کمانا اور حلال کاموں میں خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔

دنیا قید خانہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔"

فوائدومسائل :

1۔ جس طرح قیدی جیل میں بہت سے قوانین کا پابند ہوتا ہے' بلا اجازت وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مومن دنیا میں من مانی نہیں کرتا بلکہ ہر قدم پر اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے' اس کے بدلے میں اسے جنت ملے گی۔

2۔ کافر دنیا میں آزادی کی' یعنی بے قید زندگی گزارتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے جہنم کا عذاب ملنے والا ہے۔ جہنم کے عذابوں کے مقابلے میں دنیا کی سخت سے سخت زندگی بھی جنت کے برابر ہے۔

جس شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی

حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں جنت والے نہ بتاؤں؟ ہر ضعیف آدمی' کمزور سمجھا جانے والا (جنتی ہے)۔ کیا میں تمہیں جہنم والے نہ بتاؤں؟ ہر درشت خو' زرپرست' متکبر (جہنمی ہے۔)

فوائدومسائل :

1۔ "کمزور سمجھا جانے والا" سے مراد شریف النفس آدمی ہے' جو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی زیادتی کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں' اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کے شر وغیرہ ہی کا کوئی خوف ہوتا ہے۔

2۔ انفرادی معاملات میں نرمی اور درگزر کا چلن عام ہو جائے تو معاشرہ امن کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ فساد ہمیشہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اپنی مالی' جسمانی یا خاندانی اور افرادی طاقت پر گھمنڈ کرکے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پر زیادتی نہ کرے' خواہ اسے کمزور سمجھا جائے تو یہ اعلا اخلاق کا نمونہ ہے' جس کا ثواب جنت ہے۔

3۔ درشت خو سے مراد بات چیت کے انداز میں اور برتاؤ میں سختی اختیار کرنے والا ہے۔ اس قسم کے بداخلاق آدمی سے ہر کسی کا جھگڑا ہوتا ہے جس سے فساد جنم لیتا اور بڑھتا ہے۔

4۔ یعنی ایسا حریص آدمی جو مال جمع کرتا رہتا ہے لیکن بخیل بھی ہے' خرچ نہیں کرتا۔ مومن میں حرص اور بخل کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ منافقوں اور کافروں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

5۔ تکبر سے مراد دوسرے کو حقیر سمجھنا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود تسلیم نہ کرنا ہے۔ یہ برتری کا غلط احساس بہت سی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے۔

قابل رشک مومن

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو' اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گمنام ہو' اس کی پروا نہ کی جاتی ہو' اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کا لالچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے' اس کا ترکہ تھوڑا ہو' اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔"

سادگی

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سادگی ایمان میں سے ہے۔"

راوی نے کہا: سادگی سے مراد معمولی لباس وغذا پر اکتفا کرنا ہے۔

فوائدومسائل : 1۔ تکلفات سے پرہیز ایمان کا جز ہے' لہٰذا سادہ عادات کا حامل عام نعمت پر بھی اللہ کا شکر کرتا ہے جب کہ زیب وزینت کا عادی بعض اوقات ایک بڑی نعمت کو بھی اپنے معیار سے کمتر سمجھتا ہے اور شکر کی بجائے شکوہ کرنے لگتا ہے۔

2۔ سادگی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں' مثلاً: پیوند لگا کپڑا پہن لینا' زمین پر بیٹھ جانا' مفلس اور غریب کی بات سننے اور حتی الوسع مدد کرنے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا' غریب کی معمولی دعوت قبول کر لینا اور اس کا پیش کیا ہوا سادہ کھانا کھا کر احسان مندی کا اظہار کرنا۔ ملازموں سے تحقیر آمیز رویہ رکھنے سے اجتناب کرنا' اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا وغیرہ۔

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا'

آپ فرما رہے تھے۔

"کیا میں تمہیں تمہارے بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟"

صحابہ نے عرض کیا: "کیوں نہیں اللہ کے رسول!"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔"

تنگ دستی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا: "اس کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ ہم تو (اپنی معلومات کے مطابق) یہ کہتے ہیں: یہ شخص معزز (دولت مند) افراد میں سے ہے۔ اس کے بارے میں یہی توقع ہے کہ اگر (کسی گھرانے میں) نکاح کا پیغام دے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے' اگر (کسی کی) سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے (اور اسے اہمیت دی جائے)"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔

(پھر) ایک اور آدمی گزرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

انہوں نے کہا: "اللہ کے رسول! قسم ہے اللہ کی! ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں توقع ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے رشتہ نہ دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے۔ اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ (غریب مسلمان) اس (پہلے) شخص جیسے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ غریب مسلمان اگرچہ گمنام ہو' دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ ہو لیکن اللہ کے ہاں ایسا ایک آدمی بھی دنیا بھر کے ان انسانوں سے بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

2۔ اللہ کے ہاں اصل اہمیت اور قدر و منزلت ایمان و تقویٰ کی ہے' نہ کہ مال و دولت' شان و شوکت' ذات برادری اور نام و نسب کی۔

3۔ نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا انتخاب کرنا چاہیے' خواہ وہ غریب ہی ہوں۔ غریب نیک آدمی' امیر نیک آدمی کا ہم پلہ ہے لیکن بد عقیدہ یا بری عادتوں والا دولت مند شخص' نیک آدمی کا ہم پلہ نہیں۔

ناداروں کے مقام و مرتبے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نادار مومن دولت مندوں سے آدھا دن' یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کے ہاں ہزار سال کی مدت ایک دن کے برابر ہے۔ (سورۃ حج' آیت: ۴۷) اس لیے دولت مندوں سے آدھا دن پہلے جنت میں جانے کا مطلب دنیا کے حساب سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہونا ہے۔

2۔ پہلے جنت میں جانا ان کے بلند درجات کو ظاہر کرتا ہے اور انہیں محشر کی مشکلات بھی کم برداشت کرنی پڑیں گی۔



بندھن

عائشہ گل' ہمراہ ڈاکٹر محمد امین پراچہ

شاہین رشید

"زندگی کے کافی سال دبئی میں گزارنے کے بعد جب عائشہ گل پاکستان آئیں اور ڈراموں میں پرفارم کرتی ہوئی نظر آئیں تو سوچا کیوں نہ غائب ہونے کے بعد دوبارہ فیلڈ میں آنے کا سبب پوچھیں اور ساتھ ہی "بندھن" کے لیے انٹرویو بھی کرلیں کہ نئی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔

عائشہ گل نہ صرف بہت اچھی فنکارہ ہیں بلکہ بہت بااخلاق بھی ہیں۔ اپنی میٹھی زبان سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہیں۔

"عائشہ گل! کیسی ہو؟"

"الحمدللہ..... آپا! آپ کیسی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ٹھاک..... کیا ہورہا ہے آج کل؟"

"بس جی کام ہی ہورہا ہے۔ آج کل کافی ڈرامے بن رہے ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں بھی کام مل رہا ہے۔"

"ڈرامہ سیریل "کاہے کو بیاہی بدیس" میں بہت تیز طرار بھابھی کا رول تم نے کیا تھا۔ اصل میں کیا صورت حال ہے؟"

قہقہہ..... "میں بالکل بھی ایسی نہیں ہوں..... اور کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسی بھابھی ہوں گی اور ویسے یہ بات مجھ سے زیادہ میرے شوہر جانتے ہیں کہ میں کیسی بھابھی اور کیسی بہو ہوں۔ وہ زیادہ بہتر طریقے سے بتاسکیں گے۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ کو برا نہیں کہتا۔"

"کچھ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتاؤ؟"

"میں خوجہ (اسماعیلی فرقے) فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ پہلے میں دبئی میں تھی' اب ہم دونوں میاں' بیوی یہاں پاکستان میں ہیں۔ میرے میاں بھی ڈاکٹر ہیں جو کہ "ساؤتھ سٹی اسپتال" میں کام کرتے ہیں۔"

"دبئی سے پاکستان کیوں آئیں اور تمہاری ڈاکٹری کیسی چل رہی ہے اور کہاں جاب کررہی ہو؟"

"دبئی سے پاکستان اس لیے آئی کہ میرے میاں صاحب کی یہاں جاب ہے اور میں پریکٹس نہیں کررہی' کیونکہ مجھے شوبز میں کام کرنے میں زیادہ مزا آرہا ہے۔"

"میں بڑی حیران ہوتی ہوں اس بات سے کہ اکثر لڑکیاں اور لڑکے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرلیتے ہیں' مگر پھر شوبز میں آجاتے ہیں یا کچھ اور کرنے لگتے ہیں..... ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم اپنی اداکاری سے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں اچھا تاثر ڈال دیتے ہیں..... ہنستے ہوئے کو رلادیتے ہیں اور روتے ہوؤں کو ہنسادیتے ہیں' ایسی اچھی جاب کوئی اور ہوسکتی ہے۔"

"مگر میڈیکل تو ایک بہت ہی ضروری اور پروقار پروفیشن ہے۔"

"تو پھر سروس فری ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں پیسے نہیں لینے چاہئیں۔"

"یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر تو کسی بھی پروفیشن میں پیسے نہیں لینے چاہئیں۔ ویسے میڈیکل کی تعلیم کیوں حاصل کی؟"

"پڑھائی تو اچھی لائف گزارنے کے لیے بہت ضروری ہے... اور میڈیکل کی ڈگری ہے میرے پاس۔ میں کسی وقت بھی اس فیلڈ کو جوائن کر سکتی ہوں۔"

"گڈ... وہ کیا کرتے ہیں اور پاکستان میں رہنا کیسا لگ رہا ہے۔"

"میرے میاں محمد امین ٹراما سرجن ہیں... میں نے اپنی زندگی کا بہت قیمتی وقت پاکستان سے باہر گزارا ہے۔ میں پاکستان کو بہت مس کرتی تھی' تو بس اس لیے یہاں آگئی ہوں۔ میں ابھی بھی باہر آتی جاتی رہتی ہیں لیکن اب یہاں میری مصروفیات زیادہ ہوگئی ہیں تو مجھے یہاں رہنا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔"

"محمد امین پراچہ صاحب سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی اور آپ دونوں کا بندھن کیسے بندھا؟"

"ان سے میری ملاقات ایک دوست کے ذریعے ہوئی۔ میں اپنی دوست کی برتھ ڈے تقریب میں گئی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے کہا کہ ایکسکیوزمی دوستی کیا ہوتی ہے... تو انہوں نے کہا کہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں... میں نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ میری فیملی سے بات کریں اور بس پھر چھ ماہ کے اندر اندر ہماری شادی ہوگئی... ہم نے کوئی بوائے فرینڈ' گرل فرینڈ والا ٹائم نہیں گزارا۔"

"پراچہ صاحب نے جب پروپوز کیا تو مائنڈ کیا تھا؟"

"نہیں میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا۔ بلکہ کہہ دیا کہ اپنی فیملی کو بھیج دیں اور میں آپ کو بتاؤں کہ آج کل اچھے انسان کا ملنا بہت دشوار ہے... اور جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے آئیڈیا ہوگیا کہ یہ بہت اچھے انسان ہیں۔

میرے دوست ہیں۔ ہر بات میں سپورٹ کرتے ہیں۔ ان کا دل بہت اچھا ہے۔ کبھی بھی کسی بھی ضرورت مند کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی لائف پارٹنر کی خواہش تھی جو کہ پوری ہوگئی۔ یہ میری زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا... اور سسرال کو کیسا پایا... کتنے لوگ ہیں سسرال میں۔"

"شادی کو ماشاء اللہ دو سال ہوگئے ہیں۔ بچے فی الحال نہیں ہیں۔ اور سسرال ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ میری ایک نند اور دو دیور ہیں۔ میری ساس بہت سیدھی سادھی اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ سسرال میں سب ہی بہت اچھے ہیں اور پڑھے لکھے ہیں۔ ایک دیور ڈینٹسٹ ہیں اور نند ہاؤس وائف ہیں اور بہت اچھی کک بھی ہیں۔"

"محمد امین صاحب پراچہ فیملی سے اور تم اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتی ہو تو رسم و رواج میں تو فرق ہوگا۔"

"بالکل فرق ہے اور میں نے رسموں کو انجوائے کیا اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انسان ایک کلچر سے دوسرے کلچر میں جائے اور مجھے ذرا بھی فیل نہیں ہوا کہ میں کسی اجنبی خاندان میں آگئی ہوں۔"

"کھانے پینے میں اور ذائقہ میں فرق ہے؟"

"جی جی... بالکل ہے۔ ہمارے کھانے زیادہ اسپائسی (چٹ پٹے) ہوتے ہیں۔ ہمارے کھانوں کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم ہلدی زیادہ استعمال کرتے ہیں اپنے کھانوں میں۔ جبکہ ان کا تعلق کوہاٹ سے ہے اور کوہاٹ والے زیادہ اسپائسی کھانوں کو پسند نہیں کرتے... اب میں ان کے رنگ میں رنگ گئی ہوں اور جو یہ پسند کرتے ہیں' وہ ہی میں بھی پسند کرتی ہوں۔"

"غیر برادری میں جاتے وقت کچھ خدشات تھے



ذہن میں؟"

"نہیں' ایسے کچھ خدشات نہیں تھے۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پیاری زبان پیار کی زبان ہوتی ہے اور آپ کو پیار کروانا آنا چاہیے۔ دو قدم آپ آگے بڑھیں' پھر دوسروں سے آگے بڑھنے کی امید رکھیں۔"

"نکاح کے وقت کیا تاثرات تھے۔ رونا آیا تھا؟ اور مزاج کا کیسا پایا؟"

"بالکل! رونا آیا تھا اور تھوڑا بہت ڈر بھی تھا' کیونکہ یہ ساری زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ ہاتھ' پیر کپکپا رہے ہوتے ہیں۔ سب آپ کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں کہ آگے جاؤ گی تو پتا چلے گا... مزاج کا بہت اچھا پایا میں نے انہیں۔ اور میں دعا کرتی ہوں کہ ان جیسا شوہر اللہ ہر لڑکی کو دے۔ میں غصے کی تیز ہوں۔ یہ بالکل بھی تیز نہیں ہیں' کوئی نخرہ نہیں ہے۔"

"تم اپنی فیلڈ میں مصروف' وہ اپنی فیلڈ میں مصروف' تو مسئلہ ہوتا ہے کیا؟"

"ان کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے اور میں صبح کام پہ جاتی ہوں تو جب میں گھر سے جا رہی ہوتی' یہ گھر آ رہے ہوتے ہیں' زندگی میں جو بھی وقت گزاریں وہ کوالٹی ٹائم ہونا چاہیے۔ ورنہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر بور ہوجاتے ہیں۔ ہمارے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور میرے میاں مجھے میرے کام میں

"بہت سپورٹ کرتے ہیں۔"
"تمہارے کام کو پسند کرتے ہیں؟"
"بہت زیادہ۔ میرے ساتھ اسکرپٹ کو ڈسکس کرتے ہیں اور میری ساسو ماں تو میرے ڈراموں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں اور باقاعدہ تبصرہ بھی کرتی ہیں۔"
"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"
"ہنی مون تو ساری زندگی چلتا ہے... میرا ہنی مون تو ابھی تک چل رہا ہے اور ان شاء اللہ تاحیات چلتا رہے گا۔ ملک سے باہر ان کی جو کانفرنس وغیرہ ہوتی ہیں تو میں ان کے ساتھ ہی جاتی ہوں۔ منہ دکھائی میں مجھے ڈائمنڈ رنگ ملی تھی۔"
"فضول خرچ کون ہے؟ اور گھر کو بنانے سنوارنے کا شوق کس کو ہے؟"
"میں بہت زیادہ فضول خرچ ہوں اور "محمد" مجھے کبھی روکتے بھی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو آپ کی خواہش ہے، آپ خریدیں۔ شاپنگ مل کر کرتے ہیں... اور گھر کو بنانے سنوارنے کا شوق ہم دونوں کو ہے۔ ان میں کوئی بری عادت نہیں ہے۔ میں جیسا شخص چاہتی تھی وہ ویسے ہی ہیں اور وہ کیسی بیوی چاہتے تھے یہ آپ ان سے پوچھیں۔"
"شروع میں محبت زیادہ ہوتی ہے یا آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے؟"
"محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھتے ہیں تب محبت بڑھتی ہے۔"
"امین صاحب تمہیں کس روپ میں اچھے لگتے ہیں، سادگی میں یا تھری پیس سوٹ میں یا شلوار قمیص میں؟"
"مجھے تو وہ ہر انداز میں اچھے لگتے ہیں... چاہے وہ کسی بھی لباس میں ہوں۔ ان کا ہر روپ پیارا ہے۔"
"بیویاں تو اکثر اپنے شوہر کی برائی بھی کرتی ہیں، کیا تمہیں کوئی شکایت نہیں ہے ان سے؟"
"نہیں بالکل نہیں۔ یہ اتنے اچھے انسان ہیں کہ میں بار بار ان سے شادی کرنا چاہوں گی اور میری خواہش ہے کہ جب میں مرجاؤں تو جنت میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں۔"
"جن لڑکیوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کچھ کہنا چاہو گی؟"
"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ جو ہیں، وہی رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شادی سے پہلے آپ کچھ اور ہیں اور شادی کے بعد آپ کچھ اور ہوں۔ جب لوگ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد تم بدل گئے ہو یا گئی ہو تو اس میں میرا خیال ہے کہ آپ بھی کہیں نہ کہیں بدل جاتے ہیں۔ اس لیے آپ شکایت کررہے ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ جو ہیں، وہی رہیں۔ خوش رہنے کے لیے سب سے بڑا فارمولا یہ ہے کہ آپ خود خوش ہوں۔ آپ خوش ہوں گے تو دوسروں کو خوشی دے سکیں گے۔"
"آخری سوال کہ کمرے میں آکر میاں صاحب نے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"
"ہم دونوں اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی میں نے کہا کہ میں چینج کررہی ہوں۔ تب انہوں نے کہا کہ تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ میں تم کو پاکر کتنا خوش ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میری یہ زندگی اور مرنے کے بعد زندگی بھی تمہارے ساتھ گزرے۔"

محمد امین پراچہ

"کیسے ہیں پراچہ صاحب۔"
"الحمدللہ۔"
"عائشہ نے تو آپ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کیا آپ بھی ان کی ایسی ہی تعریف کریں گے؟ عائشہ نے تو اپنی فیلڈ چینج کرلی۔ آپ کو خیال آیا اس قسم کا؟"
"اگر تعریف کے قابل نہ ہوتیں تو ان سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی اور جہاں تک فیلڈ چینج کرنے کی



بات ہے تو اللہ تعالیٰ ہر انسان کو مختلف صلاحیتیں دیتا ہے تو جو جس کی صلاحیت رکھتا ہو اسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ ہم دونوں اپنی فیلڈ میں کامیاب ہیں۔"
"آپ بھی چاہیں گے اس فیلڈ میں آنا؟"
"نہیں... میں اپنے کام سے بہت خوش ہوں جو ریوارڈز مجھے اس کام سے ملتے ہیں، جو سکون مجھے لوگوں کی خدمت کرکے حاصل ہوتا ہے، وہ شوبز میں کام کرکے حاصل نہیں ہوگا۔ اہمیت میری فیلڈ کی بھی بہت ہے، ان کی فیلڈ کی بھی ہے۔ میں ایمرجنسی ان ٹراما سرجری میں اسپیشلائزڈ ہوں۔ تو جو لوگ ایمرجنسی میں آتے ہیں چاہے وہ ٹراما سے متعلق ہوں یا میڈیسن سے۔ ان کو لک آفٹر اسپیشلسٹ کرتے ہیں اور میں بھی اس فیلڈ کا اسپیشلسٹ ہوں۔"
"پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز تو یہاں رہنا پسند نہیں کرتے... آپ کو خیال نہیں آیا ملک سے باہر جانے کا؟"
"میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو بادشاہی اس ملک میں ہے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا وقت آیا کہ میں محسوس کروں کہ اب میرا جانا لازمی ہے تو شاید میں چلا بھی جاؤں۔ لیکن فی الحال تو میں اس ملک میں کافی خوش ہوں۔ ہمیں پرائیویٹ پریکٹس کرنے کی بھی سہولت ہے اور ویسے بھی میرا ایمان ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آتا ہے۔ جو آپ کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ آپ کو ضرور ملتا ہے۔"
"عائشہ گل سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"
"دو ڈھائی سال قبل دوست کے گھر ان سے ملاقات ہوئی تھی، میرے اور ان کے دوست مشترک ہیں... ان سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ یہ مجھے اچھی لگتی تھیں پھر میں نے انہیں صاف طور پر اپنی پسند سے آگاہ کردیا۔ انہوں نے کہا آپ بڑوں سے بات کریں اور بس پھر بات ہوگئی۔"
"آپ کو ان کی کون سی بات پسند آئی؟"
"دیکھیں... ہر انسان مکمل نہیں ہوتا اور ہر انسان ایک دوسرے کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ میں ان سے بات چیت کرتا رہتا تھا۔ ہماری دوستی بہت اچھی تھی اور مجھے ان کی بہت سی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ان کا بناؤ سنگھار کرنا مجھے بہت پسند تھا۔ کیونکہ انسان آنکھوں سے پہلے دیکھتا ہے اور بعد میں کچھ اور پرکھتا ہے۔ پھر ان کے بات کرنے کا طریقہ، پھر ان کا دل جو کہ بہت کائنڈ ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ لوگوں پر لٹادیں، کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں... شادی کے بعد بھی مجھے ان میں کوئی چینج نظر نہیں آیا۔ جیسی یہ پہلی تھیں، ویسی ہی اب بھی ہیں۔ ہم میاں بیوی بھی ہیں اور اچھے دوست بھی۔"
"عائشہ بتارہی تھیں کہ آپ کو غصہ کم آتا ہے اور انہیں زیادہ... کیا ایسا ہے؟ اور کیا وہ سگھڑ ہیں؟"
"جی بالکل ایسا ہے۔ غصے کی کافی تیز ہیں۔ اپنے کام میں جنونی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ کام جلدی ہو۔ حالانکہ ہر کام کا ایک ٹائم ہوتا ہے... اور سگھڑ بھی بہت ہیں۔ جب پہلی مرتبہ انہوں نے میرے لیے کھانا پکایا

رکھنا ہوتا ہے۔ انسان دنیا میں بہت تھوڑے ٹائم کے لیے آتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ سب سے بنا کر رکھے۔"

"رسمیں انجوائے کیں؟"

"بہت زیادہ۔۔۔ عائشہ نے جو کہا، جیسا کہا، ہم نے ویسا ہی کیا، میوزک سے لے کر ہر رسم ہم سب نے بہت انجوائے کی۔"

"جن لڑکوں کی شادیاں ابھی نہیں ہوئیں، ان کے لیے کیا کہنا چاہیں گے۔"

"جن کی شادیاں نہیں ہوئیں ان سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ شادی سوچ سمجھ کر کریں اور ہر چیز کو ٹائم دیں۔ کوئی کام جلد بازی میں نہ کریں۔ اگر آپ اپنے پیروں پہ کھڑے ہیں اور تمام حقوق پورے کر سکتے ہیں تو پھر ضرور کرلیں، کیونکہ نکاح کا حکم ہے اور نیت اچھی ہو تو اللہ خود برکت دیتا ہے۔"

"آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں اور لڑائی جھگڑا ہوتا ہے دونوں میں؟"

"میں انہیں عائشو اور یہ مجھے "محمد" کہتی ہیں۔ لڑائی جھگڑا عموماً اپنی وجہ سے نہیں ہوتا۔ کام کا بوجھ ہو یا کسی اور بات پر غصہ آرہا ہو انہیں تو پھر لڑائی جھگڑا ہوتا ہے ورنہ نہیں۔"

"آپ دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت ہو یا کوئی بات جو آپ اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہیں تو بتایئے۔"

"یہ زندگی اسٹار پلس کا ڈراما نہیں ہے کہ ایک بات کو آٹھ قسطوں میں پورا کیا جائے۔ آپ کے دل میں جو ہے، جیسا ہے، صاف گوئی سے بولیں۔ اچھا برا جو بھی آپ کو لگے۔۔۔ اور میرا نہیں خیال کہ میں کوئی بات عائشہ سے کہنا چاہتا ہوں اور میں نے نہ کہی ہو۔ جو بات میرے دل میں ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ان سے اجازت چاہی۔

☆



تھا تو میں بہت حیران ہوا تھا۔"

"کھانا باہر کھانے کا شوق ہے یا گھر پہ کھانے کو ترجیح دیتے ہیں؟ باہر جاتے ہیں تو کہاں کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"دیکھیں! یہ زندگی پارٹنر شپ کے اصولوں پہ چلتی ہے۔ جہاں ٹائم ملے ایک دوسرے کے حقوق پورے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب میرے پاس ٹائم ہوتا ہے تو میں کوکنگ کرلیتا ہوں اور جب ان کے پاس ٹائم ہوتا ہے تو یہ کرلیتی ہیں اور جب دونوں کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تو پھر ہم باہر کھانے کے لیے چلے جاتے ہیں اور آج کل ہم "پورٹ گرینڈ" بہت جارہے ہیں۔"

"بچت کی عادت کس کو ہے؟ اور سسرال سے تعلقات کیسے ہیں؟"

"ہم دونوں شاہ خرچ ہیں۔۔۔ لیکن انہی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی نہیں کرتے اور سسرال سے تعلقات کے لیے تو میں یہی کہوں گا کہ جیسے کسی بھی داماد کے اپنے سسرال کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

"یعنی اچھے نہیں ہیں۔"

قہقہہ۔۔۔ "اگر ایسا ہوتا تو پھر مدران لاء والے لطیفے نہ ہوتے۔ رشتوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کچے دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں، ان کو بہت سنبھال کر

دستک دستک دستک

شاہین رشید



عیشا نور

"کیسی ہو؟ تمہارا "خوشبو کا گھر" بہت ہی عمدہ سیریل تھا اور تم نے بہت عمدہ پرفارمنس دی تھی۔"

"جی بہت شکریہ۔۔۔ سب نے ہی میری پرفارمنس کو پسند کیا ہے اور مجھے خود بھی کام کر کے بہت مزا آیا۔"

"اچھی خاصی پیاری شکل ہے۔۔۔ اور پرفارمر بھی بہت اچھی ہو، پھر کیا بات ہے کہ تم مزید ڈراموں میں نظر نہیں آرہیں؟"

"میرے کافی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں اور ان کے آن ایر آنے میں ابھی کافی ٹائم ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ دو، چار مہینوں میں آن ایر ہو جائیں گے۔"

""خوشبو کا گھر" میں تو بہت ڈری، سہمی دکھائی دیں۔ عام زندگی میں کیسی ہو؟"

"عام زندگی میں بہت زیادہ مختلف ہوں۔ بالکل الٹ ہوں۔ بہت بولڈ ہوں اور چونکہ فیملی میں بڑی ہوں۔ اس لیے پر اعتماد بھی سب سے زیادہ ہوں۔"

"ڈرامے میں بہت سادہ نظر آئیں تو کیا عام زندگی میں فیشن ایبل ہو؟"

"یہاں میں ڈرامے جیسی ہوں۔ یعنی بہت سمپل، سادہ سی۔ فیشن سے بہت زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ میک اپ بھی ہلکا ہی کرتی ہوں اور مزاج کی بھی بہت سادہ ہوں۔"

"اس فیلڈ میں مزا آرہا ہے؟"

"جی مزا تو بہت آرہا ہے۔۔۔ مگر اس فیلڈ میں جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے۔ سب ہی بولتے ہیں۔ مگر میں کوشش کرتی ہوں کہ کم سے کم بولوں۔ بس ان ہی باتوں پہ مجھے اکثر غصہ بھی آجاتا ہے، پھر لوگ کہتے ہیں کہ تمہیں غصہ بہت آتا ہے اُسے کنٹرول کرو۔"

"اچھا! غصے کی تیز ہو؟ ڈرامے میں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تمہیں غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ ویسے "خوشبو کا گھر" جیسا شوہر اصل زندگی میں مل گیا تو؟"

"اصل زندگی میں ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ میں نے آپ کو بتایا ناں کہ میں ڈرامے کے کردار سے بالکل برعکس ہوں اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح کا آپ کا موڈ ہوتا ہے، آپ کو پارٹنر بھی ویسا ہی ملتا ہے۔ اس لیے پارٹنر اچھا ہی ملے گا۔"

"ویسے غصہ کن باتوں پر ہے آتا؟"

"جب میڈیا کے لوگوں کے ساتھ افیئرز کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ایسا میرے ساتھ ہو بھی چکا ہے۔ یقین کریں! مجھے بہت غصہ آیا تھا۔"

"اچھا؟ کس کے ساتھ آیا تمہارا نام؟"

""خوشبو کا گھر" کے ڈائریکٹر کے ساتھ میرا نام آیا۔ لوگوں نے بہت غلط سلط باتیں کیں۔۔۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے ڈائریکٹر مجھ سے کافی بڑے ہیں اور بالکل میرے بھائیوں جیسے ہیں۔۔۔ محسن مرزا صاحب سے میری بڑی اچھی کیمسٹری رہی اور ان کے ساتھ سیریل کر کے بہت مزا بھی آیا۔ اب شکر ہے کہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔"

"شہرت تو تمہیں "خوشبو کا گھر" سے ملی۔ مزید ایسے ڈرامے ہیں جو تمہاری شہرت کو اسی طرح قائم رکھیں؟"

"جی بالکل! عنقریب میرا ایک سیریل آن ایر ہونے والا ہے، جس کا نام "بھابھی بھی میری سہیلی" ہے۔ اس میں میرا نیگیٹو رول ہے اور بہت اچھا ہے۔ "خوشبو کا گھر" سے بالکل مختلف ہے۔"

"ویسے کیا کرنا چاہتی ہو، نیگیٹو یا پوزیٹو؟"

"ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ بس اچھے اور پاور فل ہونے چاہئیں۔ نیگیٹو، پوزیٹو سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ میں بھکارن اور گونگی بہری لڑکی کا رول کروں۔ اس میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہے۔"

"کیا بیرون ملک گئیں؟ اور ماڈلنگ وغیرہ کی؟"

"جی۔۔۔ میں بیرون ملک جا چکی ہوں۔ بنگلہ دیش، سری لنکا اور ساؤتھ افریقہ گئی ہوں۔ ریمپ پر ماڈلنگ کی۔ آج کل کمرشلز بھی کر رہی ہوں اور ان دنوں میرے کئی کمرشلز آن ایر ہیں۔"

"عیشا! تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

"میں اپنی ایک دوست کے ساتھ کمرشل شوٹ دیکھنے گئی تھی۔ میری دوست ماڈلنگ کی فیلڈ میں ہے۔ تو میں تو یوں ہی گئی تھی مگر ہوا یہ کہ ڈائریکٹر نے مجھے بھی ایک کمرشل کے لیے سلیکٹ کر لیا اور یوں میں حادثاتی طور پر کمرشل میں آگئی۔"

"اور پھر ڈراموں میں؟"

"بس کمرشلز کی وجہ سے ہی ڈراموں میں آگئی۔ میں نے انجم شہزاد کے ساتھ اپنا پہلا ڈراما کیا تھا۔ پھر میرا امام کے ساتھ "سٹ کام" کیا تھا۔ ڈرامے تو میں کافی سارے کر چکی ہوں۔ بس شہرت "خوشبو کا گھر" نے دی۔"

"اس فیلڈ کو مستقل اپنانے کا ارادہ ہے؟"

"جی بالکل۔۔۔ فیلڈ اچھی ہے۔ مگر بہت سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے اور ابھی تک تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔۔۔ آگے بھی اللہ خیر کرے۔ کیونکہ اس فیلڈ میں منافقت بہت ہے۔"

"تعلیم کتنی ہے تمہاری؟ اور بہن، بھائی کتنے ہیں؟"

"بیچلرز کر چکی ہوں اور کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہی ہوں۔ میرا ایک بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔"

"اس فیلڈ میں آئیں تو گھر والے خوش ہوئے؟"

"پہلے پہل اعتراض بھی ہوا، احتجاج بھی ہوا۔ مگر پھر میری ضد کے آگے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ شروع میں میری امی میرے ساتھ جاتی تھیں۔ لیکن جب سب سے اچھی "ہیلو ہائے" ہو گئی تو پھر میں خود ہی آنے جانے لگی۔"

"کس رائٹر کے ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش ہے اور کبھی پرانے ڈرامے دیکھے؟"

"مجھے حسینہ معین کے ڈرامے میں کام کرنے کی بہت خواہش ہے اور اداکاروں میں میری خواہش ہے کہ میں فیصل قریشی کے ساتھ کام کروں اور میں پرانے ڈراموں میں ڈراما سیریلز "الجھن" "دھواں" اور "کشکول" دیکھے ہیں، جو بہت پسند آئے۔ "مانوس اجنبی" جو کہ شبیر جان کا تھا بہت پسند آیا۔"

"اور آج کل کے ڈرامے؟"

"آج کل کے ڈرامے آج کل کے حساب سے ہیں اور گزرے دور کے ڈرامے اپنے دور کے حساب سے اچھے تھے... آج کل لوگ ڈراموں کو زیادہ غور سے دیکھتے ہیں، تھوڑی سی بھی غلطی ہو جائے تو فوراً بتاتے ہیں کہ ایسا ہوا تھا۔"

"ایم بی اے کے بعد کیا ارادے ہیں؟"

"ایم بی اے کرنے کے بعد سائیڈ بزنس کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے فیشن ڈیزائننگ سے بہت دلچسپی ہے تو ہو سکتا ہے کہ میں فیشن کی فیلڈ میں آجاؤں۔"

"اور جناب! پیدا کب اور کہاں ہوئیں اور فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟"

"میں 13 جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ آگرہ اور لکھنؤ سے ہمارا تعلق ہے۔ میرے والد "کے ای ایس سی" میں ہیں اور امی ہاؤس وائف ہیں۔"

"اوہو... والد "کے ای ایس سی" میں ہیں تو بہت باتیں سنتے ہوں گے؟"



"جی! بہت باتیں سنتے ہیں۔ ہم سے بھی اور لوگوں سے بھی... مگر وہ کیا کر سکتے ہیں وہ تو ایمپلائی ہیں۔ ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ مگر کیا کریں لوگ سناتے ہیں تو سنتے ہیں۔"

عائزہ خان

"کیسی ہو عائزہ... پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"جی! ٹھیک ہوں... اور پڑھائی بھی ٹھیک جا رہی ہے۔"

"آج کل تو ہر دوسرے ڈرامے میں تم ہوتی ہو؟"

"ڈرامے مختلف اوقات میں ریکارڈ ہوتے ہیں مگر جب ایک ساتھ سب ڈرامے آن ایر ہو جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں ہی ہوں... جبکہ ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں ایسا نہیں ہے؟"

"میں ہر کردار قبول نہیں کرتی۔ بہت سوچ سمجھ کر آفر قبول کرتی ہوں۔ اگر تمام آفرز قبول کرنے لگوں تو پھر شاید گھر جانے کی بھی فرصت نہ ملے۔ اس لیے وہ ہی آفر لیتی ہوں، جس میں کام کی گنجائش ہوتی ہے۔"

"کردار کس قسم کے پسند ہیں۔ بولڈ یا نارمل؟"

"مجھے اچھے اور پاور فل کردار پسند ہیں۔ مگر بولڈ نہیں۔ شاید میں ابھی اتنی بولڈ نہیں ہوئی کہ بولڈ کردار کر سکوں۔ اس لیے جب مجھے اس قسم کے کردار ملتے ہیں تو میں شکریے کے ساتھ انکار کر دیتی ہوں۔ طوائف کا کردار ہو یا بہت ہی زیادہ ماڈرن کہ جس میں لباس بھی ٹھیک نہ ہو میں نہیں لیتی۔"

"اور نیگیٹو؟"

"ہاں نیگیٹو تو ضرور کروں گی۔ اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نیگیٹو کردار کرنے میں تو کافی گنجائش ہوتی ہے اور مزا بھی آتا ہے۔"

"فیلڈ میں اتفاقاً" آئیں یا سوچ سمجھ کر؟"

"باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے یا سوچ سمجھ کر تو نہیں

آئی۔ البتہ اداکاری کا شوق ضرور تھا، سو اس فیلڈ میں آگئی۔ قدرت کو میری ترقی منظور تھی کہ مجھے کامیابی پہ کامیابی ملتی چلی جا رہی ہے۔"

"شوبز میں سب سے دوستی ہے یا کچھ ہی لوگوں سے؟ کام کس کا پسند ہے اپنے ہم عصر میں۔"

"ہیلو ہائے تو سب سے ہے، لیکن دوستی سب سے نہیں ہے اور اپنے طور پر سب ہی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ سینئرز سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اپنے ہم عصروں میں ثنا عسکری بہت اچھی لگتی ہے۔ ایمن بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ نیلم منیر بہت اچھی ہے۔ مجھے تو سب ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"شوبز کو مستقل اپنانا ہے یا شادی کے بعد چھوڑ دینا ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ بہت موڈی ہوں۔ دل بھر گیا یا پڑھائی متاثر ہوئی تو چھوڑ بھی سکتی ہوں اور شادی کا فیصلہ ابھی نہیں کیا تو اس کے بعد فیلڈ چھوڑنے کا فیصلہ تو بہت دور کی بات ہے۔"

"تم اس فیلڈ میں کسی پلاننگ کے تحت نہیں آئیں مگر کیا پلاننگ پہ یقین رکھتی ہو؟"

"سچ پوچھیں تو میں تو پلاننگ پہ یقین ہی نہیں رکھتی۔ اس فیلڈ میں آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر راستے بنتے چلے گئے اور راستے تو تقدیر خود بناتی ہے اور ہم اس پر چلتے چلے جاتے ہیں۔"

"مستقبل میں جاب کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی جو کام کر رہی ہوں، وہ بھی ایک طرح سے جاب ہی ہے۔ صبح اٹھنا، شوٹ پر جانا، پھر رات کو گھر آجانا۔ یہ سب جاب ہی تو ہے اور جہاں تک پڑھائی کے بعد جاب کی بات ہے تو مارکیٹنگ میرا مضمون ہے۔ ان شاء اللہ مارکیٹنگ میں جاب کروں گی۔"

"اداکاری کے علاوہ کیا مشاغل ہیں؟"

"میں ایک گھریلو لڑکی ہوں۔ اس لیے میرے مشاغل بھی گھریلو ہی ہیں۔ گھر کو سجانا۔ فرنیچر کو بدلنا یا ان کی سیٹنگ تبدیل کرنا۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے اچھی اچھی چیزیں لے کر آنا میرے مشاغل میں شامل ہیں... جو بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ "ہمیں تو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔" تو میں تو دیسی اور بدیسی سب کھانے پکا لیتی ہوں اور سیکھتی بھی رہتی ہوں۔"

"گھر کے کھانے زیادہ پسند ہیں یا باہر کے اور کھانے کی شوقین ہو؟"

"مجھے گھر کے کھانے زیادہ پسند ہیں۔ باہر کھانے پینے بہت کم جاتی ہوں اور میں کھانے کی بے حد شوقین ہوں۔ ہر اچھا کھانا میری کمزوری ہے۔"

"موسیقی سے لگاؤ ہے؟"

"بہت زیادہ... لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ کون سا میوزک پسند ہے۔ اس لیے کہ موسیقی کے لیے پسند مخصوص نہیں بلکہ موڈ پر منحصر ہے۔ کافی لوگ بہت اچھا گا رہے ہیں، لیکن مجھے سونو نگم اور حدیقہ کیانی بہت پسند ہیں۔"

"شہرت پانے کے بعد کیا تبدیلی آئی؟"

"کوئی خاص نہیں، سوائے اس کے میں بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ باقی میں عام لوگوں جیسی ہوں اور تبدیلی ہو گی بھی کیا، عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہی تو ہوں۔"

☼



رضیہ جمیل



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت، عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
رب کریم آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں میں رکھے۔ آمین۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔ پہلا خط تمثیلہ اصغر نے لادیاں ضلع گجرات سے لکھا ہے، لکھتی ہیں۔

پہلے اگر کبھی ڈائجسٹ میں شمولیت کی تو گجرات کے نام سے ہی کی ہے۔ اس دفعہ میں آپ کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتاتی ہوں۔ میرے گاؤں سے ہر وہ بندہ واقف ہے جو "میجر راجہ عزیز بھٹی شہید" کے نام سے واقف ہے۔ جی ہاں میرے گاؤں کا نام "لادیاں" ہے۔ میجر راجہ عزیز بھٹی کا گاؤں۔ اب جناب میں شعاع کی طرف آتی ہوں۔ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" بھی مصحف، قراقرم کا تاج محل کی طرح یادگار ناول ہوگا۔ ستارہ شام اور دیوار شب بھی زبردست جا رہا ہے۔ شہزادہ عباس خلجی کا ناول "رنگ، خواب اور ریشم" اس کا ہر لفظ ریشم کی طرح تھا۔ زبردست شہزادی جی۔ "میری سوچ کے محور" میری ایک چھوٹی سی کاوش، کیا اس کو شعاع میں جگہ ملے گی ضرور بتائیے گا۔

ج تمثیلہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قابل اشاعت نہیں ہے۔

ڈی جی خان سے ایس عظمیٰ نے لکھا ہے

دس سال سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ بہت بار کوشش کی مگر سستی آڑے آگئی۔ اب خط لکھنے کی وجہ صرف اور صرف آپ سے ایک فرمائش اور وہ بھی آپ نے ارجنٹ پوری کرنی ہے، میں بہت پیار سے آپ سے ریکویسٹ کر رہی ہوں۔ آپی پلیز پلیز ایف ایم 101 کے پروگرام "گڈ مارننگ" ملتان کے R.J عامر عزیز ملک کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں اور فوک گلوکار شفاء اللہ خان روکھڑی کا انٹرویو شائع کریں۔

ج پیاری عظمیٰ! آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ویسے تو شعاع کی دس سالہ وابستگی ہی پسندیدگی کا ثبوت ہے، لیکن اچھا ہوتا ہے کہ شعاع کی تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ اب آئندہ دس سال کے لیے خاموشی نہیں اختیار کیجیے گا۔

اسماء خان نے کیماڑی کراچی سے لکھا ہے

اگست کا شمارہ ہاتھ آتے ہی بے تابی سے کھولا اور سب سے پہلے "جنت کے پتے" پڑھا۔ واہ جی کیا شان دار اسٹوری ہے۔ نمرہ سے پسندیدگی مزید بڑھ گئی ہے۔ یہ جان کر کے ان میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے شرعی پردہ! "ستارہ شام اور دیوار شب" بہت سلو رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ فائزہ افتخار کا "سنڈریلا" بھی بہت شان دار جا رہا ہے۔ مجھے تو زینی پر سخت غصہ آیا۔ فائزہ جی کا اپنا ایک اچھوتا انداز تحریر ہے۔ مگر ایک بات جو میں نے نوٹ کی ہے کہ ان کے ناول کے ہیرو ہمیشہ شرمیلے اور ہیروئن کافی بولڈ ہوتی ہے۔

ج اسماء شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد اور دوسری مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کا افسانہ موصول ہو گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔

سارہ عبید اور عمارہ عبید نے ڈنگہ شہر سے لکھا ہے

ٹائٹل میں آج کل کے فیشن کے مطابق ڈریس دکھایا کریں۔ تاکہ ہم نئی نئی ڈیزائننگ دیکھ کر اپنے کپڑوں کی ڈیزائننگ کر سکیں۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف! ہمیشہ کی طرح زبردست۔ شعاع اور خواتین تمام مسلم عورتوں کے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے۔ "جنت کے پتے" اتنا منفرد ٹاپک اور اتنا ہی خوب صورتی سے لکھا جانے والا ناول جو تاحیات ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ اس دفعہ حلیمہ آنٹی کی باتیں دل کو چھو گئیں، لیکن ایک بات کہوں گی جو کچھ حیا کے ساتھ ہو رہا ہے کیا حقیقی زندگی میں کسی لڑکی کے ساتھ اتنا کچھ ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو ویری امیزنگ؟ فائزہ افتخار ایک خوب صورت اور بے مثال تحریر کے ساتھ۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی سنڈریلا ہو۔ صوفیہ بشیر کا مکمل ناول بہت اچھا لگا، جبکہ شہزادی عباس کا ناول وہی عام سی پرانی اسٹوری۔ ہیروئن کی حد سے زیادہ سادگی، باقی ہر چیز بیسٹ تھی۔ میری نانی اماں جو کہ اپنے زمانے کی شاعرہ تھیں، انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں، لیکن صرف خود تک محدود رکھیں۔ اس دفعہ میں ان کی ایک نظم بھیج رہی ہوں، ان کی عمر اب 80 سال ہے۔

ج سارہ اور عمارہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شہزادی عباس کا ناول کا موضوع آپ کو عام سا لگا، لیکن اس ناول کی اصل خوب صورتی اس کی تحریر کی دلکشی تھی۔ انداز بیاں ہی کسی تحریر کو دوسری تحریروں سے منفرد کرتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فریحہ شبیر نے شاہ نکڈر سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع خلاف معمول 30 کو مل گیا۔ ٹائٹل بس اچھا لگا۔ مگر مہندی اور دھیمی سی مسکان دل کو چھو گئی۔ سالگرہ نمبر سالگرہ نمبر ہی تھا۔ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا۔ دستک میں اسماء، امبر اور نمرہ سے مل کر اچھا لگا اور سروے کی تو کیا ہی بات تھی۔
"جنت کے پتے" نمرہ احمد اتنا زبردست ناول۔ ہر قسط میں نمرہ کچھ بتاتی، کچھ سمجھاتی نظر آتی ہیں۔ نمرہ یو آر سو گریٹ یار اور ہاں یہ اسٹوری ختم ہوتے ہی آپ "روبرو" میں تشریف لا رہی ہیں۔ سمجھیں آپ! "ایک نئی سنڈریلا" فائزہ افتخار بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "دیوار شب" اور "ستارہ شام" بھی اچھا رہا۔ دونوں میں کچھ غلط ہونے کا ڈر ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔
"اداس چاند" صوفیہ بشیر بہت زبردست ناول۔ اتنا اچھا لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد، اگلی تحریر کا انتظار رہے گا۔
"رنگ، خواب اور ریشم" شہزادی جی اتنا زبردست لکھنے پر مبارکباد اور مسکراہٹ (میری طرف سے) قبول کریں۔ یہ تحریر مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ خصوصاً" زہرہ کا لکھا خط اور اس میں بیان اپنی محبت اور ریشم کے گھر کا پیارے پیارے رنگوں سے سجنا۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین تحریر تھی۔ مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی تو سارے ہی اچھے تھے۔ مگر بیسٹ رہا "تبدیلی" "حقیقت تلخ سہی حقیقت ہی ہوتی ہے۔" "اتنے مانوس" نعیمہ نے بھی اچھا لکھا۔ "فیصلہ" ایبہا نے بھی اچھا لکھا۔ ناولٹ "چاند رات" نازیہ جمیل۔ ہلکی پھلکی اور طنز و مزاح سے بھرپور یہ تحریر مزا دے گی۔ آپی اگر میں "شاعری سچ بولتی ہے" کے لیے اپنا انتخاب بھیجوں تو شائع ہوگا نا۔

ج پیاری فریحہ! ہمیں افسوس ہے کہ سروے میں آپ شامل نہ ہو سکیں۔ شاعری سچ بولتی ہے کے سلسلے میں ضرور شرکت کریں۔ مصنفین کے نام خط آپ ہمارے ایڈریس پر بھجوا دیں۔ شعاع کی پسندیدگی اور تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ انتخاب بھجوانے کے لیے پوچھنے

کی ضرورت نہیں' ضرور شائع ہوگا۔ بس یہ خیال رکھیں کہ آپ کی انتخاب کردہ شاعری پہلے شائع نہ ہوچکی ہو۔

انتہ حفیظ نے حویلی لکھا' دیپال پور سے لکھا ہے

میرے اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ سرورق ہے' جو مجھے بہت ہی پیارا لگا۔ نمرہ احمد کی تحریر "جنت کے پتے" بہت ہی زبردست ہے۔ جو جلدی بھولنے والی نہیں۔ عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں۔ فائزہ افتخار بہترین رائٹر ہیں۔ وہ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" اور "تاریخ کے جھروکوں سے" یہ دونوں سلسلے میرے پسندیدہ ہیں۔ یہ ڈائجسٹ پہلے میرے والد صاحب پڑھتے تھے اور پلیز میری ایک فرمائش ہے شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع کریں۔ وہ بھی پورے دو ڈھائی صفحات کا۔

ج پیاری انتہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مردان سے مہوش شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں۔

اس ماہ کے شمارے کا ٹائٹل نہایت عمدہ اور ریفریشنگ تھا۔ فائزہ افتخار میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا نیا ناولٹ "ایک نئی سنڈریلا" بہت ہی اچھا ناولٹ ہے۔ اس میں میشا اور مائر کا کردار مجھے بہت پسند ہے اور ـــ مکمل ناول مجھے بالکل بھی پسند نہیں ناول شروع ہوتے ہی ہم کو پتا لگ جاتا ہے کہ اس لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہوگی۔ آپی آپ سے ہمارے بہت شکوے ہیں۔ ایک تو آپ ہمارے خط شائع نہیں کرتیں اور ہم نے آپ کو پیسے بھجوائے تھے ڈائجسٹ منگوانے کے لیے' میں یہ ڈائجسٹ کبھی نہیں خریدتی' اگر اس میں "ستارہ شام" اور "جنت کے پتے" نہ ہوتے۔ رخسانہ نگار کو کہیں سے ڈھونڈ لائیں۔ آپی معذرت چاہتی ہوں۔ آپ سے اتنے گلے شکوے کیے۔ یہ بھی لوگ ہر کسی سے نہیں کرتے میں نے بھی آپ کو اپنا جان کر گلے شکوے کیے کہ ہم پٹھانوں کے ساتھ ہر جگہ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔

ج پیاری مہوش! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے پیسے بھجوائے اور آپ کو ڈائجسٹ نہ مل سکے۔ ہوسکتا ہے آپ نے اپنا صحیح ایڈریس نہ لکھا جس کی بنا پر آپ کو پرچے نہ مل سکے۔ اس خط میں بھی آپ نے اپنا ایڈریس نہیں لکھا۔ نہ ہی یہ لکھا ہے آپ کو کون سے مہینے کے شمارے چاہئیں۔ آپ اس نمبر پر فون کرکے تفصیل بتادیں پرچے آپ کو بھجوا دیے جائیں گے۔

0345-2852056

مہوش! ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کی نظر میں پٹھان' پنجابی' سندھی' بلوچی اور مہاجر کے درمیان کوئی تفریق ہو' لیکن ہماری نظر میں سب انسان برابر اور ہم ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے' بلکہ جو لوگ تفریق کرتے ہیں ہم انہیں شدید ناپسند کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں تو ایسی کسی تفریق کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسلام رنگ' نسل ذات پات' زبان' گورے' کالے' عجمی اور عربی کی تفریق مٹانے کے لیے آیا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سعدیہ ہارون نے کراچی سے لکھا ہے

اگست کا شمارہ جلد ہی مل گیا اور جلد ہی ختم بھی کرڈالا اور فوراً ہی خط لکھنے بھی بیٹھ گئی اور اس کا سب سے بڑا محرک نمرہ احمد کے "جنت کے پتے" ہے۔ کہانی جتنی تیزی سے موڑ لے رہی ہے' یقین کریں کہ میں اپنے آپ کو اس کہانی کا حصہ محسوس کرتے ہوئے ہر تکلیف اور خوشی کو خود محسوس کررہی ہوں۔ ان سب باتوں کے لیے نمرہ احمد بے حد مبارک باد کی مستحق ہیں اور خاص کر احادیث اور قرآن کا حوالہ بہت ہی زبردست ہے۔ اب دیگر مستقل سلسلوں کی اگر بات کروں تو "ستارہ شام کی کہانی تو ایک جگہ ہی رکی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ برائے مہربانی کہانی میں کچھ تیزی لائیے آمنہ جی! یہی حال دوسرے مستقل سلسلے "دیوار شب" کے ساتھ چل رہا ہے۔ جویا معاذ کا سلسلہ ہو یا نبیل کی "کہانی" آگے بڑھتی ہوئی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ "صوفیہ بشیر کا "اداس چاند" اچھا تھا' لیکن کہانی میں کہیں کہیں جھول سا محسوس ہوا اور ایسا ہی رنگ خواب اور ریشم میں بھی محسوس ہوا۔ ابتہاج کا ایک دم سے غلط فہمی کا شکار ہونا اور پھر یک دم دور ہونا' کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ البتہ نازیہ جمال کا "چاند مبارک" ایک ہلکا پھلکا اور سادہ سا ناول تھا جو اچھا لگا۔ مصباح خادم کی تبدیلی سے کچھ

اختلاف محسوس ہوا کیونکہ آج کل ایسا کم ہوتا ہے۔

ج پیاری سعدیہ شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

حنا' صدف اور مقدس نے لکھنوال کلاں سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا فائزہ افتخار جی یو آر دا بیسٹ رائٹر' لیکن پلیز میشا کے ساتھ کچھ برا مت ہونے دینا۔ سالگرہ نمبر اچھا تھا۔ ناول اور باقی افسانے سب ٹھیک تھے۔ میں نے پوچھنا تھا کہ ایک کہانی تھی جس کا نام نہیں یاد اور خواتین میں تھی یا شعاع میں' یاد نہیں اس کہانی کے کردار میں جویا' ملکہ' نادر تھے۔ ثریا اور ملکہ کزنز تھیں' ملکہ زیادہ تر ثریا کے گھر میں رہتی' مگر جب ثریا کے ابو کو جیل ہوگئی تو وہ لوگ ملکہ کے گھر ٹھہرنے گئے۔ ملکہ بالکل ثریا کے برعکس تھی' اس سے سارے گھر کے کام کرواتی۔ پلیز ضرور بتائیے گا کہ یہ کس شمارے میں تھی۔

پیاری حنا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے سات خط شامل نہ ہوسکے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے خط لکھے ہوں اور پوسٹ کرنا بھول گئی ہوں کیونکہ ہمیں وہ خطوط موصول نہیں ہوئے۔

جس کہانی کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔ ہمیں یاد نہیں ہے۔ شاید قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو ہمیں لکھ دیں۔

شہناز راجپوت نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

اگست کا شمارہ کتنا زبردست تھا۔ یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ ٹائٹل خوش کرگیا۔ ماڈل کی معصومیت بھری مسکان نے تو مانو دل ہی لوٹ لیا۔ (سارا نہیں آدھا) آدھا دل لوٹنے کے لیے نمرہ احمد جو موجود تھیں۔ "جنت کے پتے" نمرہ احمد کا ایک اور شاہکار۔ نمرہ احمد کی کہانی ہو اور ہم کوئی اندازہ لگائیں' نہیں جی ہماری اتنی مجال کہاں؟ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ سنڈریلا کی تیسری قسط بھی اچھی تھی۔ مگر چوتھی قسط جو سب قسطوں سے اچھی ہوگی۔ ارے اس میں ہماری پیاری سی میشا اور مائر کی ملاقات جو ہوگی۔ ویلڈن فائزہ جی' چاند رات نازیہ جمال کا ناولٹ بھی ٹھیک تھا۔ جبکہ مکمل ناولوں میں رنگ' خواب' ریشم' شہزادی عباس خلجی کا مکمل ناول اچھا لگا۔ اداس چاند بھی ٹھیک تھا۔ "دیوار شب" تو شعاع کی جان ہے۔ "ستارہ شام" بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ افسانے بھی سارے دلچسپ تھے۔ باقی سارا شمارہ زبردست تھا۔

ج شہناز! تفصیلی تبصرے اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقراء عروج فتح پور لیہ سے شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں

اس ماہ کا شعاع پڑھا' بہت اچھا لگا۔ "دیوار شب" کا کب اینڈ ہوگا۔ سب رائٹرز اچھا بلکہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مگر کنیز نبوی کی تو بات ہی اور ہے۔ کنیز نبوی سب سے الگ اور منفرد لکھتی ہیں۔ اتنی خوب صورتی سے کہ بندہ حیران رہ جائے۔ میرا موسٹ فیورٹ ناول آتش عشق ہے' جس کی تعریف میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے اتنی توجہ اور محبت سے کبھی بار بار کوئی ناول پڑھا ہو' جیسے آتش عشق پڑھا۔ نمرہ احمد بھی بہت بہت اچھا لکھتی ہیں۔ فائزہ افتخار نے تو کمال ہی کردیا۔ "اک نئی سنڈریلا" میشا نام بہت پیارا ہے۔ اگر ہوسکے تو اس نام کا مطلب ضرور بتائیں۔ اب تو میشا کو ایک پرائل گیا۔ "اداس چاند" بھی اچھی تھیں۔ طیب کتنا معصوم تھا ساری کہانی میں اور خاص کر اینڈ میں۔ نمرہ اقراء کو ضرور ضرور پڑھتی ہوں کہ انہوں نے اس ماہ باتوں سے خوشبو آئے میں کیا لکھا ہے۔ میرے ماموں جمیل جو فوج میں ہیں۔ وہ مجھے سارے رسالے پارسل کرتے ہیں۔ پکوان بند کردیں اور آئینہ خانے میں بھی۔ یہ خبریں تو ٹی وی پر بھی آتی ہیں۔

ج اقراء! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ پکوان آپ نے کبھی نہیں بنائے' اس لیے آپ اس سلسلے کو بند کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں' جبکہ ہماری بیشتر قارئین کو یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ آئینہ خانے کا سلسلہ شعاع کا مقبول سلسلہ ہے۔ اور معذرت کے ساتھ شعاع کا سلسلہ ٹی وی کی خبروں سے بہت مختلف ہے پھر بھی اگر آپ کی تجویز کی دیگر قارئین نے بھی تائید کی تو غور کریں گے۔

سائرہ منیر احمد اور مریم منیر مشرق پور شریف سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

فہرست پر نظر مار کر پہلی شعاع پڑھی اور وہ ناول نکالا جس کا اب ایک پل کا انتظار بھی صدیوں پر محیط ہے۔ اف نمرہ جی..... آپ کیا ہیں' کوئی جادو گرنی یا پھر سچ مچ کی پری؟ آپ کے سحر سے کوئی نکل کیوں نہیں پاتا آخر۔ فائزہ افتخار کیا عمدہ تحریر لائی ہیں۔ ہم پھر سے بچپن میں لوٹ جاتے ہیں۔ (ویسے ابھی بڑے ہوئے ہیں نہیں مابدولت بچوں میں ہی شمار ہوتے ہیں۔) رومان کی انٹری مجھے بہت پسند آئی اور بیشا اور اس کے فیری مین رومان کی گپ شپ مزا دے گئی' اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "ستارہ شام" بس سو سو چل رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں' پر دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے۔ "دیوار شب" بہت اچھا چل رہا تھا۔ پر اس قسط کے آخری کچھ پیرا اچھے نہیں لگے۔ کیتی کو نبیل کے سامنے گرانے کی کیا ضرورت تھی اور عالیہ جی! معاذ اور جویا پر تھوڑا رحم کریں اور اب کمال صاحب اور خیام کی بھی ملاقات کروادیں۔ "خواب اور ریشم" بھی ایک اچھی کاوش تھی جو ہر محبت کرنے والے دل کو اچھی ہی لگے گی۔ نمرہ جی کے ناول کے علاوہ اس بار جو ایوارڈ ونگ ناول رہا۔ وہ مکمل ناول "اداس چاند" تھا۔ اف صوفیہ صاحبہ نے اتنا پیارا ناول لکھا کہ بس' بیچ میں کچھ پرنٹنگ مس ٹیک تھی۔ مگر کاوش بہت اٹریکٹو تھی۔

"پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" ہمیشہ کی طرح پیاری لگیں۔ (عمل کی کوشش جاری ہے) "لمحے جب تصویر ہوتے ہیں" پڑھ کر مزا آیا اور انٹرویوز بھی سب سے اچھے تھے۔ اوور آل اگست کا شمارہ سپرہٹ رہا۔

ج سائرہ اور مریم شعاع آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے شکریہ۔

رضوانہ کوثر نے راہوالی کینٹ گوجرانوالہ سے لکھا ہے۔

سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد۔ ادھر مہینے کا آغاز ہوتا ہے' ادھر شعاع کے لیے بے چینی شروع ہوجاتی ہے۔ اس دفعہ کا شمارہ بھی بہت زبردست لگا۔ میں بہت سالوں سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ مگر نمرہ احمد نے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ باقی افسانے' ناولز اور ناولٹ بہت اچھے لگے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں بہت اچھی تھیں۔

ج پیاری رضوانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہد آفریدی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

نورین شفیع نے چاہ باغ والا کھوہ ملتان سے شرکت کی ہے

شعاع بہت ہی خوب صورت اور معیاری رسالہ ہے۔ آپی جی میں نے شعاع میں ایک کہانی رقص جنوں پڑھی تھی وہ کہانی آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ میں نے یہ پوچھنا ہے کہ بشریٰ احمد اور بشریٰ سعید ایک ہی ہیں۔ شعاع میں میری موسٹ فیورٹ کہانی نمرہ احمد کی "جنت کے پتے" ہے۔ فروری کے شمارے میں سرسوں کے پھول شائع ہوئی تھی۔ یہ کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ ایسا لگا جیسے یہ کہانی ہمارے اوپر ہی لکھی ہو۔ اب کچھ تعارف اپنے بارے میں۔ ملتان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں جس میں سولہ سترہ گھر ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ' درمیان میں ہمارے گھر۔ ادھر تقریباً" ہر چیز کی سہولت ہے۔ سڑکوں جتنی چوڑی اور پکی گلیاں' بجلی اور گیس آگئی ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ عورتیں' مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ بس تعلیم کا تھوڑا مسئلہ ہے۔ اسکول ہے' مگر تھوڑے سے فاصلے پر۔ تقریباً" سب ہی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ میں گاؤں کی سادہ سی' پیاری سی لڑکی ہوں' جسے کوئی بھی کام کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ جسے کبھی خواہشیں پریشان نہیں کرتیں اور اچھے اور خوب صورت گھروں میں رہنا' اچھا کھانا اور پہننا میری ترجیح نہیں ہے' جو ہر حال میں مطمئن اور پرسکون رہتی ہے۔ جسے اپنا ایک کمرے کا چھوٹا سا کچا پکا گھر بے حد پیارا لگتا ہے اور بننا سنورنا بھی اچھا نہیں لگتا اور جو ہر کسی کے درد کو اپنا دکھ سمجھتی ہے۔ لوگوں کی خوشی میں خوش رہتی ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے' میں بھی کھیتوں میں کام کرتی ہوں۔ بس میرے لیے اتنا کافی ہے' میں اپنے اللہ سے محبت کرتی ہوں اور میرا مالک مجھ سے محبت

کرتا ہے اور ہاں پلیز ثمرہ بخاری سے کہیں' شبلی اور جوادی کے اوپر ایک اور خوب صورت کہانی لکھیں۔

ج پیاری نورین! آپ کے گاؤں اور آپ کے اپنے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ہمارے ملک کی دیہی آبادی کا بیشتر حصہ محنتی' جفاکش اور قانع ہے۔ سادہ زندگی گزارنے والے یہ لوگ اپنے وطن سے' اپنے مذہب سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی محنت کی بدولت ہی آج ہم اناج میں خود کفیل ہیں۔ رقص جنوں شعاع میں نہیں خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوئی اور یہ کہانی بشریٰ سعید نے لکھی تھی۔ بشریٰ سعید اور بشریٰ احمد ایک نہیں ہیں۔ دونوں میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ بشریٰ سعید کا تعلق اوکاڑہ سے اور بشریٰ احمد کا تعلق بہاول پور سے ہے۔

شعاع میں خط لکھنے کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زوباریہ خالد لاہور سے تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں

ٹائٹل زبردست تھا اور مہندی کا ڈیزائن بھی۔ فائزہ افتخار کا "اک نئی سنڈریلا" میرا پسندیدہ ناولٹ بن چکا ہے۔ اس میں بیشا اور مائر کے کردار مجھے بہت پسند ہیں۔ جس طرح ـــ رومان نے بیشا کو پارٹی میں پہنچایا بہت اچھا لگا۔ صوفیہ بشیر کے ناول "اداس چاند" میں دجانے عثمان نام بہت اچھا اور مختلف لگا۔ اشعار میں ثمرانہ تنویر کا شعر پڑھ کر منہ سے بے ساختہ واہ نکلا۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔

ج زوباریہ! شعاع آپ کو اچھا لگا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سلمیٰ قمر نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے

میں پچھلے پندرہ سال سے خواتین اور شعاع کی مستقل قاری ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب میں نے شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو یہ ڈائجسٹ میرے ہم قدم تھے۔ زندگی کے بہت سے کٹھن معاملات میں رہنمائی اور حوصلہ ملا۔ زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا سلیقہ ملا۔ یہ میرا مطالعہ ہی ہے جو مجھے لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ بے شک یہ شعاع اور خواتین کی مصنفات ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے ایسے لازوال کردار تخلیق کیے ہیں۔ ارد گرد پھیلے ہوئے مسائل میرے حساس دل پر بھی دستک دیتے ہیں۔ کئی بار دل چاہا کہ ذہن میں کلبلاتے ہوئے ان منتشر خیالات کو کہانی کے قالب میں ڈھال دوں۔ مگر اتنی کہنہ مشق مصنفات کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہوجاتی ہوں۔ لیکن اب بالآخر میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ عمل بھی ضروری ہے تکمیل تمنا کے لیے۔ ورنہ رنگین خیالات سے کیا ہوتا ہے۔

ج پیاری سلمیٰ! آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لکھ سکتی ہیں۔ جو افسانے لکھ رکھے ہیں' وہ بھجوادیں۔ نئے لکھنے والوں کی صلاحیتیں سامنے لانے میں ادارہ شعاع کا بہت بڑا کردار ہے۔ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

روبینہ جعفر خان نے کھلابٹ ٹاؤن شپ سے لکھا ہے

شعاع' کرن اور خواتین سے وابستگی اتنی پرانی ہے کہ خود ٹھیک سے مجھے بھی یاد نہیں' شاید اس وقت میں ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ یہ 99ء کی بات ہے اور گزرتے وقت نے اس جنون کو اور ہوا دی ہے۔ امی' بابا نے بھی کبھی روک ٹوک نہیں کی' بلکہ بابا کہتے ہیں' بیٹا ہر کتاب پڑھا کرو' اس سے انسان کو شعور و آگہی ملتی ہے۔ امی کبھی کبھی ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ مگر بابا اور دادا جان کی حمایت تھی۔

ج : روبینہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے والد اور دادا جان سمجھ دار انسان ہیں اور مطالعہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ سے شعور و آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زاہدہ چوہدری نے گجرات سے لکھا ہے

میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی بہت پرانی اور خاموش قاری ہوں۔ خط اس لیے نہیں لکھتی کہ مجھے پتا ہے کبھی بھی شائع نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ صرف خاص خاص خط ہی شائع کرتے ہیں۔ اب تو بچے بھی ماشاء اللہ جوان ہوگئے ہیں۔ آج بھی خط نہ لکھتی' لیکن میرے خط لکھنے کی وجہ ماریہ شاہ ہیں۔ جنہوں نے ماہ اگست کے شعاع میں نمرہ احمد پر تنقید کی ہے اور یہ تنقید میرے دل پر لگی ہے۔ یقین

جانیے مجھے اتنی تکلیف پہنچی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔
ماریہ شاہ اگر نمرہ جی نے تقسیم کو ٹاقسم لکھ دیا تو کون سا گناہ ہوگیا۔ انہوں نے ٹاقسم ہی لکھا ہے کوئی اور نام تو نہیں لکھ دیا نا۔ انہوں نے لکھا بھی ہے کہ تقسیم اسکوائر ہی نام ہے۔ کسی نے انہیں ٹاقسم اسکوائر ہی کہا ہوگا۔ تب ہی انہوں نے ٹاقسم لکھا۔ ٹاپ کپی اور توپ قاپی میں بھی کوئی فرق نہیں۔ باقی نمرہ جی کو ایک بات کہنی ہے کہ آپ ہیروئن پر بہت زیادہ ظلم کرتی ہیں۔ مصحف میں بھی آپ نے ہیروئن کو شدید زخمی کیا اور اب "جنت کے پتے" کی حیا کو بھی شدید زخمی کیا۔ پلیز انہیں کم تکلیف دیا کریں، ہمیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

ج: پیاری زاہدہ! آپ نے صحیح لکھا کہ ہم خاص خاص خط شائع کرتے ہیں، لیکن شاید آپ کو یہ نہیں پتا کہ ہماری ساری قارئین ہی ہمارے لیے بہت خاص اور بہت اہم ہیں۔ اور ان کے لکھے ایک ایک خط کو ہم بہت محبت اور توجہ سے پڑھتے ہیں اور شائع کرتے ہیں۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے اور آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ آپ بھی خاص لوگوں میں شامل ہیں۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

نوین ضیاء، گجرات سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

کلرورق پر بہت کیوٹ سی لڑکی مسکرانے کی کوشش میں متوجہ کر رہی ہے۔ اس کی مہندی کا رنگ گرمی کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ آپی میں تاریخ کی طلبہ ہوں تو اس حوالے سے ورلڈ ہسٹری کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھا کریں۔ ویسے میں "تاریخ کے جھروکے" شوق سے پڑھتی ہوں اور اہم باتیں نوٹ بھی کر لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ کھلتا کسی یہ کیوں میں کوشش کریں کہ بار بار ایک جیسے شعر نہ شائع کیا کریں تو کچھ نیا اور منفرد مزا دے گا۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ اب بات ہو جائے "دیوار شب" کی تو عالیہ بخاری بہت اچھے انداز میں لکھ رہی ہیں۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ کہنا یہ تھا کہ عاد و ثمود قوم کے بارے میں قرآن کی روشنی میں ضرور کچھ لکھیے گا۔ آخر میں شاہین رشید کی تعریف کروں گی کہ وہ اتنے اچھے اچھے فنکاروں کے انٹرویو لے رہی ہیں ان سے بھی ایک فرمائش ہے کہ پلیز ایف ایم 102 کے پریزنٹر مسعود احمد خان اور سلیمان شوکت کا بمعہ تصویر انٹرویو کیا۔

ج: نورین شعاع کے پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

شازیہ قیصر نے گاؤں نروال شریف ضلع گجرات سے لکھا ہے۔

خواتین اور شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ 1999ء کے اگست خواتین کا شمارہ پہلی بار پڑھا تھا۔ اتنے طویل عرصے میں زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ شادی کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ماسٹرز مکمل کیا۔ بی ایڈ کیا لیکن ایک عادت نہیں چھوٹی اور وہ تھی باقاعدگی سے شعاع کا مطالعہ۔ میں جہلم شہر کے ایک چھوٹے سے گاؤں نروال شریف کی رہائشی ہوں جہاں گاؤں کے ایک طرف دریائے جہلم بہتا ہے اور دوسری طرف نہر تاحد نظر پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت جس کو ٹیوب ویل کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس تپتی اور جھلسا دینے والی گرمی میں ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کا جو مزا اور سرور ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی اور اگر اس پانی میں ٹھنڈے ہوئے آم ہو جائیں تو کیا بات ہے۔ شعاع اس ادارے کی اور لکھاری بہنوں کی محنت اور کاوشوں کا بھرپور اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ شعاع کے تقریباً سارے ہی سلسلے بہت زبردست ہیں لیکن مجھے تاریخ کے جھروکے والا سلسلہ بہت پسند ہے اس سے اپنی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ سلسلے وار ناول دونوں ہی بہت زبردست ہیں۔

پیاری شازیہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ! امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عالیہ بُخاری

دیا اور شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتلائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے بس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھرا سا لوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دُعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



قسط نمبر ۵۵

شام گہری ہورہی تھی۔

اور اب یہ چھوٹا سا گھر تقریباً" خالی تھا سوائے تھوڑے بہت سامان کے۔

خیام نے آج ساری الماریاں وراز یں وغیرہ بھی چیک کرلی تھیں تاکہ کوئی کام کی چیز نہ رہ جائے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی الماریاں اور کچھ اور سامان بھی اسکول کی نئی عمارت کی طرف روانہ کروادیا تھا۔

الماریوں سے نکالی کچھ ردی میز پر رکھ کروہ کرسی پر بیٹھا اب اس چھوٹے سے ڈھیر کو چیک کررہا تھا۔ کہیں کوئی کام کا کاغذ ادھر ادھر نہ ہوجائے۔ معاذ کی چیزوں کے بارے میں وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور ذمہ دار تھا۔ زندگی میں پہلی بار بڑا اطمینان اور ٹھہراؤ تھا۔ اور گیتی سے ملنے سے پہلے وہ واقعی خوش بھی تھا۔

برآمدے کو پار کرکے آتے ہواؤں کے جھونکے رات کی رانی اور بیلے کی خوشبوؤں سے بوجھل تھے۔ ایک کے بعد ایک قریب رکھا ڈسٹ بن بھرتا جارہا تھا۔

تب ہی دروازے کی بیل ہوئی تھی۔

لڑکوں کا آنا جانا معمول کی بات تھی وہ یوں ہی پین ہاتھ میں لیے لیے دروازے تک آیا تھا۔

"جی!" اس نے سامنے کھڑے شخص کو الجھن بھرے انداز میں دیکھا۔

"مجھے کمال صاحب نے بھیجا ہے۔" اس کے چہرے پر آئی ہلکی سی مسکراہٹ اس کی خوش اخلاقی کا پتا دے رہی تھی۔ خیام یوں ہی بے تاثر سے انداز میں اس کی طرف دیکھے گیا۔

"انہوں نے یہ لفافہ دیا ہے' معاذ صاحب کو دینا ہے۔ بہت ضروری ہے۔"

خیام نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ہلکے سے اثبات میں سرہلایا۔

"بہت ضروری ہے۔ یاد سے انہیں پہنچا دیجیے گا۔" اس شخص نے ایک بار پھر کہا۔

"فکر مت کریں' معاذ بھائی تک پہنچ جائے گا۔ آپ بیٹھیں' چائے پئیں۔" خیام ہلکے سے مسکرایا۔ اپنے اندر کی ساری تکلیف چھپا کر نارمل رہنے کا گر کسی حد تک تو اس نے سیکھ ہی لیا تھا۔

"نہیں! میں چلتا ہوں۔ کچھ اور بھی کام ہیں۔ بہت شکریہ!" وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ خیام اس وقت تک وہیں دروازے میں کھڑا رہا' جب تک وہ گاڑی لے کر رخصت نہ ہوگیا۔

یہ ایک شان دار گاڑی تھی' جس سے وہ کمال صاحب کی حیثیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

وہاں نانی ستارہ کے محلے میں آنے والوں میں ایسی گاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور ان گاڑیوں میں آنے والوں سے اسے ہمیشہ سخت نفرت رہی تھی۔

"اونہہ!" اس نے ہلکے سے سر کو جھٹک کر دروازہ بند کیا۔ اندر میز پر ابھی بھی ردی کاغذوں کا ڈھیر جمع تھا۔ لفافہ ادھر ادھر ہوجانے کے ڈر سے اس نے سب سے پہلے اسے اپنے بیگ میں بند کیا اور پھر واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بڑی سی گاڑی ذہن میں چبھ سی رہی تھی۔

"پتا نہیں! اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے۔ جو سارے عیش و عشرت واجب کردیتا ہے۔ اور یہ کمال بھی کون سا..."

یوسف کمال کے لیے ایک بدترین اندازہ لگاتے لگاتے' اس نے ادھورا چھوڑا۔

فخر کی بات یہ تھی کہ ہر ایک کو ہی معاذ سے کام پڑتا تھا۔ خیام کے چہرے پر پرزور سی مسکراہٹ ابھری۔ لفافے کی وصولی کا میسج' معاذ کو بھیج کر اس نے چند منٹ اس کی طرف سے کسی اور ہدایت کا انتظار کیا۔

وہ عام طور پر چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی جواب دیتا تھا۔ لیکن آج اس طرف خاموشی چھائی تھی۔

"شاید زیادہ ہی مصروف ہوں۔" خیام کو تو ایسا ہی لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاذ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔

فون کتنی بار بج کر خاموش ہوا۔

میسج' کالز..... مگر سب ہی کچھ بے اثر۔

وہ سر جھکائے گہرے ہوتے سبزے کو دیکھے گیا۔

مدت ہوئی اسے سبزے' درختوں' بادلوں میں من پسند شبیہہ دیکھے ہوئے۔ اب نہ ہوا سرگوشی کرتی تھی اور نہ ہی دھوپ کا سنہرا پن قدموں سے لپٹتا تھا۔ فطرت اس سے باتیں کرنا چھوڑ چکی تھی یا وہ خود...؟ اندر بڑے ہال میں شائستہ امی فرداً" فرداً" قریبی عزیزوں سے اس "خوش خبری" کی تصدیق کرتے کرتے مزید پرسکون ہوچکی تھیں۔

"شکر ہے' جویہ بلا ٹلی۔ ورنہ میرے دل کو ہمیشہ اس کی طرف سے کھٹکا ہی لگا رہتا تھا کہ کہیں باہر کے باہر معاذ کو نہ لے اڑے۔ آخر کو ہے تو شاکرہ اور اظہار کی بیٹی ہی نا۔"

سامنے خاموش بیٹھی ربیعہ سے کہتے ہوئے وہ طمانیت سے مسکرائیں۔ اب یہاں صرف وہ دونوں تھیں۔ دادی بہت دیر ہوئی اپنے کمرے میں جاکر لیٹ چکی تھیں۔

آج انہوں نے رات کے کھانے کو بھی منع کردیا تھا۔

"کوئی کچھ کہے' لیکن اظہار بھائی اور شاکرہ دونوں کے سامنے اپنا کیا ہی آیا ہے۔ اولاد' مال' عزت سب ہی کچھ تو داؤ پر لگا۔ سارے غرور کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتا تھا۔ اب دیکھ رہی ہے ساری دنیا۔"

"خدا کے لیے امی!" ربیعہ نے بے ساختہ ہی ان کی بات کاٹی تھی۔

"اللہ سے پناہ مانگیے بس..... گناہ گار کون نہیں ہے یہاں..... اور پھر بے چاری جویا کا کیا قصور ہے۔ یہی نا کہ معاذ اسے پسند کرتا ہے دل و جان سے...؟" اتنی سی بات بھی گلے میں پھنستے ہوئے آنسوؤں نے اسے پوری نہیں کرنے دی۔

شائستہ امی کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یک دم ہی غائب ہوئی۔

"معاذ اسے نہیں پسند کرتا۔ پہلے کبھی اگر کچھ خیال تھا بھی اسے تو اب کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے ماں باپ اپنے گھرانے کی ذلت کرنے والوں کے ساتھ رشتہ نہیں جوڑ سکتا اور جویا کے لیے تو وہ مجھ سے وعدہ کرچکا ہے' بہت پہلے کہ وہ اس کا نام اب کبھی نہیں لے گا۔"

"جب وہ وعدہ کررہا تھا' تو کاش! آپ نے غور سے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہوتا... اور اگر جب نہیں دیکھا تھا تو اب دیکھ لیں..... بیٹھا ہوا ہے وہ سیڑھیوں پر کب سے۔" ربیعہ کا لہجہ تلخ تر تھا۔

سامنے برآمدے پر کھلتی کھڑکیوں سے اگلے احاطے کی سیڑھیاں نظر آتی تھیں اور ربیعہ کی بات کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

"وہ جگہ ہمیشہ سے معاذ کی پسندیدہ رہی ہے۔ چھوٹا سا تھا تو تب سے وہیں بیٹھا کرتا تھا زیادہ تر۔"

"سو ثابت ہوا کہ وہ کچھ اثر لینے کو تیار نہیں۔" ربیعہ نے مایوسی سے سوچا۔

"اور تم بھی اس معاملے میں دماغ مت کھپاؤ..... اختر بھائی کے گھر والے آرہے ہیں۔ میں جلد سے جلد تمہارے فرض سے بھی فارغ ہونا چاہتی ہوں۔ خدا کرے! سب کام بخیر و عافیت انجام پا جائے۔ اور ہاں.....!" وہ کمرے سے نکلتے ہوئے ذرا رکیں۔

"معاذ کے ساتھ زیادہ ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... اور نہ ہی جویا کے بارے میں بات کرنے کی۔ جو کچھ ہو رہا ہے' ہونے دو..... وقت ہر زخم کا علاج ہے۔"

تنبیہہ کرتی ایک نگاہ ربیعہ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی اور باہر چلی گئیں۔

ربیعہ چپ چاپ چلتی ہوئی بڑے کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

امی' ابا کی اسٹڈی میں داخل ہو رہی تھیں اور وہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ وہاں اسی موضوع پر بات کرنے گئی ہیں جس کے بارے میں انہوں نے ابھی خود اسے سختی سے کچھ کہنے سننے سے منع کیا ہے۔

وہ جہاں کھڑی تھی۔ وہاں سے اسے معاذ کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

دادی کے بتائے ہوئے سامان کی لسٹ کو شاید پہلی بار اس نے پس پشت ڈالا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے دیکھے گئی۔

امی نہ بھی منع کرتیں' تب بھی وہ اس وقت معاذ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

"کاش! یہ سب کچھ اس طرح نہ ہوتا۔"

ایک چھوٹے سے پل میں اس نے معاذ اور جویا کے مسکراتے ہوئے چہروں کو ساتھ ساتھ دیکھا۔

شفاف آنکھیں اور محبت کرنے والے دل۔

خود غرضی اور بے حسی کے ہاتھوں سنگ دلی سے برباد ہوئے تھے۔

"اور یہ معاذ!" اس کی پشت پر نگاہ جمائے اس نے مایوسی سے سوچا۔

"لوگوں کے لیے اتنی دردمندی سے' اتنی لگن کے ساتھ کچھ بھی کر لینے کے لیے ہمہ وقت تیار' اپنی ہمت اور بساط سے کہیں آگے بڑھ کر۔

گیراج اسکول سے زری تک' بیچ میں کتنے ہی اور سلسلے تھے۔ کیا اسے کوئی ایک دعا بھی نہیں لگی تھی؟" ربیعہ کی آنکھ کے کونے پر پانی کا قطرہ چمک رہا تھا۔

برآمدے کے دوسرے کونے پر ابا کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔

شائستہ امی کی اتنی جلدی واپسی غیر متوقع تھی اور وہ خود بھی دوبارہ یہ تکلیف دہ باتیں سننا نہیں چاہ رہی تھی' سو انگلی کی پور سے آنسو کے قطرے کو جھٹکتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

آپا گل کی ٹیکسی نیچے دروازے کے پاس آکر رکی تھی۔

فریدالدین کے لائے ہوئے پھل اور مٹھائی کو پوری کنجوسی کے ساتھ منتخب گھروں میں تقسیم کرنے میں آدھے

سے زیادہ دن نکل گیا تھا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر وہ اندر سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہوئیں تو سلمان اوپر کی دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا' مالک مکان کے بیٹے کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔

"کوئی شوق نہیں ہے ہمیں تمہارے اس کھنڈر میں رہنے کا۔ پتا نہیں کیوں آگئے تھے یہاں رہنے کے لیے۔ تین بیڈ روم کا لگژری فلیٹ تیار ہو گیا ہے ہمارا۔ کچھ دن کی بات ہے بس۔ ہم تو اس گھر کیا' گلی میں بھی قدم نہیں رکھیں گے۔"

آپا گل کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ اتری۔ ان کے حصے کے کئی کام سلمان بخوبی کرنے لگا تھا۔

شاکرہ امی کمرے میں اکیلی تھیں۔

"اٹھ گئیں آپ! میں آئی تھی صبح دس بجے' تب تک تو آپ سو رہی تھیں۔"

"ہاں! نیند کی گولیوں کا اثر جب تک رہتا ہے' سوتی ہی رہتی ہوں۔ پتا نہیں چلتا۔"

"اچھا ہے! آرام ملتا ہے سونے سے..... اور آپ کو تو ویسے بھی سونا چاہیے زیادہ سے زیادہ..... جاگتی ہیں تو پھر سے ذہن پر فکریں سوار کر لیتی ہیں بے کار میں۔"

"تم کہاں سے آرہی ہو؟" آپا گل کی ہمدردی کو یکسر مسترد کر کے انہوں نے ذہن میں چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں..... قریبی قریبی بھی آٹھ گھر بنتے تھے۔ جویا کی بات طے ہونے کی مٹھائی وہاں تو جانا ضروری تھی۔ ہمت کر کے دے ہی آئی۔ وہ تو شکر ہے کہ تین چار گھر ایک ہی گلی میں تھے..... کرائے کی بچت ہو گئی۔ پھر بھی پندرہ سو پچھتر روپے خرچ ہو گئے پورے۔ دے دیجیے گا مجھے جویا سے لے کر۔" انہوں نے کارکردگی اور تقاضا ایک ساتھ کیا۔

"ہم سے کیوں؟ فریدالدین سے لیں نا۔ منگنی تو اس کی ہوئی ہے اور سب سے زیادہ خوش بھی وہ ہی ہے۔" سلمان اندر آچکا تھا اور آپا گل پر اعتراض اس کا حق بنتا تھا۔ آپا گل نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"فریدالدین سے زیادہ تو تم خوش ہو..... زندگی تو تمہاری بدل رہی ہے۔ یہاں سے جان چھوٹ رہی ہے تمہاری۔ بڑے سے فلیٹ میں رہو گے مزے سے۔"

"میں اس سے کہیں زیادہ مزے دیکھ چکا ہوں۔ یہ آپ کا بھائی فرید تو زوبیہ کے ڈیڈی کا پانچ پرسنٹ بھی نہیں ہے اور زوبیہ بھی بے شک اب میری بیوی نہیں ہے۔ لیکن ایمان داری سے کہتا ہوں' بڑے کھلے ہاتھ کی عورت تھی۔ جو کھاؤ پیو' خرچ کرو' کوئی اعتراض نہیں۔ یہ فرید تو بالکل ہی الگ کیس ہے۔ مطلب کے وقت تجوری کھولنے والا۔ ورنہ تالا ڈال کر' سانپ بن کر بیٹھا رہے گا عمر بھر....." ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اس نے اپنے طور پر ایک دیانت دارانہ تجزیہ کیا۔

"تم میں واقعی خاصی کمینگی ہے سلمان! منہ پر تو "فرید بھائی' فرید بھائی" کہتے ہوئے زبان سوکھتی ہے تمہاری اور پیچھے....." مارے کوفت کے ان سے بات بھی مکمل نہیں ہوئی۔

سلمان قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"اتنی ٹھوکریں کھا لینے کے بعد بھی اگر عقل نہیں پکڑتا تو پھر تو پتا نہیں کہاں ٹھکانا بننا تھا۔ اور شکر ہے کہ جویا کی جگہ تم نہیں تھیں ورنہ پہلے ہی دن کسی رفاہی ادارے کا پتا بتا دیتیں مجھے۔" آج اس پر کچھ سچ سوار تھے۔

"میں جویا کی طرح بے وقوف جو نہیں ہوں۔" اس بار وہ برا ماننے کے بجائے ہنس پڑیں۔

شاکرہ بیگم نے حسرت بھری نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہمارے گھر سے مٹھائی دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے۔ مجال ہے جو کوئی ایک بھی خوش ہوا ہو۔ لگے الٹے سیدھے سوال کرنے۔ کون لوگ ہیں؟ ایک دم اتنی جلدی میں کیوں ہو رہی ہے شادی کو ہی وکیل ہے جو ابرار بھائی کا کیس لڑ رہا ہے؟ قسم سے امی..... آپ کے بہن بھائی کی ذہنیت تو سب سے گھٹیا ہے۔ ویسے برسوں ملنے نہیں آتے اور جویا کی فکر میں سب گھلے جا رہے ہیں۔"

ان کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ سو اب ٹرپ کی داستان کا نمبر تھا۔

"شبیر ماموں تو مٹھائی بھی نہیں لے رہے تھے۔ گیٹ پر ان کی بہو کو زبردستی پکڑائی ہے میں نے۔ وہی رٹ کہ اسلام بھائی کے لڑکے میں کیا برائی ہے۔ اب تو نوکری پر بھی لگ گیا ہے۔ دیکھا بھالا بچہ ہے۔ میں بات کر لیتا ہوں اسلام سے۔ میں تو جا کر پچھتائی۔"

شاکرہ بیگم نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

"جل رہے ہوں گے سب..... اور تمہیں ضرورت ہی کیا تھی جانے کی۔ بے کار میں ہی خود کو ذلیل کروایا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فرید سے مل کر ویسے بھی لوگوں کو مایوسی ہونی ہے اور بھی باتیں بنیں گی۔" سلمان کو مٹھائی بانٹنے جانے کے آئیڈیے سے ویسے بھی یکسر اختلاف تھا۔

"جب وہ اتنا برا ہے تو کیا ضرورت ہے جویا سے رشتہ کرنے کی۔ میں تو شروع سے منع کر رہی ہوں۔ آخر تم لوگ میری سنتے کیوں نہیں ہو۔" دھیما اور بے بس لہجہ۔

آپا گل اور سلمان نے ایک دوسرے کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ اب ہمارا نہیں، ابو کا بھی فیصلہ ہے۔ کتنی مدت ہو گئی ہے انہیں وہاں پڑے ہوئے۔ فرید الدین ضمانت کی رقم بھر رہا ہے۔ چند دن میں آ رہے ہیں گھر وہ۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ گھر کی عزت بحال ہو رہی ہے۔"

"ضمانت کی رقم تو کسی سے ادھار بھی لے کر بھری جا سکتی ہے اس کے لیے جویا کی زندگی کو داؤ پر لگانا....."

آپا گل نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

"کوئی داؤ پر نہیں لگ رہی ہے جویا کی زندگی۔ سکون، عیش، آرام مل جائے گا اسے بھی..... کتنی بار سمجھاؤں آپ کو..... اور ادھار مانگ کر خاندان میں مزید ذلت نہیں کروا سکتے ہم اپنی..... صاف بات ہے۔ خدا کے لیے اپنے پاگل پن پر قابو پائیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ نیند کی گولی کی ڈوز بڑھا دیں۔ سوتی رہا کریں بے خبر....."

آپا گل کی آواز یک دم ہی خاصی اونچی ہوئی تھی اور ان کے ماتھے پر آیا بل اور بھی زیادہ گہرا۔

شاکرہ امی نے خوف زدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"خود تو آپ لوگ منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔ مگر مجھے تو زمانے کو منہ دکھانا پڑتا ہے۔ کس کس طرح کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں سسرال میں، رشتے داروں میں۔ میری اپنی بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ ابو کا جیل جانا ہی کیا کم ہے۔ یہ جویا کے بار بار ٹوٹتے رشتے بھی ان کے لیے مصیبت کھڑی کرنے والے ہیں۔ عذاب بن گئے ہیں آپ لوگ میرے لیے....." یک دم ہی وہ زور زور سے چیخنے لگیں۔

شاکرہ امی نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

"جویا خوش نہیں ہے۔"

"وہ کبھی خوش رہ بھی نہیں سکتی اگر اس معاذ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ ساری نحوست اسی کی لائی ہوئی ہے۔ اعجاز سے شادی سے انکار بہانہ بنا تھا ہماری بربادی کا۔ جب تک یہاں ہے کچھ نہیں بننے والا..... اور میں

صاف کہہ رہی ہوں کہ...." یک دم ہی انہوں نے مزید خوف زدہ کرنے والا وقفہ لیا۔
سلمان اس ساری جھک جھک کے دوران فریدالدین کے لائے ہوئے پھلوں کے ٹوکرے میں سے سیب نکال کر دھونے کے لیے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ بھی دروازے میں ٹھٹک کر رکا تھا۔
"اب کہہ بھی دو آپا گل.... تھرڈ کلاس فلم سسپنس تو مت پیدا کرو۔" اس کے لہجے میں اکتاہٹ سی تھی۔
"تم مذاق مت سمجھو سلمان! میں تمہاری طرح ڈھیٹ 'بے غیرت نہیں ہوں' جو بار بار کی رسوائی برداشت کر سکوں۔ اس بار اگر جویا کی شادی میں کوئی رکاوٹ آئی تو میں خود کو ختم کرلوں گی۔ آگ لگالوں گی یا زہر کھالوں گی یا جو بھی سہی.... زمانے کے سامنے ایک اور شرمندگی نہیں اٹھاؤں گی۔ اس لیے آئندہ جو کچھ بھی کیا جائے' سوچ سمجھ کر کیا جائے۔"
شاکرہ امی کے چہرے پر اپنی نگاہ جما کر انہوں نے بات مکمل کی اور چادر اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔
سیڑھیوں پر سے ان کے اترنے کی آواز اور پھر نیچے کا دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز۔
شاکرہ امی کے لب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے تھے۔ سلمان نے لاتعلقی سے کندھوں کو جنبش دی اور ہاتھ میں پکڑے اپنے سیب سنبھالتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔
گھر میں ایک دم ہی سناٹا چھا گیا۔
زویا اور جویا دونوں ہی اس وقت نہیں تھیں۔



دھوپ میں صبح سے ہی تیزی تھی۔
نانی ستارہ کے بڑے سے ہال نما کمرے کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں پر دھوپ پھیلتی ہی جا رہی تھی۔
شاما نے آگے بڑھ کر نیلے ویلوٹ کے پردوں کو کھول کر پھیلایا تو ساری تپش کہیں پیچھے ہی رہ گئی۔ نیلاہٹ مائل ٹھنڈک بھرا احساس سکون آمیز تھا۔ وہ تیزی سے واپس باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد واپس آئی تو ہاتھ میں شیشے کا پانی سے بھرا بڑا سا نقشین پیالہ تھا جس میں بیلے کے پھول بھرے ہوئے تھے۔ شاما نے بڑی آہستگی سے نانی ستارہ کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ مگر اتنی احتیاط کے باوجود بھی ان کی آنکھ کھل ہی گئی۔
"آپ کی نیند خراب ہوئی۔" وہ خفت میں مبتلا ہوئی۔
"کوئی نہیں' سوئی تھوڑی تھی۔ ایسے ہی آنکھیں بند کی تھیں۔ غنودگی سی آگئی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔
"یہ نگینہ اور صندل کہاں ہیں' گھر پر ہیں بھی یا نہیں؟"
"اسٹیٹ ایجنٹ آیا تھا۔" نانی کی بیڈ شیٹ کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے تازہ ترین اطلاع دینی شروع کی۔
"صندل اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس سے پہلے باجی نگینہ اور صندل کا بڑا برا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اب باجی اپنے کمرے میں ہیں۔"
نانی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "رو رہی ہوگی غریب.... بلا کر لا اسے.... مگر رک!"
شاما نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
"دل ہلکا ہوگا تو خود ہی آجائے گی' کسی کسی وقت ہر انسان کو تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چھوڑ دے اسے بھی۔"
شاما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"بے چاری باجی نگینہ.... اللہ گیتی کو سلامت رکھے اپنے گھر پر.... ورنہ تو باجی کا دامن آج بھی خالی ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہے۔" اس کا اترا اترا چہرہ نانی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔
"کچھ نہیں نانی....! پیر دبا دوں آپ کے۔" وہ جلدی سے ان کی پائنتی آکر بیٹھی۔
"نہیں۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ "ذرا میری وہ ڈائری نکال کر لا دراز سے' کالی جلد والی۔"
شاما نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی اور ان کے دوسرے اشارے پر کمرے سے باہر نکل گئی۔
نانی نے سائیڈ پر سے اپنا چشمہ اور بال پین اٹھا کر ڈائری سامنے کھول لی تھی۔
ڈائری برسوں پرانی تھی' کئی کاغذ پیلے پڑ چکے تھے۔
لیکن اب بھی ان کے استعمال میں تھی۔ آدھی سے زیادہ زندگی کے روپے پیسے کا حساب یہیں درج تھا۔
دور کسی زمانے کے گوشوارے جن میں کہیں خسارہ نہ تھا۔
وہ صفحات پلٹتی ہوئی آخر میں آکر رکیں۔
یہاں پچھلے کافی سالوں سے گوشوارے کی ترتیب بدلتی تھی۔ نگینہ کی جان توڑ کی جانے والی محنت کے بدلے میں ملنے والی مختصر سی رقم' اخراجات کا بڑھتا ہوا گراف اور دونوں کو کھینچ تان کر برابر لانے کی تگ ودو میں تسلسل سے بکتے ہوئے فیروزہ کے زیورات۔
دل پر سے کتنے ہی عالم گزرتے چلے گئے۔
صندل کی مختصر سی طوفانی کامیابی میں آمدنی میں آتے بڑے چیک اس کے اپنے پروٹوکول کی نذر تھے۔
وہ قسم کھا کر کہہ سکتی تھیں کہ ایک پیسہ بھی انہوں نے اس کا اپنے گھر پر نہیں لگایا تھا۔ کامیابی کا سارا جشن انہوں نے محض اپنے پاس سے کیا تھا۔
بعد میں تو نگینہ اور صندل جا کر خریدی گئی کوٹھی میں ٹھہری تھیں یہاں گھر میں مدت سے آمدنی صفر ہوئی تھی۔
سو وضع داری' اجلی پوشی کو برقرار رکھنے کی اب تک کی تگ ودو بھی لاحاصل ہی ٹھہری۔
انہوں نے مایوسی سے سوچتے ہوئے سامنے لکھی چند اور رقموں کو کاٹا۔
کسی بھی صورت میں جمع شدہ یہ رقم ٹھکانے لگ چکی تھی۔ وہ کچھ دیر فکر مندی سے سر جھکائے کچھ سوچ گئیں۔ اب تک کی زندگی عزت سے کٹی تھی۔
عروج کا زمانہ کب کا معدوم سہی' لیکن ان کے نام کا بھرم آج بھی برقرار تھا۔
آج انہوں نے شاما کو بلانے کے بجائے خود اٹھ کر اپنی الماری کا سیف کھول کر فیروزہ کے زیورات کے خالی ڈبے نکال کر چیک کیے۔
ایک کے بعد ایک.... آخری چوڑی کو بھی بکے ہوئے دو مہینے ہو رہے تھے۔ سونے کی بڑھتی ہوئی قیمت کا ہی سہارا تھا جو اب تک کی گزر بسر ہو رہی تھی۔
"آگے اللہ مالک!" دل کی گہرائی سے انہوں نے وہ سب سے بڑا سہارا یاد کیا اور الماری بند کر کے واپس مسہری پر آ بیٹھیں۔
تب ہی نگینہ اندر چلی آئی۔
"کیا ہوا اماں.... ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔" اس کی چھٹی حس نے اسے فوراً ہی خبردار کیا تھا۔
"کچھ نہیں ایسے ہی.... گیتی یاد آرہی تھی.... سوچ رہی تھی اسے فون کرلوں۔" خود کو سنبھالے رکھنے کی ادا ان کی فطرت کا حصہ بن چکی تھی' سو خوبی سے بات بنا گئیں۔ نگینہ جیسی گھاگ بھی ان کی چوری نہیں پکڑ سکتی تھی۔

”وہ تو ہے.... جب سے گئی ہے ایک بار بھی نہیں آسکی.... حالانکہ سالار بے چارے نے تھوڑی کوئی پابندی لگائی ہے‘ لیکن اچھا ہے وہیں رہے۔ یہاں آکر ہمارے مسئلے دیکھے گی تو واپس جا کر اس کا دل بھی نہیں لگے گا۔“ نگینہ افسردگی سے مسکرائی۔

نانی ستارہ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اگرچہ وہ ابھی ابھی ہلکا میک اپ کر چکی تھی‘ پھر بھی اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصا رو دھو چکی ہے۔

”اماں! صندل نے کوٹھی کا سودا فائنل کر دیا ہے۔ اس وقت اسی کی غرض سے گئی ہے اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ کوٹھی پر۔ وہیں اپنے وکیل کو بلا لیا ہے۔“

نانی ستارہ سے نگاہیں چراتے ہوئے اس نے اپنے رونے کی وجہ بھی سنا ڈالی۔

صندل کی کوٹھی میں وہ جس چاؤ سے جا کر رہی تھی.... وہ کچھ زیادہ دور کی بات نہیں تھی۔

نگینہ کی چال ڈھال‘ کھلکھلاہٹ سب ہی کچھ کتنا اجنبی سا تھا ان دنوں۔

نانی کو بے ساختہ ہی پہلی بار صندل کی کوٹھی میں اپنا اور گیتی‘ شاما کا جانا یاد آیا۔

نگینہ غریب کی کیا‘ خود ان کا سر بھی فخر سے بلند ہوا تھا۔ گیتی آرا کو انہوں نے وہاں اس مقصد سے چھوڑا تھا کہ بالی کے ہاں بڑے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ گیتی کا نصیب بھی کھل جائے گا۔ مگر وہ تو اپنے وقت پر کھلا اور اسی چوبارے پر کھلا۔ وہ عادتاً ”کہیں سے کہیں پہنچیں۔

”اور ستم یہ اماں کہ بے حد سستی بکی ہے اور سارے کا سارا پیسہ پتا نہیں کون سے حسابوں میں کٹ رہا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔“ نگینہ کی آگے کی روداد میں کوئی نئی بات نہیں تھی‘ مگر پھر بھی ہر بار سنتے ہوئے دل اور بھی زیادہ دکھتا تھا۔

”بالی بدبخت نے سمجھ لیا ہے کہ اب یہ لڑکی نہیں چلنے والی۔ اس لیے جو لگایا تھا اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں اماں.... ! ساری عمر میں نے یہ سبق بار بار پڑھا‘ پھر بھی کچھ عقل نہ لی۔“ نگینہ کی آواز پھر سے نمی میں ڈوبی۔

”میں بالی سے بات کروں ایک بار.... شاید میرا لحاظ کر لے۔“ نانی نے امید کا ایک سرا تھامنا چاہا۔

مگر نگینہ نے بڑی تیزی سے ہتھیلی سے رگڑ کر اپنا چہرہ صاف کیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اماں.... ایسا سوچیے گا بھی مت۔ اس کمینے بالی کے سامنے آپ....“

سوچ کر بھی اس کا رنگ زرد پڑا جا رہا تھا۔ ”بھگت لیں گے۔ پہلے بھی تو آخر زندگی گزاری ہے نا.... دم ہے ابھی اس نگینہ جان میں‘ نہیں کرتی صندل‘ کچھ بھی نہ کرے.... میں ہوں نا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

جوش جذبات سے نگینہ کا چہرہ سرخی مائل ہوا تھا اور آنکھوں پر لگا نیلا آئی شیڈو پھیل کر چہرے پر آ رہا تھا۔

اسے خود پتا نہیں تھا کہ جو دعوا وہ کر رہی ہے‘ اب اس کے لیے بھی اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ نانی ستارہ کو اس پر بری طرح رحم آیا۔

”ایک بار بات کرنے میں حرج نہیں ہے نگینہ.... ! بالی اور کسی کی نہ سہی‘ میرے نام کی ضرور عزت رکھے گا.... زیادہ نہ سہی کچھ تو رعایت....“ وہ اسے مشقت سے بچانا چاہتی تھیں۔ مگر نگینہ نے تیزی سے پھر سے بات کاٹنے کی گستاخی کی۔

”میں نے کہا نا نہیں....“ آپ کو اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اماں.... وہ بہت گھٹیا انسان ہے۔

میں کر چکی ہوں کوشش اسے راضی کرنے کی۔ پتا ہے۔ ہاتھ تک جوڑ کر آئی ہوں اس کے آگے۔ تین گھنٹے آفس کے باہر بٹھائے رکھنے کے بعد اس نے تین منٹ بھی میری بات سننی گوارا نہیں کی.... سال پیچھے تک نگینہ جی نگینہ جی کر کے بات کرتا تھا.... باہر شوٹ پر جاتا تو صندل کے ساتھ میرے لیے بھی تحفے لاتا ہے اور اب اس.... طرح مجھے دھتکارا جیسے کسی ڈھیٹ بھکاری کو جو جان نہ چھوڑ رہا ہو۔ اس کے آدمی نے دھکے دے کر....“

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نانی ستارہ ساکت نگاہوں سے روتی ہوئی نگینہ کو دیکھے گئیں۔

”کیا عجب تماشا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے زوال کی اس انتہائی پستی کو بھی دیکھنے کے لیے زندہ بیٹھی ہیں۔“ پانی کے چند قطرے آنکھوں پر نہیں‘ دل پر گرے تھے۔

ان کا ہاتھ تسلی دینے کے لیے نگینہ کی طرف بڑھا اور پھر ہارے ہوئے انداز میں واپس ہوا۔ انہوں نے اسے رونے دیا۔

شاما جب پانی لے کر آئی تب تک نگینہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر حواس مزید بحال ہوئے تھے۔ شاما محبت سے اس کے پیچھے کھڑی کندھے دبا رہی تھی۔

”شاما!“ نانی کسی گہری سوچ سے باہر آئی تھیں۔

”جی نانی!“ وہ نگینہ کے کندھے چھوڑ کر فرماں برداری سے ان کے قریب چلی آئی۔

”گھر میں چند فالتو لائٹس جل رہی ہیں۔ سب کو بند کر دے اور شام میں اس بڑے ہال میں بھی چراغاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی ایک چھوٹا کم پاور والا بلب جلا دیا کر اور رات میں وہ بھی بجھا دیا کر یاد سے‘ بے کار کا بل بنتا ہے۔“

”جی!“ وہ فرماں برداری سے کہتے ہوئے پلٹنے لگی تھی کہ انہیں کچھ اور یاد آیا۔

”اور وہ شام کا اخبار نہیں آیا کیا۔“

”شام کا اخبار!“ شاما نے گڑبڑا کر ان کی طرف دیکھا۔

”وہ تو آپ نے خود آج سے بند کروایا ہے۔“

”ارے ہاں‘ یاد ہی نہیں رہا۔ دماغ کا بھی کیا عالم ہو گیا ہے۔ ایسا کر پھر ذرا اگلناز سے لے آ.... اس کے ہاں بھی تو آتا ہے نا۔“

”جی!“ وہ فوراً“ ہی باہر نکل گئی۔

”اب کیا آنا ہے اخبار میں.... صندل کی کوٹھی کا تو سودا بھی ہو گیا۔“

”خیام کی گمشدگی کا اشتہار۔ پتا نہیں یوسف کمال نے کون سے اخبار میں دیا ہے.... یا پھر سب میں ہی دے دیا ہو۔ اسے کون سی کمی پڑ رہی ہے۔ بیٹے کے لیے تو پیسہ پانی کی طرح بہانے کے لیے تیار ہے۔“

ان نامساعد حالات میں بھی خیام کا ذکر لہجے ہی میں انوکھی سی مسرت اتار تا تھا۔

نگینہ نے تھکی تھکی سی سانس لی۔ فیروزہ اور اس کے خاندان کی خوش نصیبی آج بھی مسلّم تھی۔

شاما اخبار لے آئی تھی اور اس میں آج بھی خیام کا اشتہار نہیں چھپا تھا۔ نانی ستارہ نے جلدی جلدی سارا ہی دیکھ ڈالا تھا۔ نگینہ نے البتہ ایک نگاہ بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور فرصت کے اس چھوٹے سے وقفے میں فوری آمدنی کے چند ذرائع پر غور کیا۔ مگر اب سب کچھ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔

صندل کی فلمی پرواز اور خواص کے یہاں سے چلے جانے کے بعد نانی ستارہ کے چوبارے پر سکوت کا ایک لمبا وقفہ چھایا رہا تھا۔۔۔ بانی کو یہاں ہونے والی محفل پر اعتراض تھا اور صندل کو سوا اعتراض۔
تب ان دونوں کی ویلیو گھٹتی تھی اور اب اس چوبارے کی۔ لوگ یہاں کا راستہ بھول چکے تھے اور صندل آج بھی ذرا سا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔
نگینہ نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔
"گزارے جتنا پیسہ تو گیتی بھی بھجوا سکتی ہے۔" آخری آپشن، جس پر وہ غور نہیں کرنا چاہتی تھی۔
نانی خیام کی تصویر سے مایوس ہو کر بقیہ اخبار دیکھنے لگی تھیں۔ شاما کھانے کا پوچھنے کے لیے پھر سے کمرے میں آئی تھی۔
"ماش کی دال میں نے بنالی ہے۔ فریج میں گوشت ختم ہو گیا ہے۔ پیسے دیں تو میں نیچے جا کر لے آتی ہوں۔ ورنہ صندل منہ بنائے گی کھانے پر۔"
"بس کافی ہے۔۔۔ صندل بھی یہی کھالے گی اور منہ بناتی ہے تو اپنے پاس سے کچھ منگالے۔ ساری عمر ناز نخرے اٹھانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے ہم نے اس کے۔"
نگینہ بے زاری سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"محلے میں سے ہو کر آتی ہوں اماں۔۔۔ دیکھوں تو سہی کیا چل رہا ہے۔۔۔ ہم لوگ تو جیسے ساری دنیا سے کٹ گئے ہیں۔"
"ہوں۔" اپنے اندر کی بے چینی کو چھپاتے ہوئے انہوں نے محض سر ہلایا۔
نگینہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
نانی ستارہ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔
"سو کیا اب گھرانے کا چلن بھی بدلنے کو ہے؟"
ایک بڑا سا سوالیہ نشان درد بھرے انداز میں جواب طلب تھا۔
سیف میں پڑے فیروزہ کے زیورات کے خالی ڈبے۔ صندل کی بیچی گئی کوٹھی۔ محلہ، ماش کی دال سب ہی کچھ تیزی سے آپس میں گڈمڈ ہوا تھا۔



سالار نے فکر مندی سے گیتی کی طرف دیکھا۔
"ہوا کیا ہے، تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو گیتی! کچھ تو ہے، جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو اتنا۔"
اس کی نگاہ گیتی کے پانی سے بھیگے چہرے پر تھی۔
کتنی ہی دیر سے وہ واش روم میں تھی۔ ہاتھ، منہ، حتیٰ کہ لباس بھی بے تحاشا پانی بہالینے سے خاصا گیلا ہو چکا تھا۔ محض دو، تین دن میں یہ ایک بڑی تبدیلی اس کی شخصیت میں آئی تھی۔
ایک آدھ بار تو اسے اتنا پانی بہاتے دیکھ کر وہ یوں ہی نظر انداز کر گیا، مگر یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اوپر سے اس کی گم صم کیفیت۔
"بتاؤ شاباش، مجھ سے نہیں کہو گی تو کس سے کہو گی ہاں۔" اسے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے سالار کو در حقیقت دکھ ہوا تھا۔
بے تحاشا مصروفیت، اس مسئلے نپٹاتے ہوئے شاید وہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

گیتی نے اپنے کندھوں پر اس کے دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے ایک سکون بھری سانس لی۔
"کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ آپ یقین کریں اور میں کیوں چھپاؤں گی آپ سے کچھ۔"
نگاہ چرا کر وہ جو یقین دلانا چاہ رہی تھی۔ سالار کے لیے ایک فیصد بھی قابل قبول نہیں تھا۔
"تمہیں پتا ہے تم جھوٹ نہیں بول سکتیں گیتی! نہ چھوٹا، نہ بڑا، تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اس لیے ایسی کوشش بھی مت کیا کرو۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔
"میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں سالار! شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"کسی خوش خبری کی تمہید تو نہیں ہے۔"
"نہیں بھئی۔" وہ بری طرح جھینپی تھی۔ "آپ ایک بات کا پیچھا کیوں پکڑ لیتے ہیں۔ کہہ تو رہی ہوں کچھ نہیں ہے۔ یوں ہی وہم ہو رہا ہے آپ کو۔" وہ خود کو سالار کی گرفت سے چھڑا کر مڑ کر چہرہ اور ہاتھ خشک کرنے لگی۔ لیکن وہ بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے مت بتاؤ، میں خود ہی پتا کرلوں گا۔ لیکن مہربانی کر کے خود کو تکلیف مت دو۔ یہ میرے لیے بہت ناقابل برداشت ہے گیتی کہ میرے ہوتے ہوئے تم کسی بات کے لیے فکر مند ہو۔ ہاں میرے بعد جتنا دل چاہے۔۔۔"
"خدا کے لیے سالار۔۔۔" وہ تیزی سے اس کی طرف مڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں آتے آنسو سالار کو بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔
"اچھا یار! کچھ نہیں کہہ رہا میں۔" خود سے اسے لگاتے ہوئے وہ محبت سے تسلی دے گیا۔
گیتی نے بمشکل ہی خود کو کمپوز کیا۔
"میں اب چلتا ہوں۔ آفس میں بھی ایک ضروری میٹنگ رکھی ہے۔ معاذ سے بھی ملنا ہے اور وکیل صاحب کے ساتھ بھی اپائنٹمنٹ ہے۔ روزی کے کیس کے سلسلے میں۔"
"روزی کا کیس۔" گیتی کا سارا حوصلہ پھر سے ختم ہونے لگا۔ سالار اس کی طرف سے پشت کیے سائیڈ ٹیبل پر پڑے کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔
"سالار!"
"ہوں۔"
گیتی نے ایک بار پھر اپنا سارا حوصلہ جمع کیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بے کار کے مقدمے ختم ہی کردیں۔ راجو بھائی کی شادی بھی ہو چکی ہے اب تو۔۔۔ وہ خوش ہیں زری کے ساتھ۔۔۔ تو پھر کیا ضروری ہے۔"
"بے کار کے مقدمے۔۔۔" وہ بری طرح چونکا تھا۔ "زری کا خون ناحق کیا اس طرح بے رحمی سے نظر انداز کرنے کے قابل ہے گیتی! راجو کی زندگی کو تو آگے بڑھنا ہی تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ روزی کے ساتھ کی جانے والی درندگی قابل معافی ہو گئی اب؟ ہرگز بھی نہیں، یہ معاملہ اب انجام پر پہنچنے ہی والا ہے۔ ختم ہوئے سب ہتھکنڈے زرتاج اور نبیل کے۔" اس کے لہجے میں، الفاظ میں ذرا بھی رعایت نہیں تھی۔ وہ صرف بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔
"میں چلتا ہوں اور تم آرام کرو بس، چاہو تو زری کو بلا لینا، لیکن خود کمرے سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنے سارے کام نہ ہوتے تو میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ مگر مجبوری ہے۔"
اس کے گال محبت سے تھپتھپا کر وہ اپنی ضروری چیزیں اٹھا رہا تھا۔ گیتی کی بالکل بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کس طرح احساس دلائے کہ اس کیس کا ختم کیا جانا خود اس کی زندگی کے اس سب سے بڑے خوف کا خاتمہ

ٹھہرے گا۔ جس سے محض چند دن میں اس کے اعصاب بری طرح ٹوٹ چکے ہیں۔
"دروازہ بند کرلو اندر سے اور کچھ کھا ضرور لینا..... میں نیچے کہتا ہوا جاؤں گا۔ اوپر ہی آجائے گا تمہارے لیے۔"
دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔
"ایک منٹ!" سر پر دوپٹا ڈھک کر وہ زیر لب آیتہ الکرسی پڑھتے ہوئے اس کے قریب آئی۔
سالار محبت سے اسے دیکھے گیا۔
"اللہ کی امان میں!" حصار کر کے گیتی نے دھیرے سے کہا۔
"اور تمہیں بھی اسی اللہ کی امان میں چھوڑ کر جاتا ہوں۔ ورنہ زرتاج اور نبیل جیسے لوگوں کی گھر میں موجودگی مجھے تمہاری طرف سے ایک منٹ کے لیے بھی بے فکر نہیں ہونے دیتی ہے۔" گیتی نے اس کے چہرے کو دیکھا۔
وہ بہت سنجیدہ تھا اور فکر مند بھی۔ "بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر ان میں سے کوئی بھی یہاں نظر نہیں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ تب یہ گھر مکمل طور پر تمہارا ہی ہوگا۔"
ہلکے سے مسکرا کر اس نے بات مکمل کی۔
"اللہ حافظ!" گیتی سے رخصت ہو کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ اوپر شیشے کی بڑی سی دیوار کے اس پار نیچے لان، پورچ اور مرکزی گیٹ نظر آتا تھا۔ جب تک وہ اپنی گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نہیں نکلا، گیتی اسے وہیں کھڑی دیکھے گئی۔
نیچے سیڑھیوں پر آہٹ سی ہو رہی تھی۔
اس نے چونک کر فوری طور پر کمرا بند کیا۔
قدموں کی نزدیک آتی چاپ ٹھیک اس کے کمرے پر ہی آکر رکی تھی۔
گیتی کا دل بری طرح دھڑکنا شروع ہوا تھا۔
پچھلے چند دنوں میں ایک لمحے کے بھی سامنے میں، وہ اسے متنبہ کرنا نہیں بھولا تھا۔ ایک خاموش نگاہ کی دہشت، بہت سارے دھمکی آمیز الفاظ سے کہیں زیادہ تھی۔ گزشتہ کل سے وہ مکمل طور پر اپنے کمرے میں بند تھی۔ چوہے بلی کے اس کھیل میں بڑا گہرا سہم طاری تھا۔
دروازے پر ہلکے ہلکے دستک ہو رہی تھی۔
خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کو دیکھتی ہوئی وہ بیڈ پر جا بیٹھی تھی۔ گود میں رکھے تکیے میں منہ چھپائے، وہ اپنے دل کی دھڑکن کو سن رہی تھی۔
"کیا اسے فون کر کے سالار کو واپس بلا لینا چاہیے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔" اس کا ہاتھ بے ساختہ فون کی طرف بڑھا۔ "مگر نہیں..... کیا کہے گی وہ اس سے؟"
نبیل کے کہے غلاظت بھرے الفاظ، نگاہیں اور اس مکروہ ہاتھ کا لمس۔
پورا وجود جیسے گندگی سے چھینٹوں چھینٹ۔ اس نے ہاتھ سے رگڑ رگڑ کر ان دیکھی غلاظت کو خود پر سے اتارنا چاہا، مگر ناکام۔
دروازے پر ہونے والی دستک اس بار بلند تھی۔
"باجی! کمرے کی صفائی کرنی ہے۔" باہر سے ملازمہ کی آواز اندر آئی۔
گیتی نے ایک گہری سانس لی۔ "آج صفائی نہیں کروانی مجھے تم جاؤ۔"
قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔
شاہی محلے کی بار بار بکنے والی چیز، نگینہ جان جیسی تھرڈ کلاس ڈانسر کی بیٹی.....

وہ پھر واش روم میں آئی تھی۔ خود پر بہت سارا پانی ڈالنے لیے۔

☆ ☆ ☆

اسلام صاحب نے فکر مندی سے معاذ کے کمرے کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ آج بھی آفس نہیں جا رہا ہے؟"

"ہاں کہہ رہا تھا کہ چند دن کی چھٹی لی ہوئی ہے۔ کچھ ضروری کام ہیں۔"

"اور وہ کام کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہو رہا ہے۔ کہیں نکل کر جاتا تو وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میرے پاس بھی وہ کھڑے کھڑے ایک آدھ بار ہی آیا ہے۔"

انہیں شائستہ کے لہجے کا اطمینان برا لگا تھا۔

"کچھ تو عقل سے کام لو شائستہ! ماں ہو تم اس کی۔ بغیر کہے جاننا چاہیے تمہیں اس کو۔ جا کر بیٹھو اس کے پاس، بات کرو اس سے۔ آخر وہ خود کو کیوں تنہائی کی نذر کیے دے رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ مجھے معاذ سے محبت نہیں؟ جان بوجھ کر لاپروائی برت رہی ہوں اس سے؟"

"پھر وہی لاحاصل بحث۔" بے زاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کوریڈور سے مڑنے لگے تھے۔ جب ہی وہ ان کے پیچھے آئیں۔

"آخر آپ کیا جتانا چاہتے ہیں مجھے؟ معاذ کی حالت کی ذمہ دار میں ہوں، کیونکہ میں نے اس کی شادی جویا سے نہیں ہونے دی۔ مجبور کر دیا معاذ کو کہ وہ اس کا نام نہ لے؟"

کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ٹھیک دادی کے کمرے کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔

"ہاں یہی ہے۔" اسلام صاحب نے پورے یقین کے ساتھ ان کی بات کی تصدیق کی۔

شائستہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ رشتے سے انکار میری طرف سے نہیں۔ ان کی طرف سے ہوا تھا اور وہ بھی انتہائی ذلت کے ساتھ۔ کیا آپ کو ربیعہ کا ٹھکرایا جانا بھی یاد نہیں رہا اور وہ سب باتیں جو شاکرہ اور اظہار نے سارے خاندان میں بیٹھ کر ہمارے گھرانے اور خاص طور پر معاذ کے لیے کی تھیں۔ ہماری سفید پوشی کو بار بار ذلیل کیا۔ ایک وقت تھا کہ شاکرہ میرا نام لینا گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ زن کے نام سے یاد کرتی تھی۔" ان کی آواز قدرے اونچی ہو گئی۔

سامنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی دادی اور ربیعہ دونوں ہی نے دکھ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"اور یہ معاذ جس پر آپ اور اماں نے ہمیشہ بہت فخر کیا۔ ان لوگوں کے نزدیک اول درجے کا بد کردار اور ناکارہ لڑکا تھا۔ جو ان کی بیٹی پر اس لیے ڈورے ڈال رہا تھا تاکہ ان کے گھر سے بہت سارا جہیز حاصل کر سکے۔ وہ ہم جیسے فقیروں کے گھر سے نہ لڑکی لیں گے، نہ لڑکی دیں گے۔ یہ بات کئی بار دہرائی گئی۔"

وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھیں۔ ربیعہ جلدی سے پانی لینے چلی گئی۔

اور کہیں تو وہ پوری طرح حق بجانب بھی تھیں۔ اسلام صاحب نے نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جانے دو، پرانی باتوں کا کیا ذکر، جتنا ان باتوں کو یاد کرو گی اتنی ہی تکلیف ہوتی رہے گی۔ معاف کر دو یا پھر بھول تو جاؤ کم از کم۔"

"میں نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہوں گی۔"

ربیعہ کے لائے ہوئے پانی کے گلاس نے انہیں پرسکون کیا تھا۔

"اور میں نے اپنے بیٹے کو محض ساری عمر کی ذلت سے بچایا ہے۔ اگر جویا کو لے آتی تو ساری زندگی کا عذاب

معاذ کے سر پر مسلط ہو جاتا۔"

ان کے لہجے میں وہی ٹھونک بجا لاتی کیفیت تھی جو جویا کے بارے میں آخری فیصلے کی آخری دلیل بنتی تھی۔

اسلام صاحب نے افسردگی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں شائستہ! مگر کاش تم اپنا دل تھوڑا سا بڑا کر لیتیں تو شاید بہت ساری بہتری ممکن ہوتی۔"

"امی!" پیچھے سے آئی معاذ کی آواز پر ان دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا، وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔

پتا نہیں اس نے یہاں کھڑے ہو کر کی جانے والی ساری... دل دکھانے والی باتیں سنی بھی یا نہیں۔

"میں ذرا جا رہا ہوں۔ واپسی دیر میں ہو گی۔ آپ کو تو کوئی کام نہیں ہے ابا!"

وہ ان کی طرف مڑا۔

اس کی براؤن مہربان آنکھوں میں بڑی گہری اداسی تھی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں!" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"کچھ نہیں بیٹا!" وہ بمشکل ہی خود پر قابو پا سکے۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"سالار سے ملنا ہے۔ ان کے کل دو فون بھی آئے مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"کوئی خاص کام!"

"سب ہی کام خاص ہیں ابا!" وہ ایک بار پھر مسکرایا، شاید ان سب کو مطمئن کرنے کے لیے۔ "کل سالار کے کیس کے دلائل ختم ہو رہے ہیں پرسوں اسکول کا افتتاح اور اس کے دو دن بعد....." ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ "ربیعہ کے سسرال والوں کی آمد۔"

وہ اس کے لیے اتنی پریشان تھی کہ سسرال کے ذکر پر بھی شرما بھی نہ سکی۔

"خدا کرے کہ سب کچھ خیریت سے ہو جائے۔"

"ان شاء اللہ ہو جائے گا، دعا کرتے رہیں۔" ایک دھیمی سی مسکراہٹ اب مستقل ہی اس کے چہرے پر تھی۔

"میں ذرا دادی سے مل لوں۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دادی کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ تینوں وہیں ایک بوجھل سی خاموشی میں گھرے کھڑے رہے۔

"ربیعہ! بھائی کے لیے ناشتہ بنا لاؤ جا کر جلدی سے۔" شائستہ امی ہی تھیں جو ماحول کو نارمل رکھنے کی کوشش بہرحال کرتی رہتی تھیں۔

"پہلے اس سے پوچھ تو لو کہ وہ کچھ کھائے گا بھی یا نہیں۔" اسلام صاحب کہتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے۔ دل پر پڑا بوجھ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ایک بند گلی جس میں آگے کو راہ نہیں اور مڑنے کی چاہ نہیں!

ان کے خیال کے عین مطابق معاذ ناشتے کی معذورت کر کے باہر آ چکا تھا۔

"آج اگر فرصت ہو تو شام میں آپ بھی چکر لگا لیجیے گا۔ نئے اسکول کا۔ خیام بے چارے نے بڑی محنت کی ہے لڑکوں کے ساتھ مل کر۔ بہت ہی ٹیلنٹڈ ہے ماشاء اللہ۔"

"وہ حیرت انگیز ہے۔ مگر پراسرار بھی۔ کچھ ہے جو اسے ایک فاصلہ بنائے رکھنے پر مجبور رکھتا ہے۔ میں فکر مند ہوں اس کے لیے بھی۔"

ان کا "بھی" معنی خیز تھا۔

معاذ نگاہ چرا کر سیڑھیاں اترا تھا۔

"شام تک میں بھی ان شاء اللہ فارغ ہو جاؤں گا تو آپ کو خود لے چلوں گا۔"

اس کے موبائل کی بیل بج رہی تھی۔

اسکرین پر آیا نام فوراً ہی ایک ضروری کام یاد دلا رہا تھا جیسے وہ یکسر بھلائے ہوئے تھا۔

"سو ثابت ہوا کہ اس بار غم کی شدت کچھ اور سوا تھی!" وہ یوسف کمال سے زیادہ خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوا۔

"بہت معذرت چاہتا ہوں کمال صاحب' آپ کے ایک چھوٹے سے کام کو کرنے میں بھی میری طرف سے تاخیر ہوئی' آج میں ان شاء اللہ کرتا ہوں' ویری سوری اگین۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! اور یہ کام تو ایک مدت سے ٹلا ہوا ہے۔ صرف میری اپنی کوتاہی کی وجہ سے۔ تم نے تو صرف دو تین دن ہی کی تاخیر کی۔ کیا پتا اللہ کی اس میں بھی مصلحت ہو۔" دوسری طرف سے وہ بہت صبر سے کہہ رہے تھے۔

معاذ نے فون آف کیا۔

ابا اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

مختصراً "یہ چھوٹا سا کام گوش گزار کر کے اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور خدا حافظ کہتا ہوا گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔

سالار کے پاس جانے سے پہلے اس کا رخ پرانے اسکول کی طرف تھا۔ خیام سے یوسف کمال کا بھیجا ہوا لفافہ لینا تھا پھر اخبار کے آفس اور پھر سالار کے پاس۔

بائیک کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے پروگرام کی ترتیب کو بدلا۔

خیام اپنے پرانے اسکول کے گیٹ کو تالا لگا رہا تھا جب اس نے معاذ کو آتے دیکھا۔

"معاذ بھائی! اس وقت؟"

یہ بڑا بے وقت ٹرپ تھا' عموماً وہ سہ پہر یا شام تک ہی یہاں آتا تھا۔

تالا واپس نکال کر وہ وہیں کھڑا رہا۔

"خیریت معاذ بھائی! طبیعت کیسی ہے اب؟"

پچھلے تین دنوں میں اس کی مکمل بے عملی کی خبر اسے بھی تھی۔

"ٹھیک ہوں میں خیام! وہ کمال صاحب کا لفافہ ہے نا تمہارے پاس!" وہ جلدی میں تھا۔

"میں نے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ ٹھہریے' دیتا ہوں میں آپ کو!" وہ معاذ کے ساتھ ہی اندر آیا۔

سامان سے خالی کمرے برآمدے اب سونے پن کا احساس دلا رہے تھے جتنی دیر میں خیام نے اپنا بیگ کھول کر وہ لفافہ نکالا' معاذ نے سالار کو تھوڑی دیر تک آنے کا میسج کیا تھا۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا ورنہ آپ کو وہیں گھر پر پہنچا دیتا۔" وہ اسے لفافہ تھماتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ معاذ ہلکے سے مسکرا دیا۔

"آپ کی طبیعت پوچھنے بھی نہیں آسکا۔ ابا کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ یاد کر رہے تھے تمہیں۔" معاذ نے لفافے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اسکول کی اوپننگ ہو جائے پھر اطمینان سے کسی دن ان کے پاس آؤں گا۔ مجھے ان سے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے۔"

"کوئی خاص بات۔" معاذ لفافہ کھولتے کھولتے ذرا رکا۔

"شاید۔۔۔ یا پتا نہیں۔" وہ تھوڑا سا کنفیوژ تھا۔ "چائے پئیں گے؟" اس نے دانستہ بات بدلی۔

"چائے کا سامان ہے یہاں ابھی؟"

"بس آج جانے والا ہے' آج رات میں بھی وہیں چلا جاؤں گا۔ بہت اچھی سیٹنگ ہوئی ہے ساری۔۔۔ آپ

دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔"

وہ کچن میں چائے کا پانی رکھتے ہوئے بڑی خوشی سے بتا رہا تھا۔

معاذ کے چہرے پر پھر سے مسکراہٹ آئی۔

"میں تو بغیر دیکھے ہی بتا سکتا ہوں کہ تم نے زبردست کام۔۔۔"

الفاظ بیچ میں ہی دفعتاً "گم ہوئے تھے۔ یوں ہی سرسری سے انداز میں کھولے گئے لفافے میں سے جھانکتی خیام کی تصویر!

اس نے بے اختیار ہی آنکھیں جھپکائیں۔

"شاید وہ غلطی سے کوئی غلط لفافہ دے گیا ہے۔" معاذ خیام کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ تصویر کے ساتھ لگائی گئی تفصیلات پر نگاہ جمی۔

خیام ولد یوسف کمال

رنگ گورا

بالوں کا رنگ۔ سنہری مائل براؤن

آنکھوں کا رنگ۔۔۔

مدت سے لاپتہ ہے۔۔۔

جن صاحب کو اس کے بارے میں پتا ہو مہربانی فرما کر۔۔۔"

ایک بڑے انعام کا لالچ بھی ساتھ بندھا تھا۔

وہ شاید زندگی میں کبھی بھی اتنا حیران نہیں ہوا تھا۔

خیام سامنے کچن میں نظر آرہا تھا۔

معاذ کی نگاہ بار بار ہاتھ میں تھامی تصویر اور کچن میں کھڑے خیام پر جمی۔

شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"یہ وہی تھا! جس کی اولین شرط یہ تھی کہ کوئی اس کے بھید کو جاننے کی کوشش نہ کرے۔

یوسف کمال کا بیٹا!

"کیسی ناقابل یقین بات!" اسے بے ساختہ وہ شام یاد آئی جب ساجد پہلی بار اسے لے کر یہاں آیا تھا۔

ایک ایسا لڑکا جس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر اپنی ساری خستہ حالی کے باوجود اس کا بے نیازی بھرا انداز ٹھٹکنے پر مجبور کرتا تھا۔

مگر یہ تصویر کسی اچھے دنوں کی تھی' چند سال پرانی ضرور تھی مگر خیام کا لباس اور انداز دونوں ہی سے اس کی خوشحالی کا اظہار ہو رہا تھا۔

سو اگر وہ کمال صاحب کے پاس نہیں تھا تو پھر۔۔۔؟

معاذ کا ذہن اس معمے کو سلجھانے میں ناکام ہوا جا رہا تھا۔ یوسف کمال کو وہ بہت زیادہ نہیں جانتا تھا اور جانتا تو وہ خیام کو بھی نہیں ہے! یہ بھی سچ ہے۔

"اسکول کا کمپاؤنڈ بڑا ہے' بہت آرام سے افتتاحی تقریب ہو جائے گی۔" بھاپ اڑاتے چائے کے کپ ہاتھ میں لیے وہ کچن سے نکلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہ تصویر والا لفافہ اپنی جیب میں منتقل کیا۔ وہ اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رکنا چاہ رہا تھا۔ مگر خیام کی بنائی ہوئی چائے کو رد کرنا بھی اچھا نہیں لگا۔

"بہت گرم ہے معاذ بھائی!"
وہ اسے جلدی جلدی گھونٹ بھرتے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔
"کوئی بات نہیں، مجھے ذرا جلدی ہے خیام!"
"آج کل آپ نے گاڑی چلانا بالکل ہی چھوڑ دی ہے۔ ہر وقت بائیک پر ہی ہوتے ہیں!"
"گاڑی!" اس نے چونک کر خیام کی طرف دیکھا وہ پہلے بھی چند بار سخت گرمی میں اسے بائیک پر آتا دیکھ کر یہ سوال پوچھ چکا تھا۔
"بس ایسے ہی!" وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔
ان دھوپ بھری لمبی لمبی گلیوں کی تمازت، جنہیں جویا کب سے سہ رہی تھی خود اسے بھی بہت سی آسانیوں سے الگ رہنے پر مجبور کرتی تھی۔
"چلتا ہوں!" معاذ اٹھ کر کھڑا ہوا۔
"وہ لفافہ!" خیام نے نگاہ دوڑائی۔
"میں نے رکھ لیا ہے۔"
"تھا کیا اس میں معاذ بھائی! بہت تاکید کی تھی ان کے ڈرائیور نے۔" معاذ کے ساتھ گیٹ کی طرف آتے ہوئے اس نے پہلی بار اس لفافے میں تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔
معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کچھ نہیں ایسے ہی چند کاغذات تھے پراپرٹی وغیرہ کے تھوڑا سا کام ہے کمال صاحب کا۔ تمہیں بھی میری وجہ سے دیر ہوئی بے کار میں۔"
وہ اس موضوع پر ایک لفظ بھی خیام کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مگر خیام...
"بہت پیسے والے آدمی ہیں... گاڑی سے ہی لگ رہا تھا کیا کرتے ہوں گے یہ لوگ اتنا سارا پیسہ جمع کر کے معاذ بھائی... ظاہر ہے کوئی مسئلہ کوئی پریشانی تو رہتی نہیں ہوگی جس کا حل تلاش کرنا ہو۔"
بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے معاذ نے بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "پیسہ ہمیشہ ہی آسانیوں کی دلیل نہیں بنتا ہے خیام اور نہ ہی ہر پیسے والا شخص خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"
"جی!" اس نے ہلکے سے سر ہلایا "اور نہ ہی گھر میں آیا ہر پیسہ ہی قابل رشک ہوتا ہے!"
"گڈ!" معاذ نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"اس ویک اینڈ تک یہ ساری مصروفیات نمٹا کر آرام سے ابا کے ساتھ بیٹھیں گے۔ بہت دن ہو گئے ہیں کوئی بھی گپ شپ کیے ہوئے۔"
خیام بے ساختہ ہی مسکرا دیا۔
"اسکول کے افتتاح کے بعد بھی کوئی بڑی مصروفیت ہے کیا خیام بھائی!"
وہ بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔
"ربیعہ کے سسرال والے آ رہے ہیں۔ شاید ڈیٹ بھی فکس ہو جائے شادی کی۔ اگلا مہینہ ہی ہوگا زیادہ سے زیادہ..."
وہ اطلاع دے کر رخصت ہوا تھا مگر اسے یقین کرنے میں وقت کا سامنا تھا۔
"ربیعہ!"
اس کے سامنے وہ مسکراتا ہوا سادہ سا چہرہ دن میں چند بار تو آتا ہی تھا۔ گیتی کے بعد زندگی میں آنے والی دوسری

لڑکی... ربیعہ!
محسنوں کی بیٹی جس کے بارے میں وہ سوچتے ہوئے بھی خود سے شرماتا تھا۔ مگر پھر بھی...
وہ چند لمحے یوں ہی گم صم سا کھڑا رہا۔
تنہائی کا دم گھونٹتا احساس اور بھی گہرا ہوا۔
ایک چھوٹی سی خوش گمانی جو کبھی بڑی نرمی سے دل کو چھو جاتی تھی خاموشی سے اپنے انجام تک پہنچی۔
ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا۔
"ٹوٹنے جڑنے کے اس عمل میں اب اسے کم وقت کا سامنا شاید اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنی اوقات بھولنے کی غلطی نہیں کرتا۔" نچلے لب کو سختی سے دانتوں تلے دباتے ہوئے خیام نے خود کو مورل سپورٹ دینا چاہی۔
"اور دیکھا جائے تو اس میں تھا بھی کیا۔ محض ایک یک طرفہ احساس، جو کسی کہانی کا آغاز بھی نہ بن سکا تھا۔"
وہ اندر سے تالا چابی لینے کے لیے واپس مڑ گیا۔



دور ایک پرہجوم سڑک پر معاذ کی بائیک نے راستہ بدلا تھا۔
یوسف کمال نے حیرت سے سامنے بیٹھے معاذ کی طرف دیکھا۔
"کیا کہا! اشتہار نہیں دے رہے ہو؟"
انہوں نے مایوسی سے میز پر رکھے لفافے کو دیکھا جو وہ واپس کر چکا تھا۔ "مگر یہ بہت ضروری ہے معاذ! میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ، سب سے بڑا مسئلہ خیام کی تلاش میں ہے۔ اگر وہ نہیں ملا تو یقین کرو..."
"وہ میرے پاس ہے کمال صاحب! خیام میرے ساتھ ہی رہتا ہے اس کے لیے کسی اشتہار کی ضرورت نہیں ہے۔"
ان کے چہرے پر نگاہ جمائے معاذ نے دھیمی آواز میں کہا۔ یوسف کمال کے لب ہلکے سے کھلے، وہ بالکل دم بخود ہوئے معاذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔
معاذ ان کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔
"میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ..."
"تم... تم مجھے ابھی اس کے پاس لے چلو معاذ! میں تمہارا احسان مند رہوں گا ہمیشہ میرے بیٹے... میں ترس رہا ہوں اس کے لیے برسوں سے مگر وہ مجھے جانتا تک نہیں ہے۔"
معاذ نے ان کی آنکھوں میں آتے آنسو دیکھ کر تکلیف محسوس کی تھی۔
"اتنی جلدی مت کریں، ورنہ وہ پھر کھو جائے گا۔ سمجھنے کی کوشش کریں میری بات..."
یوسف کمال کے چہرے پر خوف کا تاثر ابھرا تھا۔
"شکر ہے، جو اس نے یہ لفافہ کھول کر نہیں دیکھا۔ ورنہ وہ ایک منٹ نہ لگاتا وہاں سے چلے جانے میں... میں اور آپ شاید پھر کبھی نہیں جان سکتے اس کے بارے میں۔"
یوسف کمال نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔
"اگر آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو پلیز... مجھے خیام کے بارے میں بتائیے۔ یہ بہت ضروری ہے کمال صاحب!"
وہ بہت نرمی سے ان سے مخاطب تھا۔



آج صبح سے ہی بارش وقفے وقفے سے کئی بار برس چکی تھی۔ اور اب بھی آسمان پر سے گہرا سرمئی غبار جھلکا پڑ رہا تھا۔

زری گیتی کے پاس آئی بیٹھی تھی۔

کل معاذ کے اسکول کے افتتاح کے موقع پر وہ بھی مدعو تھی سو لباس کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔

"اصل میں وہاں ہمارے پرانے محلے کے بہت سے لوگ ملیں گے۔۔۔ کافی بچے آتے تھے وہاں سے معاذ کے ہاں پڑھنے کے لیے۔ اب وہ سب شادی کے بعد مجھے دیکھیں گے تو اچھا سا تیار ہو کر تو جانا چاہیے نا۔"

"بالکل۔" گیتی محض اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرائی۔ ورنہ تو سامنے اس زرق برق ڈھیر میں اسے فی الوقت ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔

"یہ پنک، یہ گرین اور یہ میرون۔ مجھے تو تینوں ہی پسند ہیں۔ فیصلہ نہیں ہو رہا ہے۔" زری ایک کے بعد ایک جوڑے کو ہاتھ میں اٹھا کر بہت اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔

"ایسا کرو، جو راجو بھائی کو پسند ہو وہ پہن لو۔" گیتی کی سمجھ میں یہی حل آیا۔

"پوچھا تھا مگر انہیں تو میں ہر رنگ میں اچھی لگتی ہوں۔ کہنے لگے جو دل چاہے پہن لو۔ یا پھر گیتی بھابھی سے پوچھ لو۔ اس لیے تو آپ کا مشورہ چاہیے۔" زری ـــــــ کی گاڑی وہیں اٹکی۔ گیتی مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے پھر یہ پنک پہن لو نئی دلہن ہو، تمہارے محلے والوں کو بھی اچھا لگے گا۔"

"میرا بھی یہی پہننے کو دل چاہ رہا تھا!" زری کپڑے سمیٹتے ہوئے ہنس پڑی۔

گیتی کو اسے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھنا بڑا اچھا لگتا تھا۔

راجو کے ساتھ اس کی خوشیوں بھری ازدواجی زندگی کا ثبوت یہی مسکراہٹ تھی۔

"اگلے جمعہ کی سیٹیں بک کروائی ہیں پنجاب جانے کے لیے۔ وہاں راجو کے گھر والے بہت بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔" زری کے چہرے پر، لہجے میں فخر و اعتماد آتا جا رہا تھا۔

"کچھ اور شاپنگ وغیرہ کرنی ہو، وہاں جانے سے پہلے تو کر لینا، راجو بھائی کے ساتھ جا کر۔"

"ارے توبہ کریں۔" وہ پھر ہنس پڑی۔ "اتنے کپڑے ہیں میرے پاس کہ ابھی سال دو سال ضرورت نہیں ہے۔ اور راجو کے خاندان کے لیے معاذ اور سالار بھائی دونوں ہی نے سارے کپڑے بنا دیے ہیں اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں ان کے لیے۔" وہ تفصیل بتانے لگی۔

گیتی نے اپنے اندر کے اضطراب پر قابو رکھتے ہوئے پوری دلچسپی لینی چاہی۔ مگر ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

"آج راجو بھائی گئے ہیں سالار کو لے کر۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بے چینی کو سہارا دینا چاہا۔

زری کے چہرے پر آئی مسکراہٹ بھی دھیمی پڑی تھی۔

"جی وہیں گئے ہیں۔ آج روزی کے کیس کی شاید آخری سماعت ہے۔۔۔ اگلی بار فیصلہ سنا دیا جائے گا شاید۔"

"ہاں، یہی بات ہے۔ کافی دیر ہو چکی ہے اب یہ آتے ہوں گے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے بھی چلنا چاہیے۔ میں نبیل سے سامنا نہیں چاہتی۔" زری اپنے کپڑے سمیٹ کر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہ نہیں کہ میں اس جیسے آدمی سے ڈرتی ہوں بلکہ اس لیے کہ میں ابھی اپنی خوشیوں پر اس کی چھاپ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی ہوں۔"

گیتی آرا کو اس پر ایک دم ہی بہت رشک آیا۔

کاش وہ بھی سالار کے لیے ایسا ہی ڈھنگ انداز رکھ سکتی تو اس طرح سارا دن چھپ کر قیدیوں کی طرح زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔

"آپ بھی باہر نکل کر بیٹھیں۔ آج تو موسم بھی بہت اچھا ہے اور گھر بھی خالی پڑا ہے۔" زری کے اصرار پر اسے باہر آنا ہی پڑا۔

موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا تھا۔ لاؤنج کی کھلی کھڑکیوں بہت سے پانی کے قطرے چمک رہے تھے اور گیلی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آزادی سے اندر آ رہے تھے۔

"جب میں آ رہی تھی تو زرتاج بیگم کی گاڑی بھی گھر سے باہر جا رہی تھی۔ اور یہ تو آپ کا گھر ہے آپ کیوں کمرے میں ہی بند رہتی ہیں۔ ان لوگوں کو سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ راجو کہہ رہے تھے کہ سالار بھائی چاہیں تو ایک منٹ میں انہیں نکال کر باہر کر سکتے ہیں۔"

دل پر رکھا بوجھ اس یقین دہانی سے بھی کم نہیں ہونے والا تھا۔

"میں چلتی ہوں، سارے کپڑے باہر نکلے پڑے ہیں۔ یہ آ گئے تو اور غصہ کریں گے۔"

وہ بڑے فطری سے انداز میں فکر کرتی ہوئی لاؤنج سے انیکسی کی طرف چلی گئی۔

گیتی بڑی کھڑکی کے پاس پڑے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ کر یوں ہی ہرے ہوتے سبزے کو دیکھے گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے نمی سے بھرے جھونکے اس کے چہرے کو چھو رہے تھے اور کھڑکی پر باہر سے چڑھی نیلے پھولوں کی بیل میں سے بہت سارے پھول گر کر کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑے تھے۔

کھڑکی کے دوسری طرف سے اندر کاؤچ پر بیٹھی گیتی بالکل ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے کسی خوبصورت فریم میں بند کوئی حسین پورٹریٹ۔

لان کے ساتھ بڑا سا پورچ آج خالی پڑا تھا۔ گیتی نے کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ سر کو ٹکاتے ہوئے خود کو آج قدرے آزاد محسوس کیا۔

"اللہ کرے جو آج ہی جج صاحب، نبیل جیسے خطرناک آدمی کو جیل میں ڈال دیں تو کتنا اچھا ہو۔" اس نے بہت دل سے دعا کی تھی۔

کچھ دن سے نانی، نگینہ امی، صندل، شاما سب ہی بہت زیادہ یاد آ رہی تھیں۔ نبیل کی بخشی ہوئی گھٹن سے بچ کر یہی راہ فرار سمجھ میں آتی تھی مگر وہاں کوئی بھی اسے بلانے میں انٹرسٹڈ نہیں تھا۔

"گرمی بہت زیادہ ہے۔ موسم بہتر ہو گا تو ہم خود آنے کا کہیں گے۔"

صاف صاف ٹالا جا رہا تھا جیسے لاہور کی گرمی اس کے لیے کوئی انوکھی اور نئی شے تھی، وہ ان سب سے کچھ کچھ خفا رہنے لگی تھی۔۔۔ سو آج کل فون کالز میں تھوڑی سی کمی تھی۔

دور بند گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ سالار کو اسی راستے سے آنا تھا اور یہاں بیٹھ کر وہ بڑے شوق سے اس کا انتظار کر سکتی تھی۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے گیٹ پر نگاہ جمائی، ٹھنڈک کا سکون بھرا احساس۔۔۔ ہوا کے جھونکے اور بے حد تھکا ہوا ذہن اور شل ہوتے اعصاب۔

غیر محسوس انداز میں گیتی کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ وقت کا کچھ دورانیہ خاموشی سے گزرا۔

گہری نیند میں اس نے اپنے ماتھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا۔

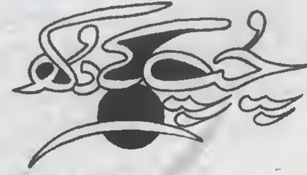
گیتی کی آنکھیں ہلکے سے کھلی تھیں۔

اس کے ماتھے پر سے بالوں کی لٹ پیچھے کرتا ہوا نبیل بے حد قریب کھڑا تھا۔

گیتی کی آنکھیں خوف زدہ انداز میں پھیلیں۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرح طاہر قریشی



کیمسٹری کی کلاس لینے کے بعد کلاس سے باہر آکراس نے سکون بھری لمبی سانس خارج کی اور کلاس کے سامنے موجود کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے گراؤنڈ پر طائرانہ نظرڈالی۔ اس وقت گراؤنڈ میں رش زیادہ تھا۔ اگلا پیریڈ فری تھا۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئی۔ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرتے وقت اس کی نظراپنی دوستوں پر پڑی‘ جو گراؤنڈ کے ایک کونے میں پیپل کے درخت کے سائے میں براجمان تھیں۔ وہ خوش گوار حیرت کے ساتھ ان کی طرف چلی آئی۔

"ایں! تم لوگ آج آئی ہوئی ہو تو کلاس میں کیوں نہیں آئیں۔ پہلے تینوں پیریڈ کیوں چھوڑے تم لوگوں نے؟" اپنی کتابیں اور بیگ ان کے قریب رکھتے ہوئے وہ خود بھی وہیں ان کے پاس نیچے بیٹھ گئی اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہم دونوں آج لیٹ ہوگئی تھیں۔ مسز ثمینہ خالد کو جانتی ہو لیٹ آنے پر کس قدر بے عزت کرتی ہیں۔ ادھر آئے تو یہ آنسہ نظر آگئی۔ دو دن کی چھٹی پر گئی تھی اور آج پورے ہفتے بعد آئی ہے اپنی منگنی کرواکر۔" آفرین نے آنسہ کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے اپنی کلاس نہ لینے کی وجہ پوری تفصیل سے بتائی۔ وہ تینوں اس کی بات کے اختتام پر ہنس پڑیں۔

"اچھا اب باتیں بند کرو اور یہ تصویریں دیکھو اور خوب تعریفیں کرو۔" آنسہ نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سے خوب صورت سا سرخ مخمل کا البم نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

پہلی ہی تصویر آنسہ کی تھی۔ گہرے سرخ رنگ کے خوب صورت سے لہنگے میں دلہن بنی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"واؤ! تم تو بہت پیاری لگ رہی ہو آنسہ!" عکس نے تصویر دیکھ کر سراہا تھا۔

"ہاں واقعی! شادی کی دلہن لگ رہی ہو مکمل۔" ثمرین اور آفرین نے بھی تعریف کی تھی۔

"اچھا آگے تو دیکھو اور تصویریں‘ میں اپنے ان کی بھی دکھاتی ہوں۔" آنسہ نے اگلی تصویر پلٹی‘ جو اس کے منگیتر کی تھی۔

"یہ دیکھو یہ ہے طارق..." تھوڑی سی شرم کی لالی اس کے گالوں پہ اتر آئی تھی۔ وہ تینوں اشتیاق بھری نظروں سے تصویر دیکھنے لگیں۔

"ماشاءاللہ دونوں کی جوڑی واقعی شان دار ہے۔" آفرین نے تعریف کی۔

"سچ...؟" آنسہ نے خوشی سے بھری آواز میں پوچھا۔

"ہاں واقعی جوڑی پیاری ہے تم دونوں کی۔" ثمرین نے بھی تائید کی تھی۔

"تھینکس...!" آنسہ اپنی تعریف سن کر اور جوش سے اگلی تصویریں دکھانے لگی۔ ثمرین اور آفرین آپس میں کزنز تھیں مگر آنسہ اور عکس سے ان کی دوستی ابھی تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اسی بنا پر وہ ایک دوسرے کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھیں اور اسی وجہ سے وہ آنسہ کی منگنی پر نہ جاپائی تھیں۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد ثمرین نے البم بند کیا اور آنسہ کی طرف بڑھادیا۔

"تمہارے گروپ میں ہم تین تو کنارے لگیں اب عکس رہ گئی ہے۔ اس کی قسمت دیکھو کب کھلتی ہے۔"

ثمرین شادی شدہ تھی۔ اس کی شادی آفرین کے بھائی کے ساتھ ہوئی تھی جبکہ آفرین کا نکاح ثمرین کے بھائی کے ساتھ ہوا تھا اور رخصتی پڑھائی کے بعد طے پائی تھی اور اب آنسہ کی بھی منگنی ہوگئی تھی۔ رہ گئی تھی تو بس، عکس...

"ہاں عکس! تم بتاؤ تمہاری کب ہے؟ تمہارے گھر والوں کا کیا ارادہ ہے؟" آنسہ نے بھی عکس کے معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یار! مجھے نہیں پتا۔ تم کیا فضول سوال لے کر بیٹھ گئی ہو۔" عکس نے ایک دم چڑچڑے انداز میں انہیں ٹالا۔

"ہائے! تمہیں یہ سب باتیں فضول لگتی ہیں؟" آفرین کو اس کی بات سن کر صدمہ پہنچا۔

"ہاں....." عکس نے مختصر جواب دیا۔

"تمہاری ابھی ہوئی نہیں ہے نا' اس لیے تمہیں فضول لگتا ہے' ورنہ ایسا نہیں ہے۔" آنسہ نے فوراً تردید کی تھی۔

"کوئی ہونے دے گا' جب ہی تو ہوگی نا۔" عکس بے دھیانی میں کہہ گئی۔ مگر احساس ہونے پر فوراً زبان دانتوں تلے دبا گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" آنسہ نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں عکس! کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ ہمیں۔" ثمرین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا یقین دلاتے ہوئے پوچھا۔

عکس نظریں جھکائے زمین میں اگی چھوٹی چھوٹی گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہی تھی۔

"بتاؤ نا عکس.....!" آفرین نے بھی اصرار کیا۔

تینوں اس کے بولنے کی منتظر تھیں۔

"کیا بتاؤں یار..... اصل میں تم جانتی تو ہو' ہم تین بہنیں دو بھائی ہیں۔ بڑی بہن کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا۔ کافی جگہ بات بنی مگر انکار ہو جاتا ہے۔ امی بہت پریشان ہیں حور کے لیے۔ ان کے چکر میں ہم ان کے برابر کی ہو گئی ہیں۔ مجھ سے بڑی آمنہ کا رشتہ آیا تھا۔ اچھا تھا۔ امی مطمئن تھیں کہ شادی تینوں کی ساتھ کریں گے۔ امی نے آمنہ کی منگنی کر دی۔ حور کے رشتے کی تلاش جاری تھی کہ درمیان میں آمنہ کے سسرال والوں نے شادی کرنے کا اصرار کر دیا۔ امی اور بھائیوں کی ضد ہے کہ جب تک حور کا نہیں ہوتا' ہم دونوں کی نہیں کریں گے۔ اسی وجہ سے امی نے آمنہ کے سسرال والوں کو شادی سے انکار کیا اور انتظار کرنے کو کہا تو وہ لوگ منگنی توڑ کر چلے گئے۔ اگر یہی حالات رہے تو نہ حور کی شادی ہوگی اور ان کے چکر میں نہ ہم دونوں کی ہوگی۔" عکس نے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ..... ویری بیڈ' مگر عکس! برا مت ماننا۔ یہاں غلطی تمہاری امی اور بھائیوں کی ہے۔ لازمی نہیں ہے کہ حور کے انتظار میں وہ تم لوگوں کی بھی نہ کریں۔ حور کے نصیب کا جو ہوگا' وہ اسے ملے گا ضرور' دیر سے ہی سہی اور ہو سکتا ہے اس دیری میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو۔ تمہاری امی کو چاہیے وہ تم دونوں بہنوں کی شادیاں وقت پر کر دیں۔ ہو سکتا ہے تم دونوں کی شادی کے دوران ہی حور کا نصیب بھی کھل جائے۔" ثمرین اس کو سمجھا رہی تھی۔

"یہ ہی بات ہم نے سمجھائی امی کو' حور نے خود بھی کہا ہے۔ امی میرے انتظار میں ان کی عمریں مت بڑھائیں۔ ان کی شادیاں تو کر دیں مگر امی نہیں مانتی۔ امی نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے۔" عکس کا انداز بہت تلخ تھا۔

"حور کی عمر ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے' جو بھی اس کے لیے رشتہ آتا ہے وہ ہم دو میں سے کسی ایک کا سوالی بن جاتا ہے اور امی اپنی عادت کے مطابق انکار کر دیتی ہیں۔ لگتا ہے ہم بھی بوڑھی ہو جائیں گی حور کی طرح۔ تب امی کو عقل آئے گی۔"

"اللہ نہ کرے عکس! ایسی بدفالیں منہ سے نہیں نکالتے ہیں۔ اللہ سے اچھے کی امید رکھو۔ تم اتنی پریشان مت ہو۔ تم اپنے لیے اتنی پریشان ہو۔ ایک دفعہ خود کو اپنی بہن حور کی جگہ پر ---- رکھ کر سوچو' اس کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی جب وہ ریجیکٹ ہوتی ہوگی۔ وہ کتنی اذیت محسوس کرتی ہوگی' جب اس کے لیے آئے لوگ تمہیں پسند کرتے ہوں گے' وہ کتنے دکھ میں ہوگی۔ وہ خود کو بوجھ سمجھتی ہوگی کہ اس کی وجہ سے تم دونوں کی شادی نہیں ہوتی۔ عکس! تمہاری ابھی اتنی زیادہ عمر نہیں ہے۔ ابھی تم بی ایس سی میں ہی تو ہو' تمہارا تو پھر ہو جائے گا۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی بہن کا دل جلاؤ' تمہیں اس کا درد سمجھنا چاہیے۔ اس کا حوصلہ بڑھانا چاہیے۔ اس کا ساتھ دینا چاہیے۔" ثمرین اسے سمجھا رہی تھی۔ جبکہ آنسہ اور آفرین خاموشی سے اسے سن رہی تھیں۔

"چھوڑو یار! ان کا کیا ---- عمر تو ان کی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور....." اس سے پہلے وہ اپنی بات مکمل کرتی

اگلے پیریڈ کی بیل ہو گئی۔ اپنی کتابیں اور نوٹس' بیگ سمیٹ کر اگلی کلاس لینے چل پڑیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کالج سے لوٹی تو لاؤنج سے آتی ٹی وی کی آواز سن کر وہیں چلی آئی۔ جہاں آمنہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی شو دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹیبل پر کتابیں اور بیگ رکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"امی کہاں ہیں؟" "اپنے کمرے میں۔" ٹی وی دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر ہے نا' امی اس وقت کمرے میں کیوں ہیں؟" عکس کو فکر ہوئی۔

"امی کا بی پی بہت لو تھا۔ شدید چکر آ رہے تھے۔ تب ہی دوائی کھا کر اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

وہ ٹی وی کی آواز کم کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ تب ہی لاؤنج میں آتی حور پر نظر پڑی تو اونچی آواز میں کہنے لگی۔

"اور ویسے بھی ہمارے گھر میں اتنی بڑی ٹینشن کے ہوتے ہوئے سب خیر کیسے ہو سکتی ہے۔" اندر آتی حور اس کی بات سن کر وہیں کھڑی رہ گئی۔

"ہونہہ..... یہ تو واقعی سچ کہا ہے تم نے۔ حور کی شادی تو مسئلہ کشمیر بن گئی ہے' جب تک اس کی شادی نہیں ہوگی' ہمارے مسائل بھی حل نہیں ہو سکیں گے۔" عکس نے تائید کی۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب حور میں نہ تھی۔ وہ الٹے قدموں لاؤنج سے واپس نکل کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر نظریں شیشے میں اپنے عکس پر جما دیں۔

"کچھ خاص نہیں ہے مجھ میں' اگر خاص ہوتا تو آج تک ریجیکٹ نہ کی جا رہی ہوتی اور یہ میری بہنیں..... یہ کیا جانیں ریجیکٹ ہونے کی اذیت کیا ہے۔ میرے لیے آیا رشتہ جب میرے بجائے ان کے لیے ڈال دیا جاتا ہے تو میں کیا محسوس کرتی ہوں اور اب تو کوئی اذیت' کوئی سوچ نہیں رہی' سوائے اس کے کہ میں اپنی بہنوں کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہوں۔ یا اللہ! میں ایسا کیا کروں جو ان کی خوشیاں بچا لوں۔ یہ جو مجھ سے متنفر ہو گئی ہیں' مجھے بوجھ سمجھتی ہیں' میں ان سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتی۔ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار مجھے سمجھا جا رہا ہے۔ میری بہنیں مجھ سے ناراض ہیں۔ ایک طرح سے ان کا ناراض ہونا بھی درست ہے۔ میری وجہ سے آمنہ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ کتنی خوش تھی آمنہ اس رشتے سے اس فیصلے سے میں خود اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔ یا اللہ میں کیا کروں؟" دردناک سوچوں نے اسے اپنے گھیراؤ میں لیا ہوا تھا۔

"میں اب تھک گئی ہوں میرے مولا! سب کے لیے ایک ناپسندیدہ بوجھ بن گئی ہوں۔ میں کیا کروں....." وہ سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ ناپسندیدہ ہستی ہونے کا خیال ہی کتنا سوہان روح ہوتا ہے' کوئی اس سے پوچھتا۔

ان ہی دردناک سوچوں کے درمیان اس نے ایک فیصلہ کیا' حتمی فیصلہ اور آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا اور خود کو کمرے میں محصور کر لیا۔

☼ ☼ ☼

آج ان لوگوں کا آخری پیپر تھا۔ وہ سب پیپر دے کر سکون سے گراؤنڈ میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب آنسہ چہکی تھی۔

"تم لوگوں کا آگے کا کیا ارادہ ہے۔ ثمرین کا تو پتا ہے۔ یہ اماں جانی کے عہدے پر فائز ہونے والی ہے۔ اس لیے اس نے آگے نہیں پڑھنا۔ باقی تم دونوں کا کیا ارادہ ہے؟" اس نے آفرین اور عکس سے پوچھا۔ آفرین نظریں جھکائے مسکرا رہی تھی۔

"اب پیپرز ہو گئے ہیں اور ہمارا پکا ارادہ ہے اس کی رخصتی کا۔ دونوں طرف تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔" ثمرین مخاطب آنسہ سے تھی اور دیکھ عکس کو رہی تھی'

جو آفرین کی شادی کا سن خاموش سی ہو گئی تھی۔
"تم دوسروں سے پوچھ رہی ہو' اپنا پلان بھی تو بتاؤ۔"

"میرا پلان تو کوئی نہیں ہے' البتہ گھر والے پیپرز ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اب شادی کریں گے۔"

"ہاں... اب عکس سے بھی پتا کرو نا' اس کا کیا ارادہ ہے۔" آنسہ نے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
عکس خاموش رہی' تب ہی ثمرین نے فوراً" کہا۔
"آفرین! تم اور آنسہ ذرا جا کر گیٹ پر تو دیکھو' کیا پتا تمہارے بھائی آئے کھڑے ہوں' ہمیں لینے کے لیے۔"

"اوہ... باتوں میں یہ تو میں بھول ہی گئی آنسہ! آؤ ذرا ہم دیکھ کر آتے ہیں۔" آفرین نے کہا اور آنسہ کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔
ان کے جانے کے بعد ثمرین عکس سے مخاطب ہوئی۔
"عکس! میں جانتی ہوں تم کیوں خاموش ہو... میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ صبر کرنا سیکھو' صبر کرنا سیکھ جاؤ گی تو بہت کچھ پا لو گی۔ وقت سے پہلے اور تقدیر سے زیادہ کچھ نہیں ملتا اور ایک بات' اپنے لیے بعد میں سوچو' پہلے دوسروں کے لیے سوچو' پھر دیکھنا خوشیاں خود بخود تمہاری جھولی میں آ گریں گی۔ خود غرض بن جاؤ گی تو بہت پچھتاؤ گی۔ بدگمانیوں کی دلدل سے باہر نکل کر دیکھو' پھر تم بھی وہ محسوس کر پاؤ گی جو میں نے محسوس کیا ہے۔"
عکس دور کہیں نظریں جمائے خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ پوری طرح بدگمانیوں میں پھنس چکی تھی۔
آنسہ اور آفرین آ چکی تھیں۔
"بھائی آئے ہوئے ہیں' فوراً" چلو' ورنہ غصہ کریں گے۔" آفرین نے نیچے بیٹھ کر جلدی جلدی نوٹس سمیٹتے ہوئے ثمرین سے کہا۔
پھر وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔ الوداعی کلمات کے ساتھ ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئیں۔ شروع میں تو سب رابطے میں رہیں' پھر آہستہ آہستہ سب اپنی زندگیوں میں گم ایک دوسرے کو بھلاتی چلی گئیں۔
وقت کا کام تھا گزرنا' سو وہ گزرتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

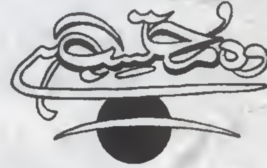
"حنا بیٹا! دیکھو تیار ذرا ٹھیک طرح ہونا اور تم چاروں کو میں وارن کر رہی ہوں۔ آج تم میں سے کوئی بھی ان لوگوں کے سامنے نہیں آئے گا۔ ہر بار تم میں سے کوئی نہ کوئی سامنے آ کر کام خراب کر دیتا ہے۔ اسی لیے بار بار کہہ رہی ہوں' آج تم میں سے کوئی بھول کر بھی مہمانوں کے سامنے نہیں آنے پائے۔" وہ چاروں کو وارن کرتی حنا کو ٹھیک طرح سے تیار ہونے کا حکم دیتی واپس چلی گئی۔
کچھ ہی دیر میں جن کی آمد کا انتظار تھا' وہ تشریف لا چکے تھے۔ وہ جیسے ہی ان کے استقبال کو آگے بڑھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی جگہ جم سی گئیں۔
"ثمرین تم!" عکس اپنی بچھڑی دوست کو سامنے پا کر حیرت زدہ سی اس کی طرف بڑھی۔ ثمرین بھی حیران سی اس کی طرف بڑھی۔ دونوں اردگرد کو بھلائے ایک دوسرے کو گلے لگائے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔
"مجھے تو یقین نہیں آ رہا تم میرے گھر آئی ہو۔" عکس اب بھی بے یقین سی تھی۔ تب کوثر (رشتے کرانے والی خالہ) ان کے درمیان بولیں۔
"اب یقین کر لو اور باقی کا یقین سکون سے بیٹھ کر کر لینا۔" ان کی بات سن کر وہ دونوں ہنس دیں۔
"آؤ ثمرین بیٹھو۔" عکس اسے لیے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم نے رابطہ کیوں ختم کر دیا تھا ثمرین!" عکس پوچھ رہی تھی۔
"ختم نہیں کیا۔ بس زندگی کے جھمیلوں میں فرصت نہیں ملی' سب کچھ چھوٹتا چلا گیا۔"
"اور آفرین کا کیا حال ہے' وہ کیسی ہے؟" عکس

نے پھر سوال کیا۔
"وہ بھی ٹھیک ہے' خوش ہے' تین بچے ہیں اس کے دو بیٹے' ایک بیٹی۔"
"خالہ! آپ ایسا کریں' ذرا حنا کو دیکھیں' وہ تیار ہوئی کہ نہیں۔" عکس نے کوثر خالہ کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔ وہ خاموشی سے اٹھ گئیں۔
"عکس! تم بتاؤ کیسی ہو... کیا کرتی ہو' شادی کب ہوئی تمہاری۔ کتنے بچے ہیں؟ اور تمہاری بہنوں کا کیا حال ہے؟" ثمرین نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔
عکس ذرا سا مسکرائی پھر بولی۔
"میں ٹھیک ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ کرتی کچھ نہیں۔ گھر پر ہوتی ہوں۔ ایک مکمل ہاؤس وائف۔ شادی بی ایس سی کے چند مہینوں بعد ہی ہو گئی تھی۔ پانچ بیٹیاں ہیں میری... اور اب بڑی بیٹی ہی کے رشتے کے لیے خالہ کو کہا تھا' جب ہی تم آج یہاں ہو۔" آخر میں وہ نظریں جھکا گئی۔
"تمہاری اور آمنہ کی شادی کب ہوئی عکس!" وہ شاید کچھ جاننا چاہ رہی تھی اور تمہاری بڑی بہن حور...؟"
عکس نے لمبی سانس بھری اور اس کو بتانے لگی۔
"آمنہ اور میری شادی بی ایس سی کے تقریباً" چھ مہینے بعد ہوئی اور حور اسے اس کے صبر کا انعام ایک اچھے جیون ساتھی کی شکل میں ملا۔ حور کی شادی ہماری شادی کے ایک سال بعد ہوئی۔"
"تمہاری امی کیسے مانیں حور سے پہلے تم دونوں کی شادی کے لیے...؟" عکس کے چپ ہونے پر اس نے جلدی سے اگلا سوال کیا۔
"حور ہی نے امی کو منایا۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ ساتھ ہی بھوک ہڑتال کر دی۔ تین دن تک وہ اسی طرح ضد پر اڑی رہی تو امی کو اپنی ضد چھوڑ کر اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ پھر امی نے اور انتظار نہ کیا۔ بی ایس سی کے رزلٹ کے تین مہینوں بعد میری اور آمنہ کی شادی کر دی مگر تب ہم نے اپنی بڑی بہن کو کھو دیا۔ ہماری شادی کے ایک سال بعد حور کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد اس نے ہم سے قطع تعلق کر لیا۔ شاید ہمیں دیکھ کر اس کی وہ اذیت بھری یادیں ہری ہو جاتی تھیں' جو ہم نے اسے دی...
تم ٹھیک کہتی تھیں ثمرین! تمہارا کہا ایک ایک لفظ آج حقیقت کا روپ دھارے میرے سامنے کھڑا ہے۔ میں ہمیشہ امی سے بدگمان رہتی تھی کہ انہیں بس اپنی بڑی بیٹی کا خیال ہے مگر آج جب میں خود پانچ بیٹوں کی ماں بنی ہوں تو مجھے سمجھ میں آیا' امی کیوں بڑی بیٹی کی شادی سے پہلے چھوٹیوں کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ امی کی ضد کی وجہ آج سمجھ میں آئی... کتنی جلدی میری سب بیٹیاں ایک برابر قد تک پہنچ گئی ہیں اور آج جب خود میری بڑی بیٹی کا رشتہ ہزار کوششوں کے باوجود نہیں ہو پا رہا تو مجھے سمجھ میں آیا حور کو ہم نے کتنی اذیت دی تھی۔ کتنا کچھ سنایا تھا' مگر اس نے ہمیں کبھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔
حور کا دکھ' اس کا صبر آج مجھے تڑپاتا ہے اور میں چاہ کر بھی اس کی اذیت کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ میں بہت خود غرض تھی۔ جب بھی میری کسی دوست یا جاننے والی کی منگنی یا شادی ہوتی مجھے شدید جلن ہوتی تھی کہ میری منگنی میری شادی بھی ہو سکتی ہے مگر ان کے درمیان رکاوٹ حور ہے۔ اپنی اسی جلن میں اپنی خود غرضی میں میں نے اپنی بہن کو گنوا دیا۔"
عکس اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔
اور ثمرین بہت بنی خاموش نظروں سے اسے روتے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ اسی صورت حال سے بچنے کے لیے تو اس نے آخری ملاقات میں اسے کچھ سمجھانا چاہا تھا مگر... سب بے سود رہا۔
"کیا ہم ٹھوکر لگنے سے پہلے درست اقدام نہیں کر سکتے...؟" ثمرین بس سوچ کر ہی رہ گئی۔



اُم مریم



میں باس کے کیبن سے نکلا تو میرا چہرا غم و غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

"اف اتنی توہین، ایسی ذلت!" میرے کانوں سے ابھی تک بھاپ نکل رہی تھی۔

"موٹا، ٹھگنا، گنجا! جانے خود کو سمجھتا کیا ہے؟ ارے ہم اس کے زر خرید ہیں جو دو ٹکے کی نوکری پہ جب چاہے ہمیں بے عزت کر ڈالے، منحوس!"

میں واپس اپنی سیٹ پہ آ کر بیٹھنے تک بھی کلستا، سلگتا رہا تھا۔ توہین کے احساس سے دماغ کی رگیں کھینچ رہی تھیں۔ جی تو چاہ رہا تھا نوکری پہ لات مار کر چلا جاؤں مگر بینش کے غضب ناک چہرے نے تصور میں آ کر مجھے اپنے ارادے پہ قائم نہیں رہنے دیا۔ وہ تو ڈائن بن کر خون پی جاتی میرا۔

"ریلیکس یار! کیا ہو گیا ہے۔ اتنا ٹینس کیوں ہو رہے ہو؟"

میرے کولیگ نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی تو میں نے سرد آہ بھری۔ اب اسے کیا بتاتا کہ میرے ستارے کیسے گردش میں آئے ہوئے ہیں آج کل، ہر طرف سے ذلت جیسے بارش بن کر برس پڑی تھی، میں تو بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے میری گاڑی سے ایک معمولی ایکسیڈنٹ ہو گیا کسی انسان کا نہیں کتے کا۔ کتا کسی برگر فیملی کا تھا۔ باہر سے منگوایا ہوا انسانوں سے بڑھ کے قدر تھی محترم کی۔ جب ہی تو اس کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہونے پہ حوالات کی سیر کرا دی تھی اس کے مالک نے مجھے۔ اس معاملے کو نبٹا کے بینش کی جو صلواتیں اور نصیحتیں سننی پڑیں، وہ الگ، میری گاڑی کا چالان ہو گیا اور اب یہ باس کی اینٹھی ہوئی شکل۔

"یار! میں تو تنگ آ گیا ہوں اس بے عزتی سے.... حیران ہوں آخر یہ ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ؟" میری شکل پہ بارہ بجے دیکھ کر ساتھی نے ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

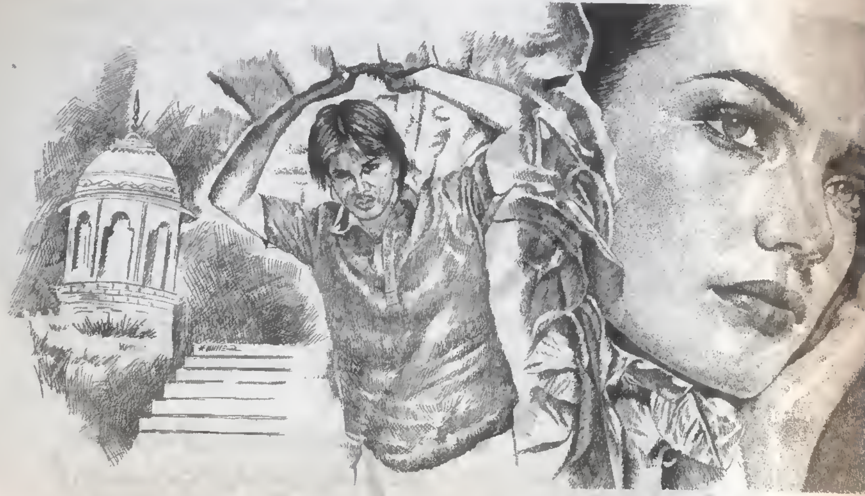
"گردش حالات کہی جا سکتی ہے۔ مصیبتیں کبھی آزمائش ہوتی ہیں، کبھی مکافات عمل!"

اسفر کے کہنے پہ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ یہاں سب خوامخواہ محترم کو مولانا صاحب نہیں کہتے تھے۔ وعظ و نصیحت دل پسند کام تھا مگر میرے تو گویا زخموں پر نمک چھڑکا تھا جب ہی دانت کچکچا کر رہ گیا۔



"اب اٹھ بھی جاؤ، کیا باپ کی طرح ۔۔۔ کاہلی، سستی اور کام چوری میں نام پیدا کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ حد ہے بھئی یہ اتنا نکما انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ جانے کون سا منحوس وقت تھا جب میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ کاش اس فیصلے سے قبل کسی ایک کو موت آ گئی ہوتی۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی"۔

یہ صور اسرافیل جیسی آواز میری بیوی بینش کی ہے جو بچوں کی پٹائی کرتے ہوئے خود لیٹے لیٹے ہی انہیں جگا رہی ہے۔ اب تو میری آنکھ ہر روز اسی کے شور سے کھلتی ہے تو جی چاہتا ہے مر جاؤں۔ میں اٹھا ہوں اور دبے پاؤں کچن کی جانب آ گیا ہوں۔ کچن کی حالت ابتر



ہے۔ میری بیوی پھوہڑ ہرگز نہیں ہے اس لیے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتی سوائے لڑنے طعنے دینے اور نقص نکالنے کے۔ کام تو ملازمہ کرتی ہے یا پھر میں۔ ملازمہ چونکہ صبح کو نہیں ہوتی جب ہی ناشتہ مجھے بنانا پڑتا ہے۔ بچوں کے یونیفارم استری کرنا اور انہیں تیار کر کے اسکول بھیجنے کی ذمہ داری بھی میری ہے۔ ارے کہیں آپ میری داستان سے مجھ پہ رحم تو نہیں کھانے لگے؟ اگر ایسا ہے تو اپنے احساسات سنبھال رکھیں کسی مستحق کے لیے کیونکہ میں ہرگز بھی اس قابل نہیں ہوں کہ مجھ سے ہمدردی بھی کی جائے۔ کل جب اسفر نے وہ بات کہی تو مجھے غصہ آیا تھا مگر رات جب بینش نے بھی الفاظ کے کچھ ہیر پھیر کے ساتھ وہی بات کی تو میری آنکھوں پہ گرے وہ غفلت کے پردے سرک گئے۔ اپنا وہ گھناؤنا عمل پوری جزئیات سمیت ذہن کے پردے پہ روشن ہو کر رہ گیا جس نے صحیح معنوں میں انسانیت کی سطح سے مجھے بہت نیچے گرا دیا تھا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے نفرت زیادہ تھی یا چڑ؟ مجھے یہ بھی نہیں پتا میں اس سے پہلی مرتبہ بے زار کب ہوا۔ کیونکہ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو اپنی سرخ و سفید رنگت، سنہرے بالوں اور نیلی کانچ سی آنکھوں کی وجہ سے وہ مجھے بالکل اس گڑیا کی طرح لگی تھی جو ماما کے بیڈ روم کے ایک شیلف میں سجی ہر دم مسکرایا کرتی تھی۔ وہ بھی بالکل ویسی ہی تھی اٹریکٹو اور چارمنگ۔ مگر میرے لیے وہ اس گڑیا کی طرح نہ تو پسندیدہ ثابت ہوئی نہ بے ضرر نہ ہی اس گڑیا کی طرح گھر کے کسی ایک کونے تک محدود رہ سکی۔

میں سوچوں تو شاید اس سے چڑ کا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا جب ماما کی توجہ بٹنے لگی۔ وہ توجہ جو اس سے پہلے صرف میرے لیے تھی وہ اس میں حصے دار بننے لگی تھی۔ ناشتے کے دوران، کھانے کی ٹیبل پہ، اسٹڈی کرتے ہوئے ماما اچانک مجھ سے غافل ہو کر مکمل طور پر اس کی سمت متوجہ ہو جاتیں۔

"عائزہ بیٹا! آپ نے پلاؤ لیا اور یہ کیک تو تمہیں پسند ہے۔ اپنی پلیٹ میں کیوں نہیں نکالا اور آپ کو پتا ہے، یہ کباب تو اسپیشل میں نے اپنی ہنی کے لیے فرائی کیے ہیں۔"

"غازی! آپ صبح صبح چائے نہیں فریش جوس لیا کرو۔ صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

میں پہلے صرف حساس تھا۔ ماما کی بٹی ہوئی توجہ کی

وجہ سے منتقم مزاج ہونے لگا۔وہ مجھے زہر سے بھی بڑھ کر بری لگنے لگی۔ اسی کی وجہ سے تو ماما بھولتی جارہی تھیں' ان کے بیٹے کی پسند ناپسند کیا ہے۔ ماما میرے بجائے اس کی پسند کے کھانے پکانے لگی تھیں۔ کیا پھر بھی مجھے آگ نہ لگتی؟ مجھے لڑنا نہیں آتا تھا۔ میں کبھی چیخ کر نہیں بولا تھا تب ہی یہ آگ میرے اندر جمع ہوتی رہی اور بالآخر الاؤ کی شکل اختیار کر گئی۔ ایسا الاؤ جو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ میں نے بھی اسی الاؤ میں عازی کو جلا کر خاک بنا دیا۔



پھر وقت بہت تیزی سے بیت گیا۔ وہ جو ماما کی بھتیجی تھی جسے ماما نے اپنے بھائی اور بھاوج کی وفات کے بعد اپنے دامن شفقت میں پناہ دی تھی۔ بڑی ہو کر بہت سلجھی ہوئی نیک پروین قسم کی لڑکی کا روپ دھار گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ماما نے اس کی بہت اعلا پائے کی تربیت کی تھی۔ وہ خوبصورت بھی بہت تھی کہ سب لوگ اسے نہ صرف پسند کرتے بلکہ سراہتے بھی بہت تھے۔ ماما کی سب سہیلیوں میں وہ بہت فرماں بردار مشہور ہو چکی تھی۔ اسے یہ شہرت دینے والی بھی ماما تھیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی اس کے کئی پروپوزلز آچکے تھے مگر ماما جانے کیا سوچے بیٹھی تھیں جو انکار کیے جاتیں اور میں جو اس بلا کے ٹل جانے کے خیال سے ہر بار پر جوش ہو جاتا جھنجلا سا جاتا۔

"آپ کو اس عازی کی بچی کی شادی بھی کرنی ہے یا نہیں؟" جب آفاق ترمذی جیسے پروپوزل کو بھی ماما نے ٹھکرایا تو میں مزید چپ نہیں رہ سکا۔

"کرنی کیوں نہیں مگر ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ رہی ہے وہ۔"

"تو رشتہ تو طے کر دیں۔"

میں دراصل اندر سے خوف زدہ ہو چکا تھا اور اس خطرے کو ٹالنے کی خواہش رکھتا تھا کیونکہ ماما کے ارادے مجھے مشکوک لگنے لگے تھے' وہ شاید اسے مجھ سے منسوب کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھیں جبکہ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں تھا' وہ بھی بینش سے مل لینے کے بعد۔ بینش جو بہت خوبصورت تھی اور بے حد امیر کبیر بھی۔ میرا اس پر دل کیسے آیا۔ شاید وہ خوبصورت زیادہ تھی یا شاید اس کی ادائیں اتنی قاتل تھیں کہ میں گھائل ہونے سے خود کو نہیں بچا سکا' اب تو میرا زیادہ وقت اسی کے ساتھ بیتتا تھا۔

"عازی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے' تم پریشان مت ہو۔"

ماما نے بات ختم کر دی تو مجھے بھی خاموش ہونا پڑا مگر وہ جو دھڑکا تھا وہ چین نہیں لینے دیتا تھا۔



اس روز بینش کی برتھ ڈے تھی۔ تمام فرینڈز میں سے اس نے صرف مجھے انوائٹ کیا تھا اور یہ بات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی اتنے لینڈ لارڈ باپ کی بیٹی مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ یہ پارٹی ہوٹل میں سیلیبریٹ کی گئی تھی۔ میں بہت خوبصورت وقت بینش کے ساتھ گزار کے اور اپنی جیب خوب اچھی طرح سے ہلکی کر کے بھی گویا ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ رات گئے جب میں سرشار سا لوٹا تو سب سے پہلے میرا سامنا عائزہ سے ہی ہوا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ؟ سیل بھی آپ کا مسلسل آف جا رہا تھا۔ آپ کو کچھ احساس بھی ہے کہ....."

"اوئے ہیلو! تم یہ سوال مجھ سے کرنے والی ہوتی کون ہو۔ ہاں؟ بیوی ہو میری یا پھر میری ماں؟ میں نے اپنی زندگی میں یہ حق تمہیں کبھی بھی نہیں دیا۔ سمجھیں۔ میں دیر سے گھر لوٹوں یا رات بھر باہر رہوں' تمہیں جواب دہ نہیں ہوں میں۔"

اس کی بات درمیان میں سے ہی کاٹ کر میں گویا اس پر برس پڑا تھا۔ اس کا گلابی چہرا ایک دم زرد پڑ گیا۔ یہ سچ تھا کہ بچپن سے جنم لینے والی اس نفرت نے مجھے کبھی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرنے

دی تھی۔ مگر میں ماما سے ڈرتا تھا' اس لیے کبھی منہ در منہ اس کو سنائی بھی نہ تھیں مگر میری خشمگیں نظریں' میرا الیا دیا انداز ہی اسے محتاط کر گیا تھا۔ ہمارے بیچ بہت گریز تھا وہ مجھ سے بہت کم مخاطب ہوا کرتی' وہ بھی کسی بہت ضرورت کے موقع پر۔ وہ بہت باوقار لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جس کی خود بخود عزت کرنے کو دل چاہے مگر میرا نہیں۔ میں تو اس سے بس نفرت ہی کرتا تھا۔ جب ہی اس وقت بھی اس کا دھواں ہوتا چہرا مجھے نادم کرنے کے بجائے مزید متنفر کر گیا۔

"اب جاؤ بھی یہ رونی صورت لے کر یہاں سے۔ اونہہ!"

"ایزد..... کیا بد تمیزی ہے یہ؟"

ماما یقیناً "میری بلند آواز پہ ہی گھبرا کر کمرے سے باہر آئی تھیں ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بوجھل تھے۔

"اسے سمجھا دیں ماما! یہ میرے معاملات میں ٹانگ نہ اڑایا کرے۔" میرا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

"تمہارا سیل آف تھا۔ تم صبح سے گھر سے باہر تھے۔ شہر کے حالات کا تمہیں پتا ہے۔ بیٹا! اس پریشانی نے میرا بی پی شوٹ کر دیا تھا۔ بہت ٹینشن میں تھی وہ بھی میرے ساتھ اسی پریشانی میں۔ تمہیں تمہاری بے حسی کا احساس دلانا چاہا تھا۔ یہ غلطی تھی اس کی۔"

ماما کی آواز ایک دم جیسے آنسوؤں سے بھاری ہو گئی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اپنی غلطی کے احساس پہ نہیں ایک بار پھر ماما کی اس کی حمایت پہ۔ تب مجھے احساس ہی نہ ہوتا تھا' درحقیقت میں ہی غلط ہوں۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

میں نے خود کو کمپوز کیا اور ان کے قریب آکر کاندھوں سے تھام کر انہیں سہارا دیتے ہوئے ان کے کمرے کی جانب لے جانے لگا۔ مجھے اب جا کے اس اعتراف میں بھی عار نہیں کہ میں کسی حد تک دوغلا بھی تھا۔ اس وقت مجھے ناگواری محسوس ہوئی تھی مگر میں نے ناگواری ظاہر نہیں کی بلکہ ماما سے ہمدردی ظاہر کی تھی جسے ظاہر ہے وہ سمجھ نہیں پائیں اور میری اس حرکت کو اپنی غلطی کا احساس ہو جانا سمجھ کر خوش ہو گئیں۔

"بیٹا! اتنی رات تک گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ اور عائزہ سے اس طرح بات مت کرنا آئندہ۔ یتیم بچی ہے۔ میں اکثر بیمار رہتی ہوں بلکہ تم وعدہ کرو اگر مجھ کچھ ہو گیا تو تم ہمیشہ اس کا خیال رکھو گے۔"

"آپ ایسی باتیں مت کریں ماما! مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"موت تو برحق ہے بیٹا! سب کو آنی ہے۔ تم بس مجھ سے وعدہ کرو۔"

ماما کی ضد اور اصرار پہ میں جزبز ہونے لگا۔ اب بات کھولنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

"اس کی شادی کر دیں ماما! اس کا شوہر اس کا خود خیال رکھ لے گا۔"

"میں تو چاہتی ہوں' عائزہ کی شادی تم سے کر دوں۔ مجھے بہت عزیز ہے وہ اور میں اسے ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ اس قدر ملتجی ہو کر بولیں کہ میں جو دماغ کو بھک سے اڑتا محسوس کر رہا تھا محض جزبز ہو کر رہ گیا۔ عجیب تھیں ماما بھی۔ کبھی مرنے کی بات کرتی تھیں' کبھی اسے عمر بھر آنکھوں کے سامنے دیکھنے کی۔ بھلا ایک مرے ہوئے انسان کو زندہ انسانوں کے دکھ سکھ سے کیا غرض؟

آپ مجھے ملامتی نظروں سے دیکھ رہے ہیں نا؟ میں تب ایسا ہی تھا۔ مجھے شاید تب کسی سے محبت نہ تھی سوائے اپنے ذات کے۔ میں بے حس بھی تھا شاید اور یہی بے حسی مجھ سے وہ گھناؤنا فعل سرزد کرا گئی۔



ماما عائزہ کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی تھیں جو مجھے ہرگز گوارا نہ تھا۔ میں بینش کے علاوہ کسی اور کے

متعلق اگر سوچتا بھی تو وہ ہرگز ہرگز عائزہ نہ ہوتی۔ مجھے اس سے اتنی نفرت تھی کہ حد نہیں۔ حیرت ہے میری نفرت کی آنچ ماما تک کیسے نہیں پہنچی۔ شاید ماما کی غرض پوشیدہ تھی۔ انہیں اپنی بھتیجی کے آگے میری خوشی نظر ہی نہ آتی تھی۔ سلیقہ شعار، کم گو، خدمت گزار بھتیجی جسے بہو بنا کر وہ عمر بھر کا سکھ پانے کی متمنی تھیں۔ نئی آنے والی جانے کیسی ہو، یہی خوف انہیں اس فیصلے پر اکسا رہا تھا۔ یعنی ایثار کا ایثار۔ نیکی کی نیکی اور فائدے کا فائدہ۔ وہ کیا مثل مشہور ہے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ بالکل یہی بات تھی اور میں ماما کی اس سازش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا تب ہی غور و خوض کرنا شروع کر دیا کوئی ایسا طریقہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کہ میں جتنا بھی بے حس مفاد پرست سہی بہرحال کھل کر ماما کی مخالفت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ ماما بی پی کے ساتھ ہارٹ پیشنٹ تھیں اور ڈاکٹر نے انہیں کسی بھی صدمے یا دکھ سے بچانے کی سختی سے تاکید کر رکھی تھی۔ جبکہ میں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ماما کی طبیعت ان دنوں خراب رہنے لگی تھی اور وہ پتا نہیں کیوں میری شادی کرانے کے درپے ہو گئی تھیں۔ مجھ کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے عازی سے بات کرنے کی ٹھانی۔ میں بندوق کے لیے اس کا کاندھا استعمال کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی قسمت نے مجھے ایک اور سنہرا موقع فراہم کر دیا۔

مظہر، بابا کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ گاؤں میں بابا کی وسیع زمین تھی جنہیں بابا کی وفات کے بعد سے مظہر کے ابا یعنی میرے رشتہ کے تایا ہی سنبھال رہے تھے زمینوں سے ہونے والی آمدنی کا حساب کتاب اور کچھ خالص قسم کی سوغاتیں مثلاً" پنجیری، دیسی گھی وغیرہ باقاعدگی سے تایا جی خود پہنچایا کرتے تھے کہ ماما اپنی بیماری کی وجہ سے طویل سفر کرنے سے قاصر تھیں جبکہ مجھے ان کاموں میں سرے سے دلچسپی ہی نہیں تھی لیکن اس مرتبہ چونکہ تایا جی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی جب ہی انہوں نے خود آنے کے بجائے مظہر کو بھیج دیا۔ سیدھا سادا احمق سا دیہاتی مظہر شکل سے ہی بے وقوف لگتا تھا۔ اس کی شکل پہ برسنے والی اس حماقت نے ہی مجھے وہ شیطانی منصوبہ گھڑنے میں مدد دی تھی اور جب ماما اسے رات رک جانے پہ اصرار کر رہی تھیں۔ میں نے بھی سرسری سے انداز میں ان کی حمایت کر دی۔ وہ بے چارہ تذبذب کا شکار آخر رک گیا کہ ان کے ہاں بزرگوں کی بات کو بہرحال بہت اہمیت دی جاتی ہے اس کی آمادگی دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا مگر کسی پہ بھی ظاہر کیے بغیر میں نے سب سے پہلے فون پر اپنے خاص دوست سے ساز باز کی اور اسے اس کا کام سمجھا کر آمادہ کیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ اس کی تو سنتے ہی باچھیں کھل گئیں اس کی بے پایاں خوشی کو محسوس کیے بنا میں نے فون بند کر دیا تب مجھے اندازہ تک نہ تھا۔ میں انسانیت کی سطح سے کس حد تک گر رہا ہوں۔ دوسرا کام مجھے اس وقت کرنا تھا جب عائزہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف ہوتی۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مظہر دیہاتی تھا اور سر شام کھانا کھانے کا عادی جب ہی عائزہ کو اس روز معمول سے کہیں پہلے کچن میں جانا پڑا اس کے جاتے ہی میں اس کے کمرے میں آگیا۔ دریچے سے پردے ہٹا کر میں نے کھڑکی کا پٹ وا کیا اور جنگلے کی دو سلاخیں کچھ اس حد تک ہٹا دیں کہ اسے (میرا دوست جسے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا) با آسانی وہاں سے کمرے میں داخل ہو سکے۔ یہ خاصا مشقت طلب کام تھا مگر صد شکر کہ یہ کھڑکی گھر کے پچھواڑے حصے میں کھلتی تھی اور اس طرف کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ عائزہ کے بالکل ساتھ میرا کمرا تھا اگر اس کے کمرے میں شور ہوتا اور میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوتی تو وہاں سے یہ ساری آوازیں با آسانی اندر پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے دریچے کو بند کیا مگر چٹخنی نہیں چڑھائی پردے برابر کیے اور دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ باقی کھیل رات کا تھا۔ کھانے کے بعد جب ماما اور عائزہ اپنے

کمروں میں چلی گئیں تو میرے لیے مظہر کو مووی دیکھنے کے لیے قائل کرنا ہرگز مشکل ثابت نہ ہوا۔ اسے اپنے کمرے میں لا کر میں نے ذرا گرما گرم قسم کی مووی لگائی اور خود واش روم جانے کے بہانے سے اٹھ گیا۔ باتھ روم میں قدم رکھنے سے قبل میں نے ایک نظر کھلی کھڑکی پہ ڈالی اور مطمئن ہو گیا۔ واش روم میں بند ہو کر میں نے شاور کھول دیا اور فون نکال کر اسد کو کال کر کے ایکشن لینے کا کہا اور خود گنگناتے ہوئے شاور لینے لگا اس کام سے فراغت کے بعد میں نے کموڈ پہ پیر رکھ کر روشن دان سے کمرے میں جھانکا۔ مظہر مطمئن اور مگن انداز میں مووی میں گم تھا۔

"یہ اسد خبیث کہاں رہ گیا؟"

ہر طرف سے اطمینان نے مجھے ابھی تشویش میں مبتلا کیا ہی تھا کہ ایکدم کھلی کھڑکی سے نسوانی چیخوں کی آواز کمرے میں در آئی۔ مظہر نے بہت چونک کر سر گھمایا اور آواز کا تعین کرنے کے بعد وہ بہت سرعت سے اٹھا تھا اور دریچے تک گیا اور گویا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگلے لمحے وہ ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ تیر کی مانند واش روم کے دروازے تک آیا اور دونوں ہاتھوں سے ایک افراتفری کے عالم میں دروازہ پیٹ ڈالا۔

"ایزد بھائی! ایزد بھائی۔ جلدی باہر آئیں۔ مجھے لگتا ہے عائزہ باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں یا پھر کوئی اور گڑبڑ ہے۔ وہ زور زور سے چیخ رہی ہیں، مدد کو پکار رہی ہیں۔"

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں تیز تیز بولا تھا مگر میرے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا وہ ایکدم پلٹا اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا، میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اب تک سب کچھ میری سوچ اور منصوبے کے مطابق تھا تو آگے بھی میرے پھیلائے جال سے نہیں نکل سکتے تھے۔ میں خباثت سے مسکرایا اور کموڈ سے اتر کر دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ ٹی وی ہنوز چل رہا تھا مگر کھلے دریچے سے بے ہنگم شور کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ میں کچھ حیرانی کچھ پریشانی کا تاثر لیے کمرے سے نکلا۔ گھر کے ملازم ماما سمیت عائزہ کے کمرے کی جانب دوڑے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ ملازم باہر رک گئے مگر میں ماما کے ساتھ عائزہ کے کمرے میں جا گھسا۔

عائزہ کی حالت غیر تھی اور بدحواس سا مظہر ہاتھ میں اس کی چادر پکڑے کھڑا تھا۔ میں تلملا کر آگے بڑھا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ مظہر کو لاتوں اور ٹھوکروں کی زد پہ رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ میری زبان سے مغلظات بھی جاری تھے۔ میں ہر ممکن طریقے سے مظہر کو مجرم ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مظہر تو بھونچکا ہوا ہی تھا۔ عائزہ بھی بدحواس ہو گئی۔

"ذلیل! گھٹیا! کمینے! مجھے کیا پتہ تھا۔ تو اتنا خبیث ہے ورنہ ..."

میرے ہاتھ اور سرعت سے چلنے لگے ساتھ زبان بھی۔ مظہر تو گنگ ہونے لگا تھا۔ یہی میں بھی چاہتا تھا۔ کہ اسے صفائی کا موقع ہی نہ ملے۔ مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ چیز تھا۔ اتنی مار کھا کر بھی چپ نہیں رہا۔

"ایزد بھائی! ایزد بھائی! میری بات سنیں۔ یہ میں نہیں تھا۔ میں تو شور سن کر آیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ میرے آنے پہ بھاگا ہے۔ میں تو....."

"بکواس مت کر۔ جھوٹے کمینے! تو آیا ہی خراب نیت سے تھا۔ تیرے دماغ میں فتور تھا۔"

میں نے ایک زور کا گھونسا اس کے منہ پہ دے مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ وہ پہلی بار خوف زدہ نظر آیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے ہونٹ سے ٹھوڑی تک بہہ جانے والے خون کو چھو کر دیکھا پھر گھگھیا کر بولا تھا۔

"ایزد بھائی! آپ عائزہ باجی سے پوچھیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ عائزہ باجی! آپ بتائیں، وہ کون تھا میں یا کوئی اور..... چاچی! میری بات کا یقین کریں....."

وہ پہلے عائزہ پھر ماما کے آگے گڑگڑایا۔

"اس سے پوچھیں، جو خود تیرے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اسی نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا نا؟"

میں کسی طور بھی جیتی ہوئی بازی ہارنے پہ آمادہ

نہیں تھا جب ہی عائزہ کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ عائزہ جو تب سے یوں ساکن کھڑی تھی جیسے پتھرا گئی ہو اسی آخری بات پہ وہ یک لخت زرد پڑ گئی۔

"ایزد! خاموش ہو جاؤ۔"

ماما جو تب سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک صدمے کی کیفیت میں یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں اس بات پہ حواسوں میں لوٹ کر زور سے چلائیں۔

"عائزہ کو کچھ مت کہو۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ میری بچی ایسی نہیں ہے۔"

ماما نے تڑپ کر کہا اور بے قراری سے عائزہ کی طرف لپکیں جو بھربھری دیوار کی طرح کھڑے سے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

شاید میرے الفاظ کی سنگینی اور سفاکی نے اسے یکلخت بے جان کر دیا تھا۔ مگر مجھے احساس یہ کہاں تھا۔

"اونہہ اب ڈرامے شروع ہوں گے اور کون کتنا پارسا ہے اب ہی تو آپ جانیں گی۔ یہ محترمہ پہلے مجھ پہ ڈورے ڈالتی رہیں' ناکامی کی صورت میں جو جیسا بھی ملا اسی پہ اکتفا کر کے نفس کی پیاس بجھانے کا انتظام کر لیا۔"

میرے لہجے میں نفرت کی ایسی آگ تھی کہ جس کی لپٹوں نے عائزہ تو عائزہ ماما کو بھی جھلسا کے بھسم کر دیا۔ میں نے بتایا نا کہ تب مجھے صرف جیت جانے کا جنون تھا' جان چھڑا لینے کی چاہ۔ میں بھول گیا میں کتنی پستی میں اتر گیا ہوں کیسی ذلت کو آواز دے لی ہے۔

عائزہ کا زرد چہرا اس الزام پہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے ایکدم سختی سے آنکھیں بھینچ لیں اتنی سختی سے کہ پھر وہ آنکھیں کبھی کھل ہی نہ سکیں۔

✡ ✡ ✡

وہ بہت انا پرست تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ماما کی اتنی محبت لاڈ پیار کے باوجود اس نے کبھی ماما سے خود سے کسی چیز کا تقاضا کیا نہ کبھی کوئی فرمائش' وہ ہمارے گھر کا ایک خاموش کردار تھی۔ ماما کی شدید خواہش تھی کبھی وہ اپنے منہ سے ان سے کوئی فرمائش کرے مگر ان کی یہ خواہش خواہش ہی رہی تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس روز میں یونیورسٹی سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی' تب وہ میرے کمرے میں تھی شاید ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو اس کے ہاتھ میں میری وہ تصویر تھی جو ہر دم میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ دھری رہتی تھی۔ میں بہت خوبصورت نہیں تھا مگر پرکشش ضرور تھا مگر اس وقت میری تصویر کو اپنے آنچل سے صاف کرتے اس کی نگاہوں میں جو جذبے تھے۔ وہ صاف گواہی دیتے تھے کہ وہ مجھے اپنی زندگی میں کوئی خاص مقام دے چکی ہے۔

یہ بات مجھے آگ لگا دینے کو کافی تھی اگر کہا جائے کہ اس حد تک جا کر اسے ذلیل کرنے کا منصوبہ بھی میں نے اسی باعث بنایا تھا کہ میں اسے جتلانا چاہتا تھا کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت کیا ہے گو کہ اس ایک واقعہ کے بعد اس کی کسی حرکت سے بھی مجھے ایسی کوئی بھنک نہیں پڑی تھی۔

میں نے بتایا نا' وہ بہت انا پرست' باوقار اور خوددار قسم کی لڑکی تھی اور ایسے لوگ محبت اور عزت میں سے ہمیشہ انا اور عزت نفس کا ہی انتخاب کیا کرتے ہیں۔ میری اس الزام تراشی کے بعد یقیناً" وہ خود سے بھی نظریں ملانے کے لائق نہیں رہی تھی جب ہی تو اس کے دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا۔

"وہ بہت تھوڑی عمر لکھوا کر لائی تھی تب ہی جلدی چلی گئی۔" میں یہی کہہ سکتا تھا۔

ماما کو تو گویا سکتہ ہو گیا تھا' انہیں شاید اس کی موت کا یقین نہیں آتا تھا یقین تو مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ کتنی آسانی سے وہ میرے سارے راستے صاف اور آسان کر گئی تھی۔

مظہر اس کا جنازہ اٹھنے پہ بہت کرلایا تھا۔ بہت شدتوں سے رویا تھا مگر ماما کا سکتہ تب بھی نہ ٹوٹا۔ پرسہ دینے کو آئے لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دن بہت آہستگی سے رینگ رینگ کر بیتتے رہے۔ مگر ماما کی چپ تھی کہ ٹوٹتی نہ تھی اور میں انتظار

میں تھا کب ماما اس صدمے سے نکلیں تو میں ان سے بینش کے لیے بات کروں۔ اس نے الگ میری جان کھائی ہوئی تھی کہ میں اپنی ماما کو اس کے گھر پروپوزل دے کر بھیجوں مگر ایسی سچویشن میں میں ماما سے بات کرتے ہچکچاہٹ کا شکار تھا مگر اس وقت میں ششدر رہ گیا تھا جب ماما نے خود مجھ سے اس موضوع پہ بات کی۔

"جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو ایزد! مجھے کل اس کے گھر لے چلنا۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا ماما کہ میں کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہوں؟"

میں نے ایک احمقانہ سوال کر دیا تھا۔ ماما نے سوچے ہوئے پپوٹے اٹھا کر مجھے گہری یاسیت سے دیکھا تھا پھر آہ بھر کے بولیں۔

"اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں عائزہ کے ساتھ اس طرح کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

ماما کی بات نے گویا مجھے زمین میں گاڑ دیا۔ مجھے لگا کمرے کی چھت کا ملبہ میرے اوپر آ گرا ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔ شاید جب جرم عیاں ہوتا ہے تو ایسی ہی کیفیات ہوتی ہیں۔ میں فق چہرا لیے ٹکر ٹکر ماما کو تکتا رہ گیا جبکہ وہ مزید گویا ہوئیں تو ان کا لہجہ بھی آنکھوں کے ساتھ ساتھ بھر آیا تھا۔

"تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار کہہ دیتے۔ اسے یوں اس کی نگاہوں میں تو معتوب نہ کرتے کہ وہ جینے سے ہی انکاری ہو جاتی۔"

اور ماما جو اس کی میت کے سامنے بھی نہیں روئی تھیں اس وقت رو پڑیں' جانے کتنا گہرا صدمہ تھا ان کے اندر کہ ان کے آنسوؤں کے آگے بند باندھتے میں ہارنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا میری معافی بھی ان کے زخم نہیں بھر سکتی پھر بھی میں نے ان سے معافی مانگی تھی۔ وہ اور شدتوں سے رونے لگی تھیں۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا ایزد! وہ واپس نہیں آ سکتی۔ روز محشر میں اپنے بھائی اور بھاوج کے سامنے شرمندہ ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ تم نے مجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔ کاش میں نے اپنے دل کی خواہش تم پہ ظاہر نہ کی ہوتی۔ کاش تم یہ گناہ نہ کرتے' شاید عائزہ زندہ رہ جاتی۔"

ان کی زندگی میں کتنے ملال در آئے تھے میری وجہ سے۔

✡ ✡ ✡

پھر میری شادی ہو گئی بینش سے ہی اور شروع شروع میں خوش بھی رہا۔ سال بعد ماما بھی عائزہ کے غم کو گلے لگائے اسی کے پاس چلی گئیں اور تب گویا میرے برے دن شروع ہو گئے۔

بینش ـــــ میری جائیداد اور پیسے کو وہ بے دریغ لٹاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شاہی خرچ تھے اس کے بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کبھی کبھار مجھے لگتا' وہ ان ساری خواہشوں اور حسرتوں کو پورا کر رہی ہے جو کبھی پوری ہوئی ہی نہ تھیں۔ یہ اس کے دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی ہی وجہ تھی کہ میرے پرکھوں کی زمین چند سالوں میں بک گئی۔ کہتے ہیں نا بیٹھ کر کھانے سے تو خزانے خالی ہو جایا کرتے ہیں میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ مجھ سے دور ہونے لگا۔ پہلے سکون' پھر دولت بھی۔

تایا جی کے سمجھانے کا مجھ پہ کیا اثر ہونا تھا۔ ساری جائیداد ختم ہو گئی حالات ایسے ہوئے کہ مجھے نوکری کرنا پڑی۔ بیوی کے ساتھ ساتھ مجھے باس کی بھی جھڑکیاں کھاتے کبھی خیال نہ آیا۔ یہ ذلت میری اپنی خریدی ہوئی ہے' یہ واقعی مکافات عمل ہے کہ وہ بے حد نازک' بے حد مصفا لڑکی چاہے جتنی بھی صابر و شاکر رہی ہو مگر اس کا خدا تو محتسب ہے' ایسا محتسب جو سارے حساب رکھتا ہے۔



سائرہ رضا

دل موم کا دیا

"یار! عورت صرف پاکستانی ہوتی ہے۔ اب کی بار صرف پاکستانی۔۔۔ لاسٹ چوائس۔"

ندیم نے قطعیت سے کہا' حال ہی میں وہ دو ماہ پاکستان رہ کر آیا تھا۔ اس نے یہاں شادی کی تھی۔ دو بچے بھی تھے لیکن بیوی کو وہ زمانے پہلے فارغ کر چکا تھا۔ بلکہ فارغ کیا وہ خود ہی ایک روز غائب ہو گئی تھی۔ اب ہر جگہ جائز ناجائز منہ مارنے کے بعد وہ یہی فتویٰ دیتا تھا۔

"تو پھر پاکستان سے ہی کوئی لے آتے۔ یا ملی نہیں کوئی۔" وہ مچھلی کا قتلہ اٹھاتے ہوئے ہنسا۔

"نہیں یار۔۔۔!" وہ کشن پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ناامید ہوا۔

"اس بار تو آپا نے ہیرا ڈھونڈ نکالا تھا۔ کوہ نور۔۔۔ یہ انی ملکہ کے تاج سے زیادہ آب و تاب رکھنے والا۔ خیرہ کر دیا آنکھوں کو۔۔۔ مگر۔"

"یہ دو ماہ پاکستان میں رہ کر جناب کی اردو بہت اچھی نہیں ہو گئی۔"

"یہ اُس حسن سادہ' اداس آنکھوں اور مسکراتے لبوں کا کرشمہ ہے' بندہ خود بخود شاعر ہو جائے۔۔۔ غزل کہے۔۔۔ نظم سنائے۔۔۔ اور کچھ نہ کہے تو قیس کی طرح جنگلوں میں نکل جائے۔"

"وہ اتنی گنوں والی تحریک غزل اور موجد نظم۔۔۔ پھر ساتھ کیوں نہ آئیں۔۔۔ تم تو خود ہی برتن دھوتے پائے گئے ہو۔" وہ لب گردا، اٹھا کر چہار اطراف دیکھنے لگا

مکمل ناول



جیسے وہ کسی ٹیبل دیوار یا پنکھے پر بیٹھی نظر آئے گی۔

"یہی تو ہو نہیں سکا..... لیکن میں آپا سے کہہ آیا ہوں۔ مجھے وہی چاہیے۔"

"اور آپا نے کہا ہو گا کیوں نہیں میرے چاند..... ابھی لو۔"

"یار ابھی لو والی بات..... ہو ہی نہیں سکتی۔" ندیم کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ "ٹھہرو میں تمہیں پکچرز دکھاتا ہوں 'مووی بھی ہے۔ پھر کہنا میں ایسے ہی شاعر نہیں ہوا۔"

وہ بیڈ روم کی جانب بڑھا تو اس نے پرسکون ہو کر پیر پھیلا لیے۔ وہ اس کا نو سال پرانا دوست تھا۔ یہ کراچی سے آیا تھا اور وہ حیدر آباد سے تعلق رکھتا تھا۔ دو بیٹے تھے بالترتیب پندرہ چودہ برس کے..... اس کی زندگی میں اس وقت قانونی طور پر بہرحال کوئی عورت نہیں تھی۔

بیشتر ایشیائی باشندوں کی طرح ہر جگہ سے خواری' اٹھانے کے بعد اب واحد چوائس اماں کی پسند رہ گئی تھی۔ وہ کہہ کر گیا تھا۔ آپا نے اس کے لیے لڑکی پسند کر لی ہے۔ چونتیس پینتیس برس کی کنواری 'خوب صورت' پڑھی لکھی خاندانی..... ندیم کے خاندان میں اس بار شادیوں کے حوالے سے بہت بڑا میلہ لگا تھا۔ ندیم نے وہیں اسے اس کی بے خبری میں دیکھا۔ وہ لٹو ہو گیا تھا۔ لیکن ہوا کیا.....

ندیم کے ہاتھ میں البمز تھے اور لیپ ٹاپ..... وہ ٹشو سے ہاتھ پونچھتا سیدھا ہوا اسے ایکسائٹمنٹ ہونے لگی تھی۔

مایوں مہندی بارات اور ولیمہ کی تقریبات کی پروفیشنل فوٹوگرافر کی عکس بندی تھی۔ وہ ہر تصویر کو بہت خوشی سے بغور دیکھ رہا تھا۔ رنگ برنگا تنا ہوا شامیانہ اور خوب صورت شوخ مشرقی رنگ۔ وہ کسی بھی چہرے کو نہیں کھوج رہا تھا۔ بس رنگوں کو دل میں اتار رہا تھا۔ اسکاٹ لینڈ جیسے کنجوس شہر میں رہتے اس کا دل بھی سکڑ گیا تھا۔

ندیم اس کی کیفیت سے بے پروا تیزی سے تصویریں بڑھا رہا تھا۔

یہ..... یہ..... دیکھو۔" اس کی نظروں نے بہت اشتیاق سے انگلی کے نیچے دیکھا تھا اور زمین اپنی گردش سے رک گئی تھی۔

گرتے جھرنے اچانک جیسے برف کی طرح جہاں کے تہاں جم گئے۔

گھڑی کی سوئیاں تھم گئیں۔ مگر وقت نہیں رکا تھا۔ وہ تیرہ سال آگے بڑھ چکا تھا۔

اسے لگا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے لیکن نہیں..... وہ ایک پل کو رک کر اب اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

اس کا دل ندیم کی انگلی کے نیچے تھا اور انگلی کا یہ بوجھ سینے پر دھری سل کی طرح تھا۔ وہ قطعاً" فراموش کر چکا تھا۔ آج انگلی کا بوجھ ناقابل برداشت تھا۔ کل اس نے خود ہی تو اس دل پر پیر رکھ دیا تھا۔ آگے بڑھ گیا تھا۔

ندیم بہت اشتیاق اور فخریہ انداز میں اپنی مدح سرائی کی تصدیق چاہتا تھا۔

یہ پل دیکھنے سے پہلے کیا ہی اچھا ہوتا وہ بینائی کھو دیتا..... یا چلو..... گویائی چھن جائے۔

"بہت اچھی..... بہت اچھی ہے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"مل..... ملی کیوں نہیں..... کیا میرڈ ہے؟" جو سوال دل و دماغ پر ضربیں مار رہے تھے۔ اس نے ان کا الٹ ہی پوچھا۔

"ہاں..... ناں..... پندرہ سال ہو گئے یار..... لگتی نہیں ہے ناں.....؟"

وہ نشانے پر کھڑا تھا اور اس پر تیر برسائے جا رہے تھے۔ سر' آنکھیں گال ناک جگہ جگہ تیر گڑے تھے۔

"ساڑھی شادی کے بعد۔"

"اچھا چلو بس ایک بار پہن کر دکھا دو پلیز!"

"ساڑھی پہنتے نہیں ہیں 'باندھتے ہیں۔" وہ کھلکھلائی تھی۔

"جملے نہیں پکڑو..... جو کہتا ہوں 'وہ شرافت سے مان لو۔"

"تھوڑا صبر کریں ناں..... شادی کے بعد پہنوں گی ہر روز..... آپ تنگ ہو جائیں گے۔"

"نہیں ہوں گا' شادی کے بعد پہلی بارش میں بھیگتے ہوئے جب میں تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال کر گاؤں گا۔

بادل یوں گرجتا ہے ڈر کچھ ایسا لگتا ہے۔ دھڑام۔

اور تم ڈر کر میرے سینے میں منہ چھپا لو گی..... تب تم سرخ ساڑھی میں ہو گی۔ سمجھیں۔"

"آپ کی ہر تان گانے پر کیوں ٹوٹتی ہے؟"

"دراصل جب بھی کوئی فلم دیکھتا ہوں رومانٹک سونگ تو ہیرو کی جگہ خود کو اور ہیروئن تم میں بدل جاتی ہے۔"

"فلم میں ٹریجک سونگز بھی ہوتے ہیں۔"

"میں اپنی زندگی کی فلم میں کوئی ٹریجڈی نہیں آنے دوں گا۔"

ہلکی سرمئی ساڑھی پر فیبرک پینٹنگ کے گلابی پرل والے چمکیلے پھول بہت فاصلے سے موجود تھے۔ پلو البتہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ گلابی بند کالر کا بلاؤز پہنے گھڑی کا اسٹریپ بند کر رہی تھی۔

تو گویا وہ شادی کر چکی..... وہ ویسی کی ویسی تھی۔ اس نے کچھ دھیان آنے پر تصویریں پلٹیں مگر اس کے ہاتھ ابھی بھی چوڑیوں سے خالی تھے۔ بے حد سونے۔

"چوڑیاں کیسے پہنتی 'وہ تو آپ دلائیں گے۔"

تو کیا اس کا شوہر چوڑیاں نہیں لے کر دیتا یا پھر وہ اب بھی..... نہیں نہیں.....

"جب میرڈ ہے تو تم نے تصویریں کیوں رکھیں؟"

اس کا لہجہ ٹھنڈا برف تھا۔

"ارے کہہ کر آیا ہوں آپا سے۔ عقل دیں اسے..... جان چھڑائے ایسے نام نہاد شوہر سے۔" ندیم نے حقارت سے کہا تھا۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے 'وہ اپنا شوہر کیوں چھوڑے؟"

وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ارے نکاح ہوا ہے۔ رخصتی نہیں ہوئی۔ بیس بائیس برس کی عمر میں نکاح ہوا تھا بیچ میں خاندانی چپقلش آ گئی تو اگلا غصے میں طلاق دے کر غائب ہو گیا۔ تیرہ چودہ برس سے غائب ہے۔ یہ بیٹھی ہے اس کے نام پر....."

"تو جب مطلقہ ہے تو تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے؟"

وہ الجھ گیا۔

"ارے یار طلاق باضابطہ طور پر نہیں دی ناں..... ایک بار ہی علیحدگی کے الفاظ استعمال کیے۔ ابھی تک اس کی بیوی ہے۔ نکاح پر نکاح کرے گی کیا؟

میں نے کہا ہے آپا..... تمہارے لیے چیلنج ہے اسے قائل کرو کہ زندگی برباد نہ کرے..... عدالت سے رجوع کرے تو دنوں میں فیصلہ مل جائے گا۔

"تو آپا قائل کیوں کریں۔ وہ اتنے سال سے کیوں بیٹھی ہے؟" اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔
"یار!" ندیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا.....
"یہی تو ہے مشرقی عورت جو دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ جوانی کے خوب صورت سال برباد کر دیے۔ مگر ابھی اس کا بگڑا ہی کیا ہے۔ مذہب کی اجازت بھی ہے مگر مشرقی عورت کا دل اللہ نے نجانے کس چیز سے ڈھالا ہے اپنی وفا کے معاملے میں بہت ہٹ دھرم ہوتی ہے۔ ایک مرد کا منہ دیکھا اب قبر کا منہ..... بس۔" وہ ستائشی انداز میں کہہ رہا تھا۔
"تمہارا مطلب ہے۔ یہ آج بھی اسی شخص کی بیوی ہے۔ اس کا انتظار کر رہی ہے۔" اس کی آواز دور کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔
"تو اور کیا..... ورنہ مجھے آج تک کسی نے انکار کیا ہے۔" ندیم کا لہجہ زعم سے بھرپور تھا۔

☼ ☼ ☼

"لیکن عید کارڈز ابھی سے کیوں؟ ابھی تو رمضان ہی شروع نہیں ہوئے۔" تمکنت بیگ نے خوب صورت گلابی لفافے کو حیرت سے الٹتے پلٹتے سوالیہ نگاہوں سے مہدی کو اور پھر پوری کلاس کو دیکھا۔
"ٹیچر! اس بار ہم رمضان میں کب مل سکیں گے پورا جون اسکول آئیں گے اور اور جولائی اگست میں چھٹیاں تو عید گریٹنگ کارڈ کیا عید گزرنے کے بعد دیتے ؟"
وہ گلابی لفافے کو بصد احتیاط کھول رہی تھی۔
سرخ گتے پر گلابی پھولوں کے گچھے سے تھے خوشبو شاید پرفیوم کی تھی۔

عید کا دن اور آپ کی یاد
جیسے بنا گوشت کے دھوکا کباب

تمکنت نے ہنس ضبط کی۔
"خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔"
تمکنت کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ "ایسی ہزاروں عیدیں.....؟" بے رنگ، خالی کلائیوں اور سونے ہاتھوں والی..... آنسوؤں سے دھلے چہرے کے ساتھ ہر دستک پر امید بھری نگاہوں سے کواڑ دیکھنا اور ناکام پلٹتی نظروں کا دکھ.....
تیرہ سال میں چھبیس عیدیں..... اور چھبیس چاند راتیں؟؟؟
عذاب راتیں
اور ایسی ہزاروں عیدیں.....؟؟؟
اس کا دل کسی شکنجے میں تھا دھیرے دھیرے ٹکڑے ہو کر گرتا پگھلتا.....
"آپ نے یہ کیوں لکھا عمران؟ خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ کیا پتا میں ایسی عید نہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس کا خود پر ضبط کمال تھا مگر آواز کی معمولی سی لڑکھڑاہٹ بچوں کو حق دق کر گئی۔
عمران بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے۔
"ایسے نہیں لکھتے بیٹا!" اس کا لہجہ تھکن زدہ تھا۔ یوں لکھتے ہیں۔ خدا آپ کو خوشیوں بھری مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ خالی ایسی عیدیں لکھنا تو بددعا کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔" اس کی آواز مدھم ہو گئی۔
"سوری ٹیچر....." عمران کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ "میں آئندہ ایسے ہی لکھوں گا۔"
ہو سکتا ہے یہ عید..... ایسی عید کسی کے لیے بے حد عذاب ناک ہو تکلیف دہ اور وہ سوچتا ہو کہ سب کچھ ہو مگر عید کا دن کبھی طلوع نہ ہو کبھی....."
"بس..... سوری ٹیچر بٹ ہم سب کے کارڈ پر یہ ورڈ تو لازمی لکھا ہوا ہے۔ آپ کارڈ واپس دے دیں۔ ہم نئے کارڈز لائیں گے۔" مانیٹر ثنا پوری کلاس کی ترجمان تھی گویا۔
اٹس او کے بیٹا..... اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ سب کی محبت پر یقین ہے۔ اتنے پیارے اتنے سارے بچے مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ یہ کارڈ تو ثبوت ہیں ناں اب مزید کوئی لفظ نہیں، آپ بکس کھولیں۔"
وہ دوبارہ گھوم گئی۔
"ٹھیک ہے ٹیچر....." ثنا کی آواز ابھری۔ "آپ کارڈز مت واپس کریں۔ بٹ ہم سب لوگ پورے رمضان میں روزہ رکھ کر ہر نماز کے بعد دعا کریں گے کہ ..... اللہ آپ کو..... چلو سب بولو....." اس نے کلاس کو ڈپٹا۔
"اللہ آپ کو خوشیوں بھری..... اور مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین۔"
تمکنت کرنٹ کھائے انداز میں پلٹی۔ بچوں کے چہرے پر شرمندگی ہراس اور..... اور دعا کی کامیابی کا یقین تھا۔
اس کا دل زور زور سے دھڑکا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پھر یکدم ٹھہر گیا۔ پرسکون ہو گیا۔
ایک دم پُرسکون.....
وہ گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔
وہ تیرہ سال سے سینہ تان کر ایک محاذ پر اکیلی کھڑی تھی۔ اس کی ہٹ دھرمی پر اسے کوسنے والے ناکامی کی پیش گوئی کرنے والے بہت تھے۔
کبھی کسی نے کامیابی کے لیے دعا نہیں دی تھی اور اب اچانک اتنی معصوم پاکیزہ فرشتوں جیسی دعا کیا وہ جیت جائے گی؟؟؟

☼ ☼ ☼

رنگ برنگی جھلمل کرتی ڈھیروں چوڑوں کو دیکھ کر حرا، حنا کا دل للچا رہا تھا۔
"سچی خالہ! سب ایک سے بڑھ کر ایک ڈیزائن ہیں اور سیٹ بھی آفت..... بہت اچھے مہنگے والے کڑے ہیں۔ لگتا ہے تمام بچوں نے باقاعدہ پلاننگ سے شاپنگ کی ہے سب ڈیزائن ایک دوسرے سے منفرد۔ کلر بھی ڈفرنٹ اور یہ کڑے تو بہت پیارے ہیں۔"
وہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ پندرہ سولہ برس کی نوعمر الہڑ لڑکیاں تھیں اور اتنے دمکتے کھلکھلاتے رنگوں کو دیکھ کر جوش میں آکر بولتی جا رہی تھیں۔
"خالہ! ویسے یہ حیران کن ہے۔" حنا نے اسے چھو کر متوجہ کیا "پہلے تو اسکول والے پرمیشن ہی نہیں دیتے تھے کہ ٹیچر بچوں سے کچھ بھی لیں۔ گفٹ یا کچھ اور اب کیا اصول بدل گیا.....؟"
"نہیں اصول تو وہی ہیں۔" تمکنت نارمل گفتگو کر کے خود کو حال میں رکھنا چاہ رہی تھی خاموشی اسے ماضی میں دھکیل دیتی تھی۔ جہاں فقط منہ کے بل گر جانے کے بعد کی ٹیسیں اور چوٹیں تھیں۔
"بچے بھی جانتے ہیں ٹیچر کچھ نہیں لے سکتیں۔ اس لیے آج لاسٹ ڈے پر جتھا بنا کر گھر تک آگئیں اور ضد کر کے بلکہ خفا ہو کر یہاں چھوڑ گئیں۔ عید گفٹ کے طور پر۔ اب واپس کیسے ہو۔" وہ بدقت مسکرائی۔
"اور ہیں بھی آپ سب کی موسٹ فیورٹ ٹیچر....." حنا کا انداز تفاخر سے بھرپور تھا حرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔
وہ بجھی مسکراہٹ سے انہیں دیکھتی رہی۔
"ایسا کرو..... یہ سب تم لوگ یہاں سے لے جاؤ۔ برابر بانٹ لو۔ اپنی امی کو بھی دو اور اپنی کزنز اور فرینڈز کے لیے بھی اس بار انہی میں سے گفٹ دینا۔"
دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"ساری ہم لے لیں۔ تو آپ کیا رکھیں گی؟ ہم نے تعریف اس لیے تو نہیں کی تھی کہ....."
اس کے چہرے پر شرمندگی آگئی۔
"ارے نہیں!" تمکنت اٹھ بیٹھی "میں بہت محبت اور خوشی سے دے رہی ہوں بیٹا۔ اور میں کب پہنتی ہوں یہ چوڑیاں کڑے۔" اس نے اپنی دونوں کلائیاں ان کے سامنے کر دیں۔
"کبھی دیکھا ہے مجھے..... اتنے سالوں میں.....؟ ہاں بولو۔"
"خبر نہیں ہے انہوں نے جوگ لے رکھا ہے نہ چوڑیاں کھنکنائیں گی نہ سنگھار کریں گی۔ ہونہہ....."
آپا کا دل جلا جملہ ان کے اندر کی آگ کا مظہر تھا اور اسے آگ لگا رہا تھا۔
"نہ سہاگن نہ ابھاگن..... کنواری بھی نہیں ہیں۔

شادی شدہ بھی نہیں..... نہ تین میں نہ تیرہ میں..... اور بہن تیرہ کی بھی خوب رہی ..... چلو یہ سال گزرے تو چودہ پورے۔"

وہ جائے نماز تہہ کرتی آرہی تھیں۔ بولتے بولتے صوفے میں دھنس گئیں۔

عموماً" اس موضوع پر سرعام گفتگو نہیں ہوا کرتی تھی اور انہیں بچیوں کی موجودگی کا خیال رہا کرتا تھا۔ مگر رنگین چوڑیوں کا ڈھیر بچیوں کا اصرار اور تمکنت کا انکار۔

"آپا پلیز....." تمکنت کا دل پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگا۔

"تمکنت بیوگی کاٹ رہی ہوتی ناں تو دوسرا نکاح پڑھا دیتی جبراً" ہی سہی۔" آپا کا لہجہ تھکان زدہ تھا۔

"آپا.....!" تمکنت ششدر رہ گئی۔ آری کے دانے لکڑی کو کیسے کاٹتے ہیں اس نے اس احساس کو ابھی ابھی اپنے دل پر جھیلا تھا۔

"بددعا تو مت دیں۔"

"تمہیں دعا اور بددعا کے فرق کا کیا پتا تمکنت! لوگ مصلے بچھا اور وضو کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں کسی دن ایسا اہتمام کسی بددعا کے لیے کرنے نہ بیٹھ جاؤں۔" ان کے لہجے کا طنطنہ ٹوٹ گیا۔ تمکنت کا سر جھک گیا۔

"آٹھ سال تک غائب شوہر کے پیچھے نکاح کی اجازت مل جاتی ہے تمکنت!"

"پر یہاں اجازت کون مانگ رہا ہے؟؟؟"

وہ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ڈھیلی ہو گئی۔ اس کے انداز میں آنے والی طمانیت آپا کو ہارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

"اور وہ غائب بھی نہیں ..... سب جانتے ہیں وہ کہاں ہیں۔"

"تو گریبان سے پکڑ کر پوچھتی کیوں نہیں کب تک سزا کاٹنی ہے ناکردہ جرم کی۔"

"تیرہ سال پہلے نہ بتلایا تو اب کون سی قسم دے کر پوچھوں اور جرم بھی معلوم ہے آپا..... "اس" جیسی کہا گیا۔ وہ پوری دیگ چکھنے کو پاگل پن کہہ رہے تھے۔ مثال تو درست تھی۔ شریک کار نہیں تھی پھر بھی قصور وار کہی گئی۔ وہ انسانوں کا سجایا میدان حشر تھا۔ کچھ کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں..... کچھ کا بائیں ..... بھگدڑ کا عالم تھا میرا کہیں گر گیا۔ فیصلہ کرنے والے نے نسب کی بنیاد پر مجھ سے پہلے والے کو جو کچھ کہا وہی سب میرے لیے بھی..... "الفت فیروز بیگ اور تمکنت جلال بیگ..... دفعہ اتنی۔ سزا اتنی کہانی ختم ....."

وہ جملہ مکمل کر کے خود پر ہنسی تھی۔

"وہ تو عیش کر رہا ہو گا۔ گھر بار بسا کر زندگی آگے بڑھالی ہو گی۔ تمہارا ابن باس کب ختم ہو گا؟ تیرہ سال بہت ہوتے ہیں چیلنج قبول کرنے کے لیے..... جا کر بتا دے ایک بار کہ تو اس جیسی نہیں تھی..... نہیں ہے۔ اب کیا بچا ہے آج 35 کی ہے اور اٹھائیس کی دکھتی ہے۔ کل 40 کی ہو گی اور پچاس کی لگے گی۔ تب سینہ تان کر سرخروئی بتانے جائے گی تو تمغہ لگانے کے لیے شانے سیدھے نہ ہوں گے۔ زندگی سے ضد باندھ لی تمکنت جلال! نام دیکھو تمکنت جلال..... اور کیا خوب مٹی پلید ہوئی..... حق ہا....."

آپا تسبیح کو مٹھی میں بند کر کے اے سی سے زیادہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

"غلط کہہ رہی ہیں آپا....." اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ آرکی۔

"ابھی شانے بھی سیدھے ہیں اور آئینے کا سچ سن کر مزا آتا ہے۔ میں اس کا سامنا تب کروں گی جب وہ مداوا کرنا بھی چاہے تو کوئی راہ نہ ہو..... ابھی تو واپسی کے سارے راستے روشن ہیں۔ اس نے مجھے جانے پرکھے بنا میری ذات کا ہر پہلو کسی دوسرے سے منسوب کر دیا تھا۔

اس کی ساری باتیں غلط تھیں۔ میں یہ ثابت کرنے کے لیے زندہ رہوں گی۔ مگر اس کی ایک بات سچ ہے۔ میری اور "ان" کی ضد خون ہی کے ذریعے ایک جیسی ہے۔ مجھے تو اپنے نام کی بھی لاج رکھنی ہے۔

ٹوٹ جاؤں گی پر جھکوں گی نہیں....."

"ٹوٹی لکڑی کس کام کی تمکنت.....؟"

"تو جھکی ہوئی بھی تو ٹھوکروں کی زد میں ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔

"زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں دی گئی۔" آپا کا متاسف جملہ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ لے آیا۔

"ضائع نہیں کر رہی آپا..... ثابت کر رہی ہوں۔ پتا ہے اب درمیان میں کچھ نہیں رہا۔ اتنے سال گزر گئے نہ ظلم یاد ہے نہ مظلومیت نہ منصف کی صورت آشنا نہ مجرم سے کوئی قرابت..... اب تو بس ایک جملہ ہے۔ "یہ کون سی دودھ سے دھلی ہو گی ایسی ہی نکلے گی۔ دیکھتا ہوں تم کتنی اچھی ہو..... اور کتنی الگ۔"

✲ ✲ ✲

"آج بے تحاشا تھک گئیں ..... کام بھی تو بہت زیادہ تھا۔ مگر ذائقہ لاجواب..... انگلیاں چاٹ لینے کو دل کر رہا تھا۔" افضل سعید نے اس کے عکس کو دل میں اتارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"تو چاٹ لیتے۔ کسی نے روکا تھا؟" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

وہ ہری لال مرچ لگ رہی تھی۔ پنڈلیوں پر کسا ہوا سرخ چوڑی دار پاجامہ، پیر میں انگوٹھے والی چپل..... سبز قمیص، سرخ دوپٹا جو گوٹے لپے سے سجا تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھی خود کا ہر پہلو سے ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی سونے کے جڑاؤ گلوبند کو گھماتی۔ شہادت کی انگلی سے جھمکے کی کٹوری کو ہلکا چھوتی اور آئینے میں جھل مل کا رقص دیکھتی۔

"میں پکانے والی کی انگلیوں کی بات کر رہا ہوں۔ آؤ ذرا ادھر۔"

الفت نے آئینے سے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی۔

سفید ملائم لان کے کرتا شلوار میں پشت پر تکیوں کا ڈھیر لگائے افضل سعید لمبی سی ٹانگوں کی قینچی بنائے بہت آرام دہ حالت میں اسے مسلسل دیکھتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

"یاد رکھیے ..... میں بے تحاشا تھکی ہوئی ہوں..... چائے ختم کریں اور کلمہ پڑھ کر سو جائیں۔"

"یار..... چار، چار مددگار تھے تمہارے ساتھ بی بی، نسیم اور چھوٹو اور آج تو ان کی چھوٹی بچیاں بھی تو تھیں ناں۔ تم تو خالی سپروژن کرتی رہیں۔"

وہ گھر میں ہوتے تھے۔ تو ساری توجہ الفت کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر غیر ارادی طور پر رہتی تھی اور یہ سب لاشعوری ہوتا۔

الفت چڑ جاتی۔ "ایسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں سیدھے پڑتے پیر بھی الٹے ہو جائیں۔ ہاتھوں سے چیزیں پھسل جاتی ہیں۔ میں گھر میں برقعہ پہن کر کام کیا کروں گی۔"

"ظالم! تمہیں گھورنے اور فدا ہونے کا فرق بھی نہیں معلوم..... اتنی ناقدری نہ کیا کرو محبت کا جواب محبت سے دینا تو تمہیں نہیں آتا۔ محبت کو محبت ہی سمجھ لیا کرو....." وہ فوراً" ٹوٹے لہجے میں شکوہ کناں ہوتے۔ جواباً" اس کا وہی ناک چڑھا کر ہونہہ۔

"اچھا تو آج اسی لیے برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھے تھے۔ میرے کاموں پر نظر رکھنے کے لیے۔ سپروژن کرنی اتنی ہی آسان ہے تو جناب ہر روز کیوں تھکے آتے ہیں۔ ٹھنڈے پنکھے کے نیچے بیٹھ کر منہ ہی تو ہلانا ہوتا ہے ایسے نہیں ویسے..... یہاں نہیں وہاں ..... ہم شکایت کریں تو چار چار مددگار تھے ناں....." اس نے چبا چبا کر نقل اتاری۔

"اچھا..... اچھا خفا مت ہونا۔ اتنی قیامت لگ رہی ہو۔ میں نے تو پہلے کہا۔ آج تم نے خوب کام کیا۔ تھک چکی ہو، مگر تھوڑی ہمت ہمارے لیے بچا کر رکھتیں ناں۔"

"تو وہ اگلے کون سے میرے ابا کے ولیمہ میں آئے تھے۔ آپ ہی کے ہوتے سوتے تھے۔ یہ بڑے بڑے آدمی..... یہ لمبی عورتیں۔ بندے کی گردن دکھ جائے۔ نظر قدموں سے سفر کرتی اوپر تک پہنچنے میں ساڑھے سات منٹ لگ جائیں۔"

وہ ہر بار ان کے تمام اہل خاندان کی دراز قامتی کے لیے انوکھے ارشادات فرماتی تھی۔

افضل سعید کو اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ کوئی بھی بات.....

وہ بوٹے سے قد کی سنہری گڑیا جیسی تھی۔ وہ جب اسے بیاہ کر لائے تو خاندان میں خوب چرچا ہوا۔

"افضل سعید نے بابرہ شریف سے شادی کر لی ہے۔"

الفت نے سنا تو برا مان گئی۔ "نہ تو میں بابرہ ہوں..... کہہ دیں سب سے اور نہ ہی شریف۔"

"تو کیا تم بدمعاش ہو؟" وہ نئی نویلی دلہن تھی تب افضل سعید کو ٹیکا جھومر اور گھونگھٹ کے بیچ سے پھوٹتی دبنگ آواز مزے دے گئی۔

"کوئی ایسی ویسی....." اس نے عملی مظاہرہ کے لیے گھونگھٹ پلٹ دیا تھا۔

"مجھے کوئی ہلکی نہ سمجھے ایک منٹ میں جان ہتھیلی پر رکھ دیتی ہوں۔ یوں" اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر چٹکیاں بجائیں۔

"نہیں..... آدھا منٹ بھی کافی ہے..... بلکہ کچھ سیکنڈ بھی بہت ہیں۔"

افضل سعید نے حیران سہمی نگاہوں سے سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی۔ بابرہ شریف والی مثال بس ایویں ہی تھی۔

وہ قیامت تھی۔ پانچ منٹ کی قیامت بھی اتنی ہولناک تباہی لا سکتی ہے۔ افضل سعید اپنے دل کو پہلو سے نکل کر اس کے قدموں میں لوٹنیاں لگاتا دیکھ کر ششدر تھے۔

"اب پھر کہاں کھو گئے ہیں۔ چائے ختم کریں میں نے گرم کر کے لا کر نہیں دینی۔ میرا اپنا سر پھٹ رہا ہے اور..... اور یہ کام کرنے کی وجہ سے نہیں ہے وہ آپ لوگوں کی اسی 'بیاسی ——— کی وجہ سے....."

افضل سعید نے چائے کا کپ ہونٹوں سے دور کیا۔ گھونٹ بھی نگلا اور ہنسی بھی روکی۔

"پھر وہی اسی بیاسی..... اسی بیاسی نہیں ہوتا..... اسی تسی ہوتا ہے۔" اسیں..... ہم 'تسیں..... تم کے لیے ہوتا ہے۔ پانچ سال ہو گئے یار! اتنی مشکل نا سمجھنے والی زبان نہیں ہے پنجابی۔"

"تو میں نے کب پنجابی کو برا کہا ہے۔ مگر جب آپ کے خاندان کے لوگ تیز تیز بولتے ہوئے اسی تسی کرتے ہیں ناں تو تراسی 'بچاسی' چھیاسی تک فوراً پہنچ جاتی ہوں ستاسی 'اٹھاسی' نواسی....."

وہ خاصے چڑے ہوئے انداز میں بالوں میں ٹھونکی ہوئی پنیں کھول رہی تھی۔

افضل سعید نے اپنے فلک شگاف قہقہہ کو بمشکل روکا ساتھ کے کمرے میں بچے سو رہے تھے۔

"اوب..... آواب تو ہم اردو بولنے والوں کے ہاں ہوتا ہے آیئے 'جایئے' بیٹھئے۔ آپ لوگوں کی تو گنتی پوری نہیں ہوتی۔ ہونہہ۔"

افضل نے جی بھر اس کو دیکھا۔ وہ ایسے ہی انہیں چڑایا کرتی تھی۔

"مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہے ناں..... اب بس کرو اور لائٹ بند کر دو۔"

"اونہوں..... میں نہیں کر رہی لائٹ بند....." آپ کو سونا ہے تو سو جایئے۔ سارا دن مصروف رہی اتنے دن پہلے سے تیاریاں کیں۔ کپڑے بنوائے ضد کر کے سونے کا سیٹ لیا۔ ایک ایک منٹ انتظار کیا کہ کب ان سب چیزوں کو پہنوں گی اور ابھی تو میں نے خود کو جی بھر کے دیکھا نہیں کہ آج میں کیسی لگ رہی تھی اور آپ کہتے ہیں لائٹ بند کر دو۔"

اس نے ناراضی سے پوری کتھا سنائی اور صاف انکار کرتے ہوئے ان کے لہجے کی نقل اتاری۔

"تو یار آؤ ناں ادھر..... میں بتاتا ہوں ناں تم کیسی لگ رہی تھیں۔ کیسی لگ رہی ہو....." وہ کپ سائیڈ پر رکھ کر اٹھ بیٹھے۔ ہاتھ بڑھایا کہ وہ ہاتھ تھام کر بیڈ تک آ جائے۔

مگر کہاں آ گئے الفت تھی۔ جسے افضل سعید سے ذرا الفت نہیں تھی۔ زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر سنگھار میز کی دراز کھول کر سرخ خوں رنگ لپ اسٹک

پکڑلی۔

رات کے گیارہ بجے یہ میک اپ اتارنے کا ٹائم تھا مگر اس نے پہلے لب وا کر کے لپ اسٹک کی تہہ جمائی۔

بندھے بال کھول چکی تھی۔ پہلے سارے دائیں جانب ڈالے۔ اونہوں ..... پھر بائیں ..... نہیں سیدھے پیچھے چھوڑ دیے۔

"بتائیں کہاں زیادہ اچھے لگ رہے ہیں؟"

"چھوڑو..... یار..... یہاں ..... آجاؤ..... میرے بازوؤں پر بکھیر دو اس سے بڑھ کر اچھے کہاں لگ سکتے ہیں۔"

ان کا انداز اب منت بھرا سا تھا۔ کچھ ہارا ..... ہارا ..... سا۔

"ہاں بس۔ آپ کے یہی الٹے سیدھے مشورے ..... آرام سے لیٹ جائیں۔ مجھے جب سونا ہوگا تو لیٹ جاؤں گی۔" وہ ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اب بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ افضل سعید اس کے مزاج کے سب رنگوں سے واقف تھے۔ بیڈ پر اوندھے گر گئے۔ سر پہ تکیہ رکھ لیا۔ الفت کی گنگناہٹ مگر نمایاں تھی۔

☼ ☼ ☼

"پرسوں تو سب سے ملاقات ہوئی ہے الفت! سب لوگ آئے ہوئے تھے اب آج جانے کی کیا ضد؟"

انہیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ جب والٹ، چابیاں اور چرمی بیگ لیے عجلت کے عالم میں کمرے سے باہر نکلے تو وہ اسد اور احد کی ٹیڑھی مانگوں میں تیز تیز کنگھی پھیر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ بغل میں دبا تھا۔

"تو کیا مطلب اب ماں باپ سے ملنے کے لیے دن اور گھنٹے گننے بیٹھ جاؤں..... اماں باوا سے ملنے تو کبھی بھی جایا جا سکتا ہے۔"

"میں نے یہ کب کہا الفت.....؟" افضل نے لہجہ حتی الامکان پر سکون رکھا۔

"لیکن ابھی اس وقت صبح سویرے..... مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ ملاقات کے لیے کچھ لوگ آئے بیٹھے ہوں گے۔ شام میں لے چلوں گا..... بس۔"

"شام کا کیا مطلب..... اب میں تیار ہو چکی ہوں۔ بچے بھی تیار ہیں۔ آپ نے کیا کرنا ہے ذرا سا گاڑی کو گھمانا ہی تو ہے۔"

"دو بالکل مخالف راستے ہیں۔ آؤٹ آف وے ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہی پروگرام تھا تو صبح سویرے کہتیں، ہم جلدی نکل جاتے۔"

سب بے کار۔ الفت کی دائیں آنکھ مستقل پھڑک رہی تھی۔ یہ اس کی ناگواری اور نفی کی علامت غیر ارادی حرکت ہوا کرتی تھی۔

"ٹی وی دیکھو، ریڈیو سن لو۔ اپنے رسالے نکال لو ..... میں چار بجے تک آجاؤں گا۔ اچھا بچو..... شام میں چلیں گے نانا ابا کے گھر..... بوتل بھی پلاؤں گا اور آئس کریم بھی....."

وہ الفت کو ہدایت دیتے اور بچوں کو پچکارتے۔ الفت کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے تیزی سے باہر نکل گئے۔

دروازے پر آٹومیٹک لاک تھا۔ زور سے بند کرنے پر لاک لگ گیا۔

الفت دروازے کو گھورتی رہی۔

"امی! جوتے اتار دیں....." اسد نے خود اتارنے شروع کر دیے تھے احد بہت چھوٹا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ الفت کا خون کھول رہا تھا۔

بچے کی پکار نے کھولتے خون کو بہنے کا راستہ دیا۔

"خبردار جو جوتے اتارے فوراً" پہنو..... اور یہیں بیٹھے رہو۔" اس نے احد کا بازو نوچا اور اسد کو تھپڑ کے زور جوتا پہننے پر مجبور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اتنی ضد الفت.....!" افضل آنگن میں پڑے تخت پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ الفت تنگ پائنچوں کے گلابی شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹا شانوں پر ٹکا تھا۔ آنگن کے آدھے حصے پر برآمدے کے شیڈ کا

سایہ پڑتا اور آدھے میں دھوپ۔ احد کا چہرہ سائے میں اور پیر دھوپ میں تھے۔ وہ بے سدھ سو رہا تھا الفت موڑھے پر بیٹھی تھی۔

اسد زمین پر بیٹھا کھلونا گاڑی کو چلا رہا تھا۔

"بیٹا! صبح سے ایسے ہی ہو.....؟" نہیں جواب کے اثبات کا یقین تھا مگر یونہی.....

"امی نے کپڑے نہیں بدلنے..... ویے اور شوز بھی ..... منع کر دیا۔"

"الفت! اتنی احمقانہ حرکت ..... میں نے منع تو نہیں کیا تھا۔ مگر تم وقت تو دیکھتیں۔ ٹریفک جام میں پھنسنے کے بعد میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہنچا..... پارٹی انتظار کر کے نکلنے والی تھی۔ دوپہر کو لنچ نہیں کیا اور تم صبح سے اسی عالم میں بیٹھی ہو..... تم نے کڑی دوپہر میں خود کو اس دھوپ میں جھلسایا۔ بچوں سے کس بات کا بدلہ ..... چھ گھنٹے سے بچہ جوگرز میں ہے۔ انگلیاں گل جائیں گی اور تم اپنی حالت دیکھو، کپڑے نچڑنے لگ گئے ہیں۔" وہ تاسف سے بولے۔

او خدا چلو اٹھو..... اندر چلو..... بے وقوف نادان عورت۔"

آگے بڑھ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ تخت کی جانب پلٹے۔ احد کو بہت احتیاط سے اٹھایا۔ شانے سے لگا کر پشت سہلاتے ہوئے۔ نیم تاریک کمرے میں لے آئے پنکھا چلایا۔ بہت آہستگی سے جوگرز اتارے اور اپنی صبح اتاری جانے والی بنیان جو وہیں پڑی تھی اس سے نرمی سے پاؤں پونچھے۔ شرٹ کے بٹن کھولے پھر اپنا گیلا تولیہ اتارے جانے والے کپڑے اٹھائے اور تکیے سیٹ کر کے رکھے۔

"اسد! تم اندر آؤ..... بھائی کے ساتھ لیٹو۔" نہیں یاد آیا۔

"امی..... بھی بیٹھی ہیں۔ امی کو بھی بلائیں۔" وہ سر اٹھا کر انہیں متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا، افضل سعید نے جھک کر اس کا ماتھا چوما.....

"امی کو بھی لاتے ہیں....." وہ باہر آگئے۔

"چلو الفت اٹھو..... " دیکھ لو ذرا، تم سارا دن ضد کے مارے دھوپ میں خود بھی جھلسیں اور معصوم بچوں کو بھی تکلیف دی۔ مجھ پر غصہ تھا تو یار..... مجھ سے لڑتیں، ۔ تم کو بچوں کا احساس نہیں..... پر دیکھو اپنے بیٹے کو وہیں سے کہہ رہا ہے میں کیسے آؤں میری ماں باہر دھوپ میں بیٹھی ہے۔ میں اندر کیسے آؤں....."

وہ موڑھا گھسیٹ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"تم کو کیا لگ رہا ہے۔ تم نے خود کو اذیت دی ہے۔ یار تم لوگوں کی ایک درجہ تکلیف میرے لیے سو درجے کی ہوتی ہے۔ کاش تم دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیتیں یا کسی تھرمامیٹر سے ماپ لیتیں کہ میں خود کو کتنا جھلسا ہوا پیاسا محسوس کر رہا ہوں۔ چلو اٹھو اندر چلو..... حالت دیکھو اپنی۔"

الفت کی جانب سے کوئی جواب نہیں..... نہ کوئی حرکت۔ وہ چند پل تاسف سے اس کی صورت دیکھتے رہے اس کی۔ گندمی رنگت، سرخ ہو رہی تھی اور پسینہ پورے جسم پر گیلاہٹ بن کر پھسل چکا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس اور بالوں کی جڑوں کی نمی دور سے چمکتی تھی۔ اسی کے دوپٹے کو تھام کر اس کے چہرہ اور گردن پونچھی۔

"اندر چلو الفت..... ورنہ۔"

الفت نے پہلی بار زمین پر ٹکی نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ہلکا آسمانی کلف لگا سوٹ چڑمڑ گیا تھا اور اب گرمی کے باعث بھیگا سا تھا۔ الفت کی نگاہوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ افضل جیسے خبرنامہ پڑھ رہے تھے۔

"میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" ان کا لہجہ حتمی تھا اور عمل در آمد پر آمادہ.....

الفت نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ افضل نے پچکارنے کے انداز میں ٹھوڑی چھوئی۔ "اٹھو....." الفت ان کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کہے پر عمل کر سکتے تھے۔ وہ بارہا اس کی ضد سے ہار کر ایسا کر چکے تھے۔

گہرا سانولا رنگ، اونچے لمبے تڑنگے چوڑے شانے کھلے ہاتھ پیر۔ وہ دراز قامت شخص تھے۔ مگر بوٹے

سے قد کی الفت کو وہ قطب مینار لگتے جب اسے گردن اٹھا کر بات کرنا پڑتی۔

اسے اپنے بونے قد پر کوئی احساس کمتری نہیں تھا۔ وہ چست کپڑے چوڑی دار پاجامہ پہنتی۔ فلیٹ دوپٹی اور انگوٹھے والی چپل۔ کھسے اور کبھی کبھار پنسل ہیل۔ وہ اپنے حال میں مست الست بھی بے صرف اپنی پرواہ کرنے والی۔

اور افضل بے حد عام شکل و صورت والے دن بدن ترقی کے راستوں پہ بڑھتے کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ شکل اور قدبت جسے الفت نگاہ غلط انداز جتنی بھی اہمیت دینے کو تیار نہ تھی۔

افضل سعید کے لیے بھی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بے حد نرم خو محبت کرنے والے مہربان انسان تھے۔ انہیں ہر شخص سے محبت اور لگاؤ تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں، دوستوں، پڑوسیوں گھر میں کام کرنے والے ملازمین یا آفس کے ورکرز وہ سب کی پروا کرتے تھے سب سے محبت اور ... الفت سے عشق...

محبت کی انتہا عشق

اور عشق کی انتہا...؟؟؟

ور گزر...؟؟؟؟ پرواہ...

"اٹھ جاؤ الفت... ورنہ جب تک تم یہاں بیٹھوگی میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔"

اور الفت کو قطعاً یہ فکر اور پروا نہیں تھی کہ وہ اس کی خاطر دھوپ میں جلیں گے مگر اس طرح موڑھے پر بیٹھے گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر جب وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر نثار ہوتی نگاہوں سے دیوانہ وار تکتے۔ یہ اسے کبھی برداشت نہیں تھا۔ چھ سالوں میں اس نے کبھی افضل سعید کو یہ حق نہیں دیا تھا۔

اس نے ایک پل بے حد ناراضی، سرد مہری اور احسان جتاتی نگاہوں سے افضل سعید کا چہرہ دیکھا پھر اگلے پل پیر پٹختی اندر بڑھ گئی۔

گر جانے والے موڑھے کو سیدھا کرتے افضل ٹھنڈی سانس لیتے اندر بڑھے۔

✲ ✲ ✲

خود کو بے حد جسمانی اور افضل سعید کو ذہنی اذیت سے دوچار کر لینے کے بعد بھی اس کی ناراضی آسانی سے دور تھوڑی ہوتی تھی۔

افضل سعید من وعن اس کی مان لیتے۔ اس سے معافی مانگ لیتے اپنے کان پکڑتے یا اس کے پیر... اس نے نہیں ماننا تھا تا وقتیکہ غصہ خود بخود ختم ہو جاتا وہ ایسی ہی تھی۔ اب یہ غصہ دو روز میں اترتا یا دس روز میں...

اور ناراضی کا روپ انوکھا...

اس نے سارا گھر سنبھالنا تھا۔ کام وغیرہ پہلے سے بہتر۔ مگر بس انہیں نظر انداز کرنا تھا۔ بات نہیں کرنی تھی۔ الگ کمرے میں سونا تھا اور گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالنا تھا اور ایسے میں افضل کی تمام کوششیں بے کار جایا کرتیں مگر وہ اسے منانے سے باز نہیں آتے تھے۔

ناراضی میں وہ حکم کی غلام کی طرح ہو جاتی جیسے بڑی تابع ہو یا بہت مجبور و بے کس۔ چوں بھی نہ کر سکتی ہو۔

افضل اس کو بازار لے گئے۔ پچھلے ہفتے اسے پانچ تولے کا سیٹ لے کر دیا تھا اور رات ہی کو وہ کہنے لگی کہ سیٹ کے ساتھ کڑے بھی ہوں تو مزا آجائے۔

وہ منہ سے باقاعدہ فرمائش نہیں کرتی تھی۔ مگر افضل کے لیے یہ جملہ کافی تھا۔ اسی وقت ارادہ باندھ لیا اور وہ جیولر کے پاس بیٹھے کڑے پسند کر رہے تھے خود اس لیے کہ وہ مارے بندھے بیٹھی تھی۔ شیشے کی دیواروں کو چھت کو، آرائشی فانوسوں کو دائیں بائیں ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ سوائے کنگنوں کے... چونکہ اسی جیولر سے خریداری کی جاتی تھی سو وہ پہچان رہا تھا۔ افضل صاحب کی بیگم ناراض ناراض لگتی تھیں اور ایک پیسے والا آدمی تین چار تولے کے کڑے تو خرید کر دے ہی سکتا تھا۔

افضل نے اس کی مسلسل عدم توجہی سے سیلز مین کی مشکل دور کی۔

"وہ جو ہم نے سیٹ بنوایا تھا اس کے ساتھ کے کڑے دے دو۔ کوئی مسئلہ ہوگا تو بعد میں دیکھ لیں گے۔"

اسد نے ماں کی انگلی تھام رکھی تھی اور احد کبھی پیدل چلتا کبھی باپ کی گود میں چڑھ جاتا۔ افضل بچوں کے کپڑوں والی دکان میں گھس گئے۔

یہاں نہ چاہتے ہوئے غیر ارادی طور پر بھی الفت دلچسپی لینے پر مجبور ہو جایا کرتی تھی۔ سو یہی ہوا۔ وہ کپڑے نکلواتے نکلواتے بھول بھال گئی سب خفگی۔

شاپنگ کے بعد بہترین کھانا الفت کے پسندیدہ اسپاٹ سے۔

خفگی بھی موم کی طرح ہوتی ہے توجہ کی گرمائش اسے پگھلا دیتی ہے۔ اور توجہ بھی افضل سعید کے جیسی... تو پھر...

"آپ کے خیال میں پیسے سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے اور یہ دو کڑے اور یہ چند تھیلے... میری اس دن کی تکلیف کی بھرپائی کر سکتے ہیں۔" وہ اپنی نرم گندمی کلائیوں میں کڑے گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

چار تولے کے کڑے اور تین بہترین بوتیک کے کپڑے اور بچوں کی شاپنگ۔ (چند تھیلے) افضل نے سگرٹ کی راکھ ایش ٹرے میں مسلی۔

"یہ سب میری محنت اور خون پسینے کی کمائی ہے الفت! مگر اس پسینے سے بہت ارزاں جو تم نے اس دن ایک احمقانہ ضد میں بلاوجہ بہایا۔"

"آپ کو باتوں سے جیتنا آتا ہے۔"

"کیا تمہیں جیت لیا...؟" وہ بہت امید سے ترنت بولے تھے۔

"میری جیت یا ہار... میرے پاس فیصلے کا اختیار کب تھا۔"

"اور اگر ہوتا تو...؟"

"تو کم از کم آپ کا نام نہ لیتی۔" (اس نے ہمیشہ یہی کہا تھا)

"وہ تو خیر مجھے معلوم ہے مگر کس کا نام لیتیں یہ نہیں بتایا؟"

"کسی انسان کا... آپ تو جن معلوم ہوتے ہیں اتنے اونچے لمبے کالے دیو۔" اس نے ہمیشہ کی طرح کا مخصوص جواب دیا۔

افضل اس کے جواب پر ہمیشہ محظوظ ہوتے تھے۔ دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

"دل بھی اتنا ہی بڑا ہے۔"

"یہ بھی خوبی رہی ہوگی؟"

"تو کیا نہیں ہے...؟؟؟"

"ہوگی مگر مجھے اس خوبی سے کیا لینا دینا۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا اور تکیہ درست طور جماتے ہوئے نیم دراز ہوگئی۔ اس نے پیر سے پائنتی پڑے تھیلوں کو سرکا دیا تھا۔ ایک شاپر نیچے بھی گر گیا۔

افضل سعید نے اک طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب کروٹ بدل لی وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھے۔ اس کے سراپے کو جاں نثاری کے عالم میں تک رہے تھے۔

"اب وہ بھی کہو کہ ابا میاں نے تمہارے ساتھ کیا کیا...؟" وہی قصہ جو اس نے گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا۔

"آپ کو اس قصے میں نجانے کیا مزا آتا ہے۔" وہ چڑی۔

اس نے تو دولہا کو بتانے کے لیے خوب پلاننگ کر کے سچا جھوٹا قصہ گھڑا تھا۔

✲ ✲ ✲

آبائی زمین تھی مگر خود بوتے یا ٹھیکے پر دیتے۔ دونوں صورتوں میں بس سال بھر کے دانے ہی مل پاتے۔ بیماری، خوشی۔ غمی تعلیم تربیت اچھی زندگی گزارنے کے ڈھیروں خواب اس قلیل رقم میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

اباجی نے بہت کم عمری میں ان سے بڑی دونوں بہنوں کو بیاہ دیا تھا۔

اب وہ دو بہنیں اور دو چھوٹے بھائی رہ گئے۔ وہ آبائی پیشے کو ضرور اپنا لیتے۔ جی توڑ محنت کرتے مگر اتنا نہیں کما سکتے تھے کہ خون تھوکتی ماں کا علاج کروا سکیں۔ بیاہی اور کنواری دونوں بہنوں کا بوجھ اٹھائیں اور

چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی لکھائی۔

کراچی ہر دور میں محنت کرنے والوں کے لیے پارس پتھر رہا ہے۔ سو وہ بھی ایک بیگ میں دو جوڑے ڈال بہنوئی جو تایا زاد بھائی بھی تھا کے پاس چھڑوں کے کوارٹر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ابتدائی طور پر محنت مزدوری کی مگر جلد ہی لکھائی پڑھائی کا چھوٹا موٹا کام ملا تو عزت مرتبہ اور پیسہ نظر آنے لگا۔

تینوں چیزوں کو ابھی نظر بھر کے دیکھا تھا کہ اباجی کی شدید بیماری کا تار ملا وہ ہر چیز چھوڑ واپس لوٹے۔ تمام جمع جتھا لگایا مگر ان کا آخری وقت آچکا تھا۔ اب کی بار جب لوٹے تو دونوں بہنیں اور چھوٹے بھائی ہمراہ تھے۔

سیدھی سادی بہنیں اردو سے انجان۔

اور بھائی بھی ویسے ہی اسکول میں پڑھتے تھے مگر کراچی کی ہر شے نئی تھی۔ اب ایک اچھے رہائشی علاقے میں گھر لیا گیا۔

سب سے بڑی بہن اور بہنوئی کو اپنے ہمراہ رکھا' گھر کے بڑے کی حیثیت سے۔ اب دن اور رات کی ان تھک محنت تھی۔ اپنا مستقبل' اپنی خوشی' اپنے خواب اور آرزوئیں تمام کی تمام بہن بھائیوں کے چہروں میں کھوجنے کی عادت ہو گئی۔

دوسروں کے لیے کام کرتے کرتے نجانے کب اپنا ذاتی کام شروع کر دیا پھر اسے جمانے کی جدوجہد بہنوں کی تعلیم اور شادیاں... ایک گھر بھی خرید لیا۔ بائیک بھی...

الفت کے ابا میاں ان کی چھوٹی بہن کو قرآن پڑھانے آتے تھے۔

وہ ساٹھ کے ہندسے سے چھوتے بزرگ شخص تھے۔

دبلے پتلے' شیروانی' سفید شلوار میں ملبوس... کسی دفتر میں حساب کتاب دیکھتے تھے اور تین بجے فارغ ہونے پر گھر جا کر درس قرآن دیا کرتے۔ ان کے پانچ بچے تھے۔

اللہ نے انہیں ایک عمر گزر جانے کے بعد اچانک اولاد کی دولت دے دی تھی۔ الفت ان کی تمام آرزوؤں کا منبع دعاؤں کی تکمیل اور اللہ کا تحفہ بن کر ان کے آنگن میں اتری تھی۔

ساری زندگی اولاد کے لیے ترسے ہوؤں کے لیے یہ نعمت عظیم تھی۔ وہ اکلوتی بیٹی کو حتی الوسع ناز و نعم سے پال رہے تھے۔

زندگی بے حد پر سکون تھی مگر دو بیٹوں کی آمد ایک کنکر کی طرح تھی۔ پھر دو بیٹیاں مزید... دونوں چھوٹی بچیاں تو بلاشک و شبہ ان کی نواسیاں پوتیاں کہلائی جاسکتی تھیں۔

محدود آمدنی تھی اتنی مہنگائی کا زمانہ نہیں تھا سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔ مگر فیروز بیگ کو ایک فکر لگ گئی' وہ اتنی عمر پا سکیں گے کہ بچوں کو پال سکیں اتنی ہمت کہاں سے لائیں گے۔ بچوں کی عمر وہ تھی کہ باپ لوہا توڑ اور زمین پھاڑ کر محنت سے رزق لائے اور وہ عمر کے اس دور میں دن بدن تنزلی کی جانب گامزن تھے۔

یہ احساس بہت شدید تھا۔ ہر بیماری موت کی دستک معلوم ہوتی۔ رات کو بستر پر جاتے تو لائن سے سوئے بچوں پر نگاہ پڑتی تو کپکپا کر رہ جاتے اگر جو وہ صبح نہ اٹھے۔ اور فکر بھی دو طرح کی تھی۔ بھرپور جوان ہوتی الفت آرا۔

اگر وہ نہ رہے تو الفت کے ہاتھ کون پیلے کرے گا۔

اور اگر وہ نہ رہے تو... چھوٹے... بیٹے پندرہ' چودہ برس اور چھوٹی بیٹیاں دس اور بارہ برس کی تھیں۔ ان چھوٹوں کے روٹی پانی کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔

افضل سعید کے گھر میں پہلے کوثر درس لینے لگی پھر اس سے بڑی کنیز فاطمہ... ان دونوں کی خوش الحانی دیکھ کر ایک روز خود افضل سعید بھی پہلا سپارہ کھول بیٹھ گئے۔

چھ ماہ کے اندر وہ بہت خوب صورت قرات سیکھ گئے اور قرآن پاک پڑھتے ہوئے خود اپنی آواز سن کر انہیں جو خوشی ملتی۔ دنیا کی ہر مسرت ان کے سامنے ہیچ تھی۔

انہیں خود پر بے پناہ فخر محسوس ہوتا اور استاد پر پیار آتا۔ معاوضہ ٹھیک ٹھاک دیتے تھے۔ مگر اس احسان کا بدل وہ معاوضہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ استاد کے گھر راشن ڈلوانے لگے۔ کبھی خود ان کے گھر نہ گئے' ملازم کے ذریعے... درس مکمل ہونے پر فیروز بیگ کا آنا تو بند ہوا مگر افضل سعید کا جوابی عمل جیسے تمام عمر کے لیے جاری رہنا تھا۔

اور پھر انہیں ایک خبر ملی کہ ان کی محترم استاد فیروز بیگ... دل کے دورے کے باعث اسپتال میں پڑے ہیں... وہ اپنے باپ کو کھو چکے تھے اور فیروز بیگ روحانی باپ تھے۔ جب مشینوں میں جکڑے فیروز بیگ کو ہچکیوں سے روتے دیکھا تو پریشانی کی انتہا نہ رہی' وہ ناقابل فہم خود کلامی کرتے تھے۔

''الفت کا کیا ہوگا۔ بیٹے چھوٹے' نابالغ' ناسمجھ۔ بچیاں بہت چھوٹی... بیگم بیماری کی پوٹ۔ زمانے سے ناآشنا عورت... خود غرض نہ کہنا افضل... تم سے... نیک بچہ... پوری دنیا میں دوسرا نہیں۔ تت... تم... الفت کا... الفت کا...''

افضل سعید کو زمانہ شناسی کا دعوا نہیں تھا۔ وہ کاروبار کی دو جمع چار کرتے تھے سیدھے سادے نیک۔ مگر ادھورا رہ جانے والا جملہ... انہوں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں... ہاں میں... الفت کا... بالکل...''

وہ الفت کا نام ہی جانتے تھے وہ کون ہے کیسی ہے؟ کیسی ہو سکتی ہے اس سے غرض نہیں تھی۔

اور اپنی ذمے داریوں میں گم افضل سعید کی زندگی میں اس رنگ کی گنجائش کب تھی۔

اپنی شادی کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ ہاں کبھی کسی کے احساس دلانے پر وہ سوچتے' اب شادی کی عمر کہاں رہی۔ ابھی زندگی میں شادی سے زیادہ اہم ذمہ داریوں کی طویل فہرست تھی۔ کاروبار بڑھانے کے منصوبے اور... اور...

وہ وعدہ کر کے آ گئے۔ ساری رات ادھیڑ بن میں رہے۔ کیا فلموں کی طرح اسپتال میں نکاح ہوگا اور اگر فیروز بیگ رات و رات ہی خدانخواستہ... لیکن آگے کی کہانی اب الفت کی زبانی تھی۔

''میں ابا میاں کے لیے کھچڑی اور یخنی بنا کر بیٹھی تھی اور ابا میاں نے اسی کھچڑی پر میرا نکاح پڑھا دیا۔''

نہ مہندی' نہ مایوں نہ سہاگ کے گیت... اماں نے نجانے کون سے کون سے ٹرنک سے نڈیوں کے بدن کی بُو سے بھرا غرارہ پہنا دیا۔ لو جی میں تیار... ساری زندگی کہا میری بٹی کو بیاہنے راجکمار آئے گا گھوڑے پر سوار۔ ڈگڑگ۔ ڈگڑگ کرتا...

اب اباماں کو راجکمار اور چمار کا فرق نہیں معلوم تو... میرا نصیب۔

افضل سعید کی اردو میں روانی الفت کی سات سالہ رفاقت نے بعد میں پیدا کی ورنہ وہ ذات کے راجپوت تھے۔ ان کے ہاں جُوڑے چمبارے کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مگر اس وقت نو بیاہتا کی ڈگڑگ ڈگڑگ چلتی زبان کو دیکھ رہے تھے۔

''اچھا۔ چلو مان لیا راجوں مہاراجوں کا زمانہ نہیں رہا...'' وہ کہہ رہی تھی۔

افضل نے ایسی فصاحت و بلاغت سے بھرپور روانی اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھی نہ سنی۔ باقاعدہ عقیدت مندی کے انداز میں دو زانو بس سنتے جا رہے تھے۔

'' ان کی بڑی بہنیں... ہر بات کے جواب میں جی وریا (جی بھائی) کہتی تھیں۔

اور چھوٹی دونوں جی بھائی جان... ضرورتاً' بولتیں آپس میں بات کرتیں تو مدھم لفظ تول تول کر... جملے جوڑ جوڑ۔

پر ادھر کوئی اصول نہیں تھا۔ جو جیسے دماغ میں آ رہا تھا زبان سے چھوڑا جا رہا تھا۔

'' تو کوئی وزیر زوال پذیر... کوئی صدر' ملک بدر ڈھونڈ لیتے... کوئی وزیر اعظم... ہاہ۔''

'' ملک کی وزیر اعظم اس وقت ایک عورت ہیں... الفت... اور صدر... صدر غلام اسحاق خان... تم پاگل تو نہیں۔'' افضل بھونچکے رہ گئے۔

'' افوہ...!'' اس نے اپنے سر کو پکڑا۔

'' یہ تو میں نے محاورتاً' کہا ہے۔ میں کوئی لیڈی ڈیانا کی طرح پاگل نہیں نہ دولت کی لالچی کہ چارلس جیسے بڈھے بندر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں؟''

ہاہ ٹھنڈی سانس۔۔۔" ہماری بھی وہی مثال۔۔۔ بس رنگ کا فرق ہے باقی تو۔"

اس نے بے حد بچکانہ الہڑ انداز میں ہونٹ لٹکائے۔ افضل سعید کا قہقہہ چھت سے چپک گیا۔ انہیں اس کے بے حد قابل اعتراض جملوں پر قطعاً" غصہ نہیں آ رہا تھا۔ جیسے کسی چھوٹے بچے کی معصوم احمقانہ ادھر ادھر کی لاف زنی پر بڑے انہیں سینے سے لگا کر چوم لیتے ہیں۔

الفت کی ادائیں بالکل ویسے ہی انہیں اکساتی تھیں کہ۔۔۔ بس۔

"ایسا ہولناک نقشہ کھینچا کہ خوف سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ بیٹا میرا بڑھاپا۔۔۔ اور تمہاری جوانی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ میرا ہارٹ اٹیک۔۔۔ ایٹم بم اٹیک کی طرح تم سب کو تباہ برباد کر دے گا خصوصاً" مجھے۔۔۔ یعنی الفت بیگ کو۔۔۔ ہونہہ!

ایک تو سر پر پڑے گٹھڑ کی طرح شادی کر دی اچانک۔۔۔ چلو میں مان گئی۔۔۔ اوپر سے پرانی فلموں کی طرح سینہ مسل مسل کر وہ ڈائیلاگ بولے کہ۔۔۔ اچھی ہوئی یا بری۔۔۔ میں تو شادی انجوائے ہی نہ کر سکی۔۔۔ ہر دستک پر لگتا۔ ابا میاں کی ہی خبر آئی ہوگی۔"

ہچکی اور نادیدہ آنسو پونچھتی۔۔۔

"ایسے نہیں کہتے الفت۔۔۔!" افضل سعید کی آنکھیں پہلے ہی ابلی پڑی تھیں۔ فوراً" ٹوکا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ کوئی ہارٹ اٹیک وٹیک نہیں ہوگا۔۔۔ ابا خوب جئیں گے۔۔۔ تین ہارٹ اٹیک کا کہتے ہیں۔۔۔"

"ابھی تو ابا میاں کی دو بیٹیاں باقی ہیں۔" اس نے بے فکری سے آنکھیں میچیں۔

"الفت۔۔۔!" افضل سعید کا سر چکرا گیا۔۔۔

"ویسے ایک بات بتائیے۔ یہ ڈیانا نے صرف شہزادی بننے پیسے ویسے کے چکر میں اس اود بلاؤ سے شادی کی تھی ناں۔۔۔ اب آئے دن لڑتے ہیں۔"

وہ کس وقت کہاں سے کہاں نکل جائے۔ افضل سعید نے دیکھ ہی لیا تھا۔ اس کا سوال پر اسرار سا ٹوہ لیتا ہوا تھا۔

افضل نے شانے اچکائے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر سنا ہے ملکہ کو ایک کم عمر دوشیزہ کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی مرضی چلائی تھی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں ڈیانا کی بے پناہ خوب صورتی وجہ انتخاب تھی۔ ملکہ کے پاس تاج برطانیہ ہے۔۔۔ مگر خدا نے اتنا بڑا مرتبہ دینے کے بعد خوب صورتی کا خانہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ ڈیانا کے ذریعے حسن و جمال کو محل میں جبراً" گھسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ آنے والی نسل ماں کا نقشہ لائے۔۔۔ جس طرح دولت' عزت و مرتبے میں شاہی خاندان اعلا ہے اگر شکل و صورت بھی مل جائے تو۔۔۔ کیا کہنے۔"

الفت کے لیے یہ گویا اندر کی خبریں تھیں۔ آنکھیں پھیلائے ہمہ تن گوش تھی۔ افضل کے جملے کے اختتام تک اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ آرکی۔

"آپ نے بھی تو میرا انتخاب اس لیے نہیں کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ اپنے خاندان میں تھوڑی بہت خوب صورتی لے آئیں۔ ہی ہی ہی۔" افضل سعید اس کے جملے کی گہرائی میں پہنچے تو دل کھول کر ہنس پڑے۔

"میں نے تو تمہیں گھونگھٹ اٹھانے کے بعد دیکھا تھا یار!" ہنسی کے دوران بتایا۔ "اور ہم کم از کم شاہی خاندان جتنے بھی بدشکل نہیں ہیں۔"

اس نے بغور ان کی صورت دیکھی اور پیٹ پکڑ کر دوہری ہو گئی۔ ہی ہی ہی۔۔۔ ہو ہو۔ افضل سعید چمکتے موتیوں کی قطار کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

افضل سعید کا تمام خاندان گہری سانولی رنگت' لمبے قد اور چوڑے شانے۔۔۔ کھلے ہاتھ پیر۔ وہ اسمارٹ آدمی تھے۔ جسم پر چربی نام کو نہ تھی کسرتی جسم۔۔۔ ہاں اگر کبھی موٹے ہو جاتے تو بقول الفت دیو معلوم ہوتے۔

اور اس نے تو کہہ ہی دیا تھا۔

وہ گاؤ تکیے کے سہارے افضل کے بازو کے گھیرے میں تھی۔ ان کا بایاں بازو اس کے شانے کے گرد لپٹا تھا اور دائیں ہاتھ میں الفت کے دونوں ملائم ہاتھ تھام رکھے تھے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہے تھے۔

سنگھار میز کے بڑے آئینے میں اپنا عکس دل کو خوشی سے بھر رہا تھا۔ وہ وقتاً" فوقتاً" آئینے کی جانب دیکھ لیتے۔

ان کی نظروں کے تعاقب میں جب الفت نے سین دیکھا تو بے ساختہ بول پڑی۔

"دیو کے قبضے میں پری۔"

پھر اپنی تشبیہ پر خود ہی مزا لیتے ہوئے ان ہی کی گود میں سر گھسا کر ہنستی چلی گئی۔

اس کا ہر انداز افضل کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ خود بھی خوب ہنسے۔۔۔ انہوں نے تو بعد میں دیکھا تھا۔ مگر خاندان کی عورتوں نے اگلے منٹ ہی میں کہہ دیا تھا۔ "دلہن بہت کم عمر ہے۔ بہت ہی چھوٹی ہے۔"

افضل گھبرا گئے۔ غرارے میں لپٹی گٹھڑی انہیں بہت چھوٹی معلوم ہوئی تھی۔ مگر۔۔۔

"کیا واقعی۔۔۔ ایک مرتبہ دیکھ لینا چاہیے تھا۔۔۔ یا پوچھ ہی لیتے۔"

وہ پینتیس کا ہندسہ عبور کرنے والے تھے تو کیا دلہن پندرہ کی ہے؟ ارے مولا۔۔۔ وہ ڈرتے کانپتے اندر گئے تھے۔ دلہن کم عمر تھی ان کے مقابلے میں۔ مگر اتنی چنی کاکی بھی نہیں۔ وہ تیسویں برس میں تھی۔ مگر دبلا پتلا سراپا۔ سانچے میں تراشا پیکر بوٹا سا قد۔

سب سے بڑھ کر عمر چور۔۔۔

اور سونے پہ سہاگہ بچکانہ انداز۔ منہ بسورنا باقاعدہ انگلیوں سے بات بے بات سچے جھوٹے آنسوؤں کو پونچھنا (افضل کا دل کٹ جاتا)

لاابالی پن۔۔۔ لاپروائی۔۔۔ الہڑ دوشیزہ کی سی ادائیں۔

اس کی احمقانہ گفتگو۔۔۔ طنزیہ کاٹ دار جملے بھی لہجے کے اتار چڑھاؤ کے باعث بے ضرر معلوم ہوتے۔ یہی باتیں' طعنے وہ کسی اکھڑ دماغ عقل رکھنے والے کے سامنے کرتی تو اگلا گردن دبوچ دھکے دے کر نکال باہر کرتا۔

مگر افضل سعید نے پہلے ہی روز اس کی کم عمری' بھول پن' نادانی اور معصومیت کو مان لیا تھا۔ وہ چاروں شانے چت تھے۔

✲ ✲ ✲

"الفت! مجھے یہ حرکت قطعاً" پسند نہیں۔۔۔ میں تمہیں پہلے بھی دو چار مرتبہ صاف صاف الفاظ میں بتا چکا ہوں۔۔۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں آپ تو کہیں گے یہ۔۔۔ اتنا بہت سا سامان بھرا ہے اگر میں نے تھوڑا بہت دے دیا تو کون سی خزانے میں کمی ہو گئی۔ ہاں بولیے۔"

الفت نے ڈھیلا پڑنا تو کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو اپنے نظریات کے حساب سے توڑ مروڑ دیا کرتی تھی۔

"خزانے میں کمی کی بات نہیں ہے۔۔۔ الفت!" افضل زچ ہو گئے۔

غصہ' بے بسی' برداشت۔

الفت کی حرکت پر غصہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ غصہ کی شدت کی وجہ الفت کا نہ سمجھنا اور مستقل ہٹ دھرمی تھی۔ اور انہیں سب برداشت تھا یہ حرکت کبھی برداشت نہ ہوتی تھی۔

"میں تمہیں ہفتے بھر کا گوشت' سبزی' راشن اس لیے لا کر دیتا ہوں کہ تم کہاں خوار ہو گی۔ میں گھر میں ہوتا نہیں' اظہر اور اکمل کالج اور بعد میں آفس آتے ہیں۔ تمہیں پریشانی ہو گی۔ کون لا کر دے گا اور تم۔"

"حالانکہ میں سب لا سکتی ہوں۔" اس پر خاک اثر نہیں تھا' فوراً" بدتمیزی سے جتایا۔

"الفت۔۔۔ بس کرو۔ مجھے نہیں پسند کہ تم معمولی معمولی چیزوں کے لیے گلے محلے کی پرچون پر جاؤ یا۔۔۔"

"ہاں تو اگر جاؤں گی تو خریداری کے لیے جاؤں گی ناں میں کون سا دکان دار کے ساتھ یارانہ جوڑ رہی ہوں۔"

"پھر الٹی بات...."

"آپ کو سارا غصہ یہی ہے کہ آپ کے پیسے سے لایا سامان میں نے اپنی اماں کو کیوں دے دیا.... اتنے بڑے سینے میں دل چیونٹی جتنا۔ ہونہہ۔"

اس نے صریحا" الزام لگاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا گلاس بیڈ پر دے مارا تھا۔ وہ جگ بھر کے دودھ روح افزا لے کر بیٹھی تھی۔

افضل کی ساری باتوں کے دوران گھونٹ گھونٹ یوں بھر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہو.... افضل نے آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچایا تھا۔ وہ صبح دس بجے جا کر چار پانچ بجے آتے تھے۔

بچے گہری نیند میں سو رہے تھے۔ الفت کے ہاتھ میں دودھ روح افزا کا جگ تھا۔ کرسی پر پیر رکھ کر بیٹھی تھی۔ پورا جگ ڈکار چکی تھی۔

"مجھے خود بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے بھوک کے سوال پر جواب دیا۔

تو یار کھانا لگاؤ میں ہاتھ دھوتا ہوں۔ اکٹھے کھائیں گے۔" افضل خوش ہوئے۔ انہیں ساتھ ساتھ کھانا کھانا پسند تھا مگر الفت ایسے چونچلے نہیں پالتی تھی۔ اس نے کبھی انتظار نہیں کیا جب دل چاہا کھا لیا....

"کیا لگاؤں.... کچھ پکایا ہی نہیں۔" اس نے صفائی سے کہا۔

"یہ کیا الفت.... کیوں نہیں پکایا۔ سب کچھ تو موجود تھا۔

"اماں آئی تھیں ملنے.... واپسی پر سبزی گوشت کے لیے مارکیٹ کے لیے نکلنے لگیں تو میں نے کہاں کہاں گرمی میں دکان دکان پھریں گی۔ میں نے خود ہی تھیلے باندھ دیے۔"

افضل نے پہلے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر ان کا پارہ اوپر چڑھنے لگا۔

"سب کچھ دے دیا الفت! ایک ٹائم کی ہانڈی چڑھا لیتیں۔"

"سب کچھ دے دیا الفت....؟" اس نے ہاتھ نچا کر نقل اتاری۔

"آپ کی کمائی تھی میں نے لٹا دی۔" اسیّ غریب لوگ اور تسی (آپ) مہان.... ہونہہ!"

"الفت! میں یہ سب نہیں کہہ رہا۔ تم بات کو غلط رخ پر کیوں لے جاتی ہو....؟؟؟"

"اپنی مرضی سے لٹاتے رہیں گے۔ فلانے کی نیاز ڈھمکانے کا چہلم.... صدقے' زکواۃ اب میں نے کچھ اپنی مرضی سے کیا تو.... آگئے۔"

"خدا کا خوف کرو.... نیاز.... صدقے زکواۃ کا نام کیوں لیا۔ زیر کفالت لوگوں کو کب دیتے ہیں خیرات .... تمہارے ماں باپ سے میرا ذمے داری کا رشتہ ہے تم نے اتنا غلط لفظ استعمال ہی کیسے کیا۔ لاحول ولا۔

"ہونہہ!" الفت نے ناک سکوڑی۔

"تمہارا طریقہ غلط ہے۔ میں ہر مہینے کسی کے علم میں لائے بغیر ان کے گھر ہر شے پہنچا دیتا ہوں اور تم نے ٹھیک کیا۔ اماں دھوپ میں کہاں جاتیں۔ لیکن اللہ کی بندی.... اپنا شام تک کا تو بندوبست رکھتیں۔ کچھ بھی دال چٹنی بنا لیتیں۔ ہم کھانا کھاتے۔ سورج ڈھلنے کے بعد مارکیٹ جاتے۔ سب کچھ لے آتے۔ اب پیٹ خالی.... دماغ گرم.... بی پی لو ہو گیا۔ قدموں میں سکت نہیں ہے۔ لڑنے بیٹھ گئے۔"

افضل نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ الفت کے چہرے پر غصے کا تناؤ ابھر رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے ہر تاثر کو پہچان لیتے تھے۔ وہ غلطی پر بھی مگر ان کے سر چڑھنے والی تھی۔

وہ فریج کو ٹٹولنے لگے۔ احد کے کیلے پڑے تھے ایک کھا لیا.... بریڈ کے ہفتے پرانے سوکھے سلائس کو لے کر کچن میں گئے۔

دودھ کی خالی پتیلی کے پیندے اور دیواروں پر جمے ملائی نما دودھ سے سلائس لگا لگا کر حلق سے اتارے۔

باہر کی گرمی اور اندر کی بحث.... وہ نہانے اور کپڑے بدلنے غسل خانے کی جانب بڑھے پھر مارکیٹ تک جا کر کچھ پکا پکایا لائے اور باقی سامان بھی....

سر پر پانی بہا بہا کر خود کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔ مین دروازے کے کھل بند کی آواز آئی۔ کوئی محلہ پڑوس کا ہو گا۔

مگر دوسری آواز قابل تشویش تھی۔

وہ ترنت باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ذرا سی جھری سے دیکھا۔

اسد کو گھسیٹتے احد کو بمشکل شانے سے لگائے وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ پھٹپھٹا تا رکشہ نظروں میں آگیا تھا۔

وہ خفا ہو کر میکے چلی گئی تھی۔

✵ ✵ ✵

ان کی کاروباری مصروفیات مکمل توجہ کی طالب تھیں۔ مگر الفت کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا دونوں سبب توجہ کو بٹا دیتے تھے۔

اسے ناراض ہونے کے لیے کسی بھی بڑے واقعہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اسے منایا جائے۔ اس کی پروا قطعا" نہیں....

لیکن افضل کے لیے یہ دونوں باتیں بہت معنی رکھتی تھیں۔

اور کچھ آج کل اس کی حالت.... وہ ضد کے عالم میں خود پر جبر کرتی اور تکلیف افضل سعید کو اپنے دل پر جھیلنی پڑتی۔

وہ اگلے دن ہی صبح صبح تھیلوں سے لدے پھندے سسرال پہنچے۔ بچے انہیں دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ ساس نے والہانہ استقبال کیا۔ الفت انہیں دیکھتے ہی چھت پر چلی گئی۔

"بس میرے پیچھے پڑ گئی۔ ورنہ بیٹے! اللہ کے فضل اور تمہاری مہربانی سے کب کسی چیز کی کمی رہی۔ پڑوسی کے بچے سے رکشہ منگوا دیا اور اسی کے ساتھ مل کر تھیلے رکھنے لگی۔"

وہ اتنی اونچی آواز میں بول رہی تھیں کہ الفت کے کانوں میں پڑ جائے۔

"عقل کی اندھی ہے' اول تو دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ہانڈی چڑھا دیتی ہوں۔ چار تو چپاتیاں ڈالنی ہوتی ہیں۔ منع کر دیا۔ سارا گھر بکھیر کے بیٹھی تھی۔ تم ماسی رکھ دو ایک تو اس سے کام ہوتا نہیں دوسرے کرتی بھی نہیں۔ لاپروا ہے ناں...."

"مجھے شرمندہ کرتی ہے۔ اب یہاں آ کر کیا کیا نہ کہا ہو گا۔ استاد صاحب کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں.... اور آپ سب لوگ...."

"ناں' ناں.... تم فکر نہ کرو۔" اماں ان کے نزدیک جھک آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا پھر پراسرار انداز میں سرگوشی کی۔ "مجھے پتا ہے جھوٹ بولتی ہے.... جھوٹی ہے ناں۔"

"اماں...." ان کا سچا معصوم انداز.... افضل سعید نے بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کیا.... انہیں زوروں کی ہنسی آ رہی تھی۔

الفت کی قصدا" اڑتی پڑتی نگاہ یوں تھی۔ جیسے نیچے کا منظر اور کردار دونوں اجنبی ہوں غیر متعلق....

"تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔ دال کے پراٹھے ہیں۔ ٹماٹر کی چٹنی اور شامی کباب بھی بنائے تھے۔ لاؤں ناں...."

"بالکل لائیے...." وہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ بچے چاکلیٹس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ننگی بان کی چارپائی پر بازو کا تکیہ بنا کر نیم دراز ہو گئے۔

سر پر لگے بادام کے درخت کے پتوں کی درزوں سے چھت پر نظر پڑتی تھی۔ الفت ان کے لائے گول گپے بڑا سا منہ کھول خوب سی سی کرتے کھا رہی تھی۔ اس عالم میں اس کے چہرے پر نور کی برسات تھی۔ گندمی رنگت میں سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر ہلکی تندرستی کی تہہ سی تھی۔ اسے افضل سعید کی خود پر جمی نگاہوں کا بخوبی احساس تھا۔ مگر لاتعلقی کا تاثر۔

اس کے کھانے کی رفتار بہت تیز تھی۔ "مزے کے ہیں؟" افضل نے شی شی کر کے متوجہ کیا اور پھر پوچھا۔

الفت نے ان کی جانب دیکھا پھر اس انداز سے رخ پھیرا جیسے وہ اس کے کھائے پیے پر نظر لگانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔
افضل سعید نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے ہر انداز سے واقف تھے وہ ان کے ساتھ ہی جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"پھر کیا خیال ہے' رکھ لیں دن تاریخ....." افضل سعید نے اسے بھی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بڑی باجی آئی بیٹھی تھیں۔ مدعا اظہر کی منگنی یا شادی تھی۔
اسے الفت کی خالہ زاد پلس تایا زاد بہن پسند آگئی تھی۔ اس نے سیدھے سیدھے افضل سعید سے ذکر کیا۔ افضل بے حد خوش ہوئے۔ انہیں تمکنت بہت اچھی لگتی تھی۔ دبلی پتلی' دراز قد' پرکشش لڑکی..... خاموش طبع' دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی۔
وہ فیروز بیگ کے اکلوتے بڑے بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ بی اے پاس اور ایک اچھی شہرت والے پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر.....
بڑی بہن شادی شدہ' حیدر آباد میں تھی۔ بڑا بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ جب سعودیہ شفٹ ہوا تو..... تمکنت کی رہائش کا مسئلہ اٹھا۔ اکیلی رہ نہیں سکتی تھی اور بھائی کو فقط فیملی ویزا ملا تھا کمپنی کی طرف سے۔ تمکنت بہت خوشی خوشی اپنے چچا فیروز بیگ کے گھر کراچی آگئی۔
الفت اپا کا یہ دیور اظہر انہیں اکثر لینے اور چھوڑنے آتا تھا۔ الفت کے تمام گھر والے اس کے سسرال والوں سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ اور بدلے میں ان کا رویہ بھی بے حد محبت اور عزت سے بھرپور ہوتا۔
تمکنت نے محسوس کیا تھا اور کھوج بھی لگائی تھی کہ وہ پہلے دروازے سے چھوڑ سلام کر کے رخصت مگر اب کافی عرصے سے وہ اندر آکر بیٹھ جاتا تھا۔
الفت کا کٹھور پن' منہ پھٹ ہونا۔ اظہر کا مکمل وغیرہ کو اس سے دس قدم دور رکھتا تھا۔ وہ ہفتہ وار گھر آتے تھے۔ ورنہ دفتر کے اوپر بنائے گئے دونوں کمروں میں رہتے تھے جہاں ہر سہولت مہیا کی گئی تھی۔ افضل سعید بہنوں بھائیوں کو کسی حوالے سے مسئلہ کا شکار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر وہ ان کے گھر سے دور رہ کر عزت سے رہتے تھے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔
الفت کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔
اس کی آنکھوں پر بدگمانی کی عینک لگی تھی۔ اسے کچھ سیدھا نظر نہیں آتا تھا۔
"ہاں میں نے اکیلے نکل کر بھاگ جانا ہے نا۔ کبھی ایک تو کبھی دوسرے دم چھلا۔"
"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے اپا! سب آپ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔" تمکنت اس دھیان کے پیچھے چھپی فکر مندی اور محبت کو پہچان چکی تھی۔
"ہاں بہن! مجھے خوش ہونا چاہیے 'خوش رہنا چاہیے' سب یہی مشورہ دیتے ہیں۔ کوئی خوش رہنے نہیں دیتا۔ ہمیشہ لوگ ہی بتاتے ہیں کہ بی بی تم خوش ہو' مجھے خود کیوں نہیں لگتا کہ میں خوش ہوں یا کیسے خوش رہوں..... ساری دنیا کے قیافے اور خوش گمانیاں..... ہونہہ۔"
ہر وہ بات جس میں افضل سعید کی مدح کا پہلو ہو' اللہ جانے الفت کو آگ کیوں لگا جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مزے سے چلتا منہ اور لقمہ بناتا ہاتھ ٹھٹک کر رک گیا پھولے پھولے ہلکے بے وزنی پھلکوں کی جگہ تندوری روٹی کب شروع ہوگئی' اس نے چونک کر سر اٹھایا تو کھڑکی میں تمکنت کا چاند چہرہ جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ سجا تھا۔
اظہر نے ایک نظر روٹی اور دوسری تمکین پر ڈالی۔
"دراصل گندھا آٹا ختم ہوا تو میں نے جلدی سے بچے کو بھیج دو روٹیاں منگوالیں۔ آپ کھاتے رہیے میں اور آٹا گوندھ رہی ہوں ناں۔" اس نے آٹا چپکے ہاتھوں کو لہرایا۔

"مائی گاڈ..... میں اتنی..... ی ی ی..... روٹیاں کھا گیا؟"
"مم..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" تمکنت کو اس کے انداز پر ہنسی آئی مگر فوراً صفائی دی۔
"سب ہی کھا رہے تھے' شاید میں نے آٹا کم گوندھا تھا۔"
"آپ یقیناً" اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں گی کہ میرے ہاتھ رکے کہ نہیں رکے۔" اس نے پالینے والے انداز میں سہلایا۔
"نہیں..... نہیں۔" تمکنت نے زور و شور سے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں اگر گن بھی رہی تھیں تو کوئی برائی نہیں....." وہ تخت سے اتر کچن کھڑکی کے سامنے آرکا اور چوکھٹ پر کہنی ٹکا کر گال ہتھیلی پر رکھا۔ "نوالے گننے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔
نمبر1 اگر آپ محبت سے کھلا رہی ہیں تو جملہ اور لہجہ یوں ہوگا۔ ہائے اللہ ابھی تو آپ نے صرف ایک سو ننانوے نوالے کھائے ہیں۔
نمبر2 ہائے اللہ گیارہ روٹیاں کھا گیا۔ کم بخت کا پیٹ ہے کہ کنواں..... اب آپ بتایئے' آپ کا نمبر کون سا تھا....."
تمکنت کو زوروں کی ہنسی آرہی تھی۔
"پہلے والا۔" وہ چہرے پر اڑتے بالوں سے کچھ پریشان تھی۔ سر جھٹک کر بال پیچھے کیے۔
اظہر نے فارغ لٹکتے ہاتھ کو پشت پر کس لیا۔ دل اور دماغ کی گستاخ خواہش ہاتھ کو آلہ کار بنانے والی تھی۔

تمکنت نے جلدی جلدی گوج لگا کر آٹا سمیٹا اور چولہے کی آنچ بڑھائی۔
"آپ بیٹھیے۔ میں بس پانچ منٹ میں۔"
"ناں..... نہیں..... بس پیٹ بھر گیا۔" وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ "اور روٹی مت بنائیں۔ میں نے پانی پی لیا ہے بس....."
"آپ ناراض ہوگئے شاید..... بس دو منٹ....." وہ پیڑا توڑنے لگی۔
"تمکنت پلیز..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بے خیالی میں پتا نہیں چلا ورنہ میں اتنا بھی پیٹو نہیں۔ بھنڈی گوشت پسند ہے اور اتنے ملائم پھلکے..... دھیان ہی نہ رہا۔ آپ رک جایئے پلیز۔"
"میں اپنے لیے بنا رہی ہوں۔" اس نے رخ موڑ کر کہا مگر مسکراہٹ کی کرن اظہر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہی۔
"یعنی میں آپ کے حصے کی بھی روٹی کھا گیا ہوں۔"
اظہر کو خود پر افسوس ہوا.....
وہ چپ رہی۔
"اچھا آئندہ ہم مل کر کھائیں گے تو....."
"آئندہ..... مل کر..... کیوں؟" تمکنت کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"اوہ.....!" اظہر دو قدم پیچھے ہوا۔ "لڑکی ناراض ہو کر چمٹا بھی مار سکتی ہے۔"
"اوہ سوری..... بے خیالی میں..... میرا مطلب ہے کہ....."
"یہ بھی کیا تمہارے بھیا جی کا حکم ہے..... کہ صرف چھوڑنے نہ جاؤ جب تک الفت وہاں رہے۔ ساتھ ساتھ چپکے رہو۔" الفت کھانے کے برتن لیے بولتی آرہی تھی۔ اس کے خیال میں اظہر جا چکا تھا۔
"وہ..... میں ہاتھ دھو رہا تھا۔" وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔
"ہاں تو ہاتھ دھونے سے منع کون کر رہا تھا۔ مگر میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پہلے تو تم "ہاتھ دھونے" تک آتے ہی نہیں تھے۔"
الفت نے یقیناً" اس کے کھانا کھانے پر تنقید کی تھی۔ تمکنت کا رنگ اظہر کے رنگ سے زیادہ پھیکا پڑا تھا۔

عزت نفس پر الفت کا حملہ شدید تھا۔
اظہر جوابی حملہ کر سکتا تھا۔ یہ بھنڈی گوشت اور دیگر راشن پچھلے ہفتے افضل کے کہنے پر اظہر ہی ڈلوا کر گیا تھا۔
مگر یہ جملہ الفت جیسی آنکھوں کی اندھی اور عقل

کی اندھی..... ہی کہہ سکتی تھی۔ اس کے سامنے اس کی اماں نے اظہر کو کہہ کہہ کر روکا تھا کہ کھانے کا وقت ہے اور وہ اسے کھانا کھائے بغیر کبھی نہیں جانے دیں گی۔

اظہر کے دل کا حال کیا تھا' یہ دوسری بات تھی لیکن سامنے تو یہی تھا کہ اماں نے روکا تھا اور فیروز بیگ بہت محبت کے ساتھ اس کے ساتھ کھا کر گئے تھے۔ وہ تمکنت کے چکر میں چھوٹے لقمے لے کر بیٹھا رہ گیا تھا یہ تو اندر کی بات تھی۔

اظہر کے پاس جواب تو تھے۔ مگر وہ دے نہیں سکتا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" اس نے تخت پر پڑی چابیاں پینٹ کی جیب میں ڈالیں۔

"پچ..... چائے رکھی تھی۔" تمکنت نے سفید کپ میں خوش رنگ چائے کو دیکھا۔

اظہر نے تمکنت کا شرمندہ سہا چہرہ دیکھا وہ مسکرایا اور یہ بہت مشکل مسکراہٹ تھی۔

"پھر کبھی سہی....." وہ پلٹ گیا۔

الفت "ہونہہ" کہہ کر فریج کھولے کھڑی تھی۔ وہ اظہر کے لائے آموں میں سے تگڑے آم چن کر الگ کر رہی تھی۔

مین دروازے پر جا کر اظہر کو پلٹنا پڑا۔ اس کو اپنی پشت پر ملتجی نگاہیں محسوس ہو رہی تھیں۔

تمکنت نے چائے کا کپ اٹھا کر دکھایا۔ چائے تیار تھی۔ وہ پی کر چلا جاتا۔

"نیکسٹ ٹائم تمکنت.....!" وہ والٹ اٹھانے کے بہانے پلٹا تھا۔ ان شاءاللہ۔" اظہر سعید نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بائیس برس کا تھا اور اسے اسٹیبلش ہونے اور شادی بیاہ تک پہنچنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ بہت مزے سے تمکنت کے ساتھ لکا چھپی کا کھیل انجوائے کر سکتا تھا ایک اٹل ارادہ' ایک مسکراہٹ..... ہفتے بھر کی طمانیت اور خوشی کے لیے ایک گنگناتا جملہ۔

مگر الفت.....

الفت..... خوش نہیں رہتی تھی۔ وہ کسی کو خوش رہنے بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ الفت کی جگہ کوئی اور محبت کرنے والی پر خلوص بہن ہوتی تو خوش ہوتی کہ بہن کے لیے ایک اچھا مستقبل بن سکتا ہے۔ کوشش کرتی۔

الفت کی جگہ کوئی اور بھابھی ہوتی تو چھوٹے لاڈلے دیور کے من پسند دیورانی لا کر (اور اگر اپنی ہی بہن ہو تو کیا بات ہو) خوش ہوتی۔ زمانے بھر سے واہ واہ سمیٹتی سب کی نظروں میں اچھی بنتی۔

مگر یہ الفت تھی۔ جسے کسی کی اچھائی برائی سے غرض نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب اماں نے دبے لفظوں میں کہا کہ۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ اظہر ارجمند کو پسند کر لیتا تمکنت کے بجائے۔"

تب فیروز بیگ نے اونہوں کہہ کر ناگواری کا اظہار کیا۔

تمکنت ان کے لیے چوتھی بیٹی کی طرح تھی۔ کوئی فرق نہیں.....

الفت کی رائے مانگی گئی تو جواب حق دق کر دینے والا تھا۔

"میرا حال دیکھ لیں۔ پہلی بیٹی کے سکھ دیکھ لیں تو دوسری دے دیں۔ ہونہہ۔" اور فیروز بیگ پہلی بیٹی کے سکھ دکھ سے بخوبی واقف تھے۔

اظہر نے اس روز بنا چائے پیے واپس پلٹتے ہوئے بائیک کو کک لگاتے تک فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ دونوں بڑی باجیوں کا قطعی انکار وہ جانتا تھا۔ چھوٹیوں کو قائل کیا جا سکتا تھا۔ سب سے آسان راستہ افضل سعید ہی تھے۔

وہ دفتر میں کیلکولیٹر اور پین پکڑے بے حد مصروف تھے۔ اس نے چھوٹتے ہی کہہ دیا۔

"مجھے تمکنت سے شادی کرنی ہے۔ آپ میرا رشتہ مانگ لیں۔"

افضل سعید نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"شادی پڑھائی لکھائی اور کام سیٹ ہونے کے بعد کروں گا۔ بس آپ منگنی کر دیں بلکہ..... نکاح کر دیں۔ بھابھی کہتی ہیں ہمیں ان کی اماں کے گھر آکر کیوں بیٹھتا ہوں۔ انہیں بھی پتا لگے ان کے لیے نہیں بیٹھتا۔" وہ انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر تیز تیز کہہ رہا تھا۔

"بھابھی کی ضد میں رشتہ مانگنا ہے؟" افضل سعید نے تحمل سے پوچھا۔ "یہ تو لڑکی کی زندگی خراب کرنے والی بات ہوئی۔" وہ اس کا اندر ٹٹولنا چاہ رہے تھے۔

"ایسے آندھی طوفان کی طرح....."

"وہ نہ ملی تو میری زندگی خراب ہو جائے گی۔" وہ تیزی سے بولا پھر بڑے بھائی کا لحاظ یاد آیا تو تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ افضل سعید کے لبوں پہ مسکراہٹ آ رکی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

افضل سعید کی چاروں بہنوں کو الفت کے طور کبھی بھی کسی پہلو سے بھی پسند نہیں تھے۔ لاپروائی' غیر ذمہ داری۔ منہ پھٹ ــ ناعاقبت اندیشی' بدسلیقگی ..... انہیں ہر چیز پر اعتراض تھا۔

افضل سعید کی شادی کا ارمان تھا دل میں بے حد مگر ماں باپ کا آگے پیچھے فوت ہو جانا' شہر بدل لینا اور پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جگہ پر جمانے میں دن سالوں میں کیسے بدلتے رہے۔ خبر ہی نہ ہوئی۔

دوسرے بڑی باجی کو کراچی میں اتنے سال رہنے کے باوجود یہ شہر ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ موسم' رہن سہن' لوگ' گفتگو' گھر' بازار' راستے اور پھر اسی شہر سے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنا ایک سراسر احمقانہ خیال تھا۔ وہ ہر سال گاؤں کے چکر میں خاندان برادری کی لڑکیوں کو دیکھا کرتیں۔ مگر حتمی فیصلہ..... افضل سعید نے کرنا تھا جو اس موضوع پر آتے نہیں تھے۔

چھوٹی باجی اتنی انتہا پسند نہیں تھیں۔ مگر وہ مشترکہ خاندانی نظام کی بڑی بہو تھیں سو جب ملتیں۔ ہر بار بڑی کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔

کوثر اور کنیز کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اور افضل سعید ایک روز اچانک دھلا لٹھے کا سوٹ پہن بغیر بری اور باجے گاجے کے دلہن لے آئے۔

دلہن پہلی نگاہ ہی میں سب کو پسند آئی پر جب تک گھونگھٹ گرا رہا اور منہ بند رہا..... بعد کی کہانی میں کوئی زیر زبر پیش نہیں۔ سیدھے سیدھے کٹھور جملے' بڑی باجی کے معیار پر تو وہ خیر کسی بھی صورت پوری نہیں اتری تھی۔

اور بعد کی حرکتیں آخری کیل جیسی.....

اس کی تمام باتیں برداشت کو آزماتی تھیں۔

مگر ناقابل برداشت حرکت اور عمل اور بات اس کا ہر وقت وجہ بے وجہ افضل سعید کا مذاق اڑانا تھا۔ بنا سوچے سمجھے' انتہائی عجیب و غریب مثالیں۔ وہ کبھی انہیں کالا کہتی۔ بڑی باجی کا دل کرتا تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔

قطب مینار کہہ کر دراز قامتی کی بھد اڑاتی تو باجی سوچتیں۔

"بدبخت پانچ منٹ باہر ہے۔ اسے دس فٹ اندر کر دیں۔"

وہ افضل سعید کے محبت بھرے دل کو اپنی ٹھوکر پر رکھتی تھی۔ پیار لٹاتی آنکھوں سے نگاہیں چرائے وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔ اسے صرف اپنے آپ سے پیار تھا۔ اپنا کھانا پینا' گھر بار' شوہر اور بچے..... ہاں بچوں سے دو بہی اور ایک چھبی کا بے ساختہ رشتہ.....

جو شاید ہر عورت کے لہو میں موجود ہوتا ہے۔ کسی بلڈ ٹیسٹ کے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مگر الفت کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ مضحکہ اڑانا اور بنا سوچے سمجھے کچھ بھی' کبھی بھی کسی کو بھی کہہ دینا اس کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا یہ ہتک آمیز رویہ صرف افضل سعید کے لیے نہیں تھا۔

وہ اپنے بچوں کا' اردگرد کے لوگوں کا' ٹی وی دیکھتے اداکاروں کا۔ گلی میں سبزی والے تک کا مذاق اڑاتی۔

حد تو یہ کہ اپنے اماں باوا کے لیے بھی یہی انداز اپنائے رکھتی تھی۔

اسے گھر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چولہا جل رہا ہے۔ موٹر چل رہی ہے۔ پانی بہہ رہا ہے۔ فریج میں چیزیں گل سڑ جاتیں۔ پچھلا ختم نہیں ہوتا۔ وہ اگلا منگوا لیتی...... گھر کی صفائی دھلائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ (فریج کی ہفتہ وار صفائی افضل خود کرتے)

بڑی باجی کے تمام اعتراضات افضل کے لیے ذرا در خواعتنا نہیں تھے۔ انہیں الفت کی ہر بات' ہر ادا پسند تھی۔ آمنا صدقنا۔

صفائی ماسی کر جاتی۔ مگر صفائی "صفایا" میں کب بدلتی الفت کو خاک پتا نہ چلتا......

ماسی پہ ماسی بدلی جاتی۔ مگر اس پر نگاہ بھی افضل کو رکھنی پڑتی۔ اب افضل ماسی پر نگاہ رکھیں یا کاروبار پر دھیان دیں۔

گاؤں سے بی بی نسیم نامی بیوہ عورت بھی بڑی باجی تنگ آمد بجنگ آمد لائی تھیں۔ مگر وہ جب جب چھٹی لے کر گاؤں جاتی۔ پیچھے افضل کے گھر دھول اڑتی۔

افضل کے کپڑے' بنیان تولیہ' ہفتہ وار لانڈری جاتے۔ وہ بھی افضل خود اکٹھے کرتے الفت کلف لگے کپڑوں میں ازار بند ڈالتے ہوئے بھی سو سو باتیں سناتی۔

"نیفے تک کلف لگانے کی کیا تک ہے۔ لگتا ہے نالی میں ہاکس ڈال کر گٹر کھول رہی ہوں۔"

وہ پین کو زور زور سے نیفے میں بڑھاتی۔ افضل کی ہر شلوار کے نیفے میں پین کی نوک کے سوراخ ہوتے تھے۔

بڑی باجی اس جملے پر اقدام قتل کا سوچتیں اور اگر افضل کو بے قابو ہو کر ہنستا دیکھ لیتیں تو سچ مچ فوری طور پر بال نوچ لیتیں۔

باجی کی موجودگی میں افضل محتاط ہو جاتے مگر سچ تو یہ تھا کہ انہیں الفت کی اول جلول باتوں اور حرکتوں پر دل کھول کر ہنسی آیا کرتی تھی۔

بہت کم عمری اور ناسمجھی کے زمانے سے وہ کڑی محنت و مشقت سے کڑے موسموں سے لڑتے خود فراموشی کی زندگی گزار رہے تھے اور آگے بھی گزارتے رہتے۔

بہن بھائیوں کی ذمے داریاں' کاروبار جمانے کی دھن' ایک مسلسل جدوجہد کے دور میں الفت ان کے لیے پھلجھڑی تھی۔ آبشار جھرنے جیسی ہنسی' چنچل باتیں۔

بڑی باجی کو الفت پر تو جو غصہ آتا سو آتا...... افضل کا حال دیکھ کر تو دانتوں انگلیاں داب لیتیں۔

اور اب اسی بدعقل' بدسلیقہ...... اور بہت سارے بد رکھنے والی الفت کی خالہ زاد اور تایا زاد بہن تمکنت ......

وہ سب سے بڑی مخالف تھیں۔ چھوٹی باجی دونوں فریقین کو سنتی تھیں۔ کوثر اور کنیز تمکنت سے ملتی رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے پسند کرتی تھیں۔ رہے افضل۔ اگر ہاتھ اٹھا کر ووٹ دینا ہوتا تو وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بے ایمانی بھی کر لیتے۔

اور الفت باجی کے تمام اعتراضات ایسے سن رہی تھی جیسے وہ کسی اور کا ذکر کر رہی ہوں۔ مسالہ لگے کٹے امرود کی پلیٹ گود میں تھی۔ بڑی باجی کا دماغ گھوم گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر اس دیوار کو ڈھونڈنے لگیں جس پر اپنا سر مار سکیں۔

اتنی اہم سنجیدہ گفتگو...... ساری فیملی کا اقرار دونوں کے لیے اہم...... انکار ہو تو تمکنت یعنی الفت کے میکے میں ایک مایوسی ناخوشی...... اور الفت کو کسی انکار اقرار' جواز سے دلچسپی نہیں تھی۔

اور وہ کانٹے سے بنا رکے امرود کھاتے اور افضل اس کی جانب چہرہ کرتے تو نا چاہتے ہوئے ایک چھوٹا سا ٹکڑا ان کے منہ میں بھی رکھ دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں تو اس طرف کی تیاریاں کیا مطلب......؟ ہر شے تو نکاح کے روز ہم لے کر جائیں گے کپڑے انگوٹھی...... پھول...... تمہیں اور بچوں کو شاپنگ

کروادی۔ اب کیا تم نے اس حال میں دیواروں پر رنگ کرنا ہے یا گلی میں بتیاں لگانی ہیں۔"

وہ بے حد تھکے ہوئے چار بجے لوٹے تھے۔ نماز سے پہلے جھپکی لگانے کا ارادہ تھا۔ الفت کھانا لگا کر بیٹھی تھی۔ ان کی بھوک چمک اٹھی۔

عام طور پر وہ ایسی مہربانی کے پیچھے چھپے سبب کو بھانپ لیتے تھے مگر ابھی بھوک' تھکاوٹ اور دوبارہ جانے کا خیال حاوی تھا۔

"مجھے جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے؟" وہ آخری لقمہ حلق سے اترتے ہی مطلب پر آئی۔

"نہیں الفت! مجھے واپس پہنچنا ہے۔ اگر پیسے اور کچھ کاغذ نہ اٹھانے ہوتے تو میں نہ آتا۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔"

"احد کو میرے پاس لٹا دو...... اور دیکھو اسد شور نہ کرے۔ چائے اٹھنے پر پی لوں گا۔"

"میں نے آپ سے ٹائم ٹیبل نہیں پوچھا۔" الفت بدتمیزی سے ہاتھ چلا کر بولی۔ "یہ کر لینا وہ کر دینا ...... ہونہہ! نظر نہیں آرہا۔ میں پوری تیاری سے بیٹھی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے چھوڑ کر آئیں...... ہاں نہیں تو...... ہونہہ۔"

"دروازہ بند کر دینا۔" افضل نے کروٹ بدل کر الفت کو سچی مچی کی آگ لگادی۔

"کیا مطلب دروازہ بند کر دینا؟" اس نے بے حد بدتمیزی سے افضل کا پیر ہلایا۔

"ہاں...... ہاں بولیں۔" افضل سعید کے کھلتے لب دیکھ کر وہ اچھلی۔

"پہلی بات الفت! ایسی اچانک آندھی کی طرح کے پلان مت بنایا کرو۔ ہم کوئی بھی معاملہ پہلے طے کر سکتے ہیں۔ دوسرے تم کو جانا تھا تو صبح سے جاتیں۔ اب اس وقت بچوں کے ساتھ اس حالت میں کون سے بازار کی خاک چھانو گی؟ کچھ لینا ہے تو کل صبح صبح چھوڑ دوں گا۔ ابھی جاؤ گی تو لوٹو گی کب......؟"

"تو لوٹنا ضروری ہے کیا۔ میں کیا رات فٹ پاتھ پر گزاروں گی۔ بھرا پرا گھر ہے۔ ساری زندگی وہیں تو گزاری کون سا عیب لگ گیا۔ جو لگ جائے گا اب۔"

"فضول بات مت کرو۔"

"فضول تو آپ کر رہے ہیں۔ سیدھے سیدھے جو کہا' وہ کرتے کیوں نہیں؟ اور چھوڑ کر آتے ہیں یا میں خود نکلوں۔" وہ دفعتاً "پرس دبوچ کر کھڑی ہو گئی۔

"خبردار جو...... اکیلے نکلنے والی بات کی۔ بالکل نہیں۔" افضل سعید کو غصہ آگیا۔

"اتنی تکلیف ہے تو چھوڑ کر آئیے...... بھاشن مت دیں۔" اس نے چمک کر کہا۔

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں' کل صبح جلدی چھوڑ دوں گا۔ رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر لوٹیں گے۔" افضل کا غصہ بھی ایک پل ہی کا تھا۔ وہ دوبارہ چت لیٹ گئے۔ الفت نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس کی مرضی کا کیا ہوا۔

"تو کرنی تو آپ نے اپنی من مانی ہی ہے ناں...... میں نے ابھی جانے کا پروگرام بنایا تھا ناں۔"

"اور میں نے کہہ دیا۔ مجھے رات والی بات پسند نہیں۔" بند آنکھوں کے ساتھ ہی جواب دیا۔

"کیوں؟" الفت کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

افضل کے پہلو سے لگا احد شور کے باعث کسمسا رہا تھا۔

"یار! اپنے بچوں سے لپٹے بنا مجھے رات کو نیند ہی نہیں آتی۔" ایک ہاتھ سے احد کو تھپتھپا کر دوسرے سے اسد کو خود سے قریب کر کے چومتے ہوئے ان کا لہجہ طمانیت' سرور اور خوشی سے بھرپور تھا۔ بے فکر سا سرشار۔

ان کے دونوں چھوٹے بازو ان کے پہلوؤں سے لگے تھے۔

الفت کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹیں...... اس کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں۔ افضل کی ہمت اس پر فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش......؟

"تو پھر لیٹے رہیں اپنے بیٹوں کے ساتھ...... ساری

رات چومتے رہیں اور لپٹاتے رہیں۔"

وہ تن فن کرتی باہر لپکی جب تک افضل سمجھ کر باہر نکلتے' وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔ افضل تیر کی طرح ننگے پیر لپکے۔ وہ گلی کے کونے پر تھی۔ وہ جوتے پہنتے اور اس تک جاتے اور وہ الفت کو بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

گھر کا تماشا گلی میں پیش کیا جائے تو اچھا ہو یا برا زبان زد عام ہو جاتا ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں تھے۔ مگر یہ اسد کے رونے کی آواز تھی۔ "امی..... مما جی....." اس کی آوازوں میں احد کی ریں ریں بھی شامل ہوئی۔

افضل اندر کی جانب دوڑے۔

✵ ✵ ✵

افضل فطرتاً" غصیلے نہیں تھے اور دوسرے یہ غصہ کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری مصروفیت بھول کر رات میں بچے الفت کے پاس چھوڑ آئے۔ اور اس کی طنزیہ جتاتی بتلاتی نگاہوں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ ساس' سسر اور سالے سالیوں کے ساتھ محو گفتگو رہے۔

وہ اس جھگڑے اور الفت کی بدتمیزی کی بھنک بھی اپنے بہن بھائیوں کو نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔ مبادا بڑی باجی عین ٹائم پر تمکنت اور اظہر کے رشتے سے منکر نہ ہو جائیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے تھے۔ ساس سسر اور دیگر بھی ان کے ہم خیال تھے۔

لیکن..... الفت.....

کسی بھی قسم کی محتاط روی اور دنیاداری کا خوف اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تمام محفل میں افضل سعید کو نظرانداز کرتی رہی ان کے سائے سے بھی جیسے پناہ مانگتی رہی۔ ایک گروپ فوٹو نہ بنوایا۔ ایک بھی فیملی فوٹو نہیں..... افضل سعید نے جبراً" ہاتھ پکڑتے ساتھ بٹھایا تو چہرے کے تاثرات اس قدر سپاٹ اور پھر ناگوار تھے کہ بچے بچے کو اندر کے حال کی خبر ہو گئی۔

الفت کو اس فنکشن میں دوہرا کردار ادا کرنا تھا۔ سالی بھی اور بھابھی بھی لیکن اس نے ہاتھ جھاڑ رکھے تھے۔

کچھ اس کا اپنا قدرتی نقشہ دل موہ لینے والا تھا۔ اس پر بے فکری کی چمک اور تڑ کا تھا' اس حالت کے بے پناہ روپ کا۔

پیلے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں سلور کرن لگے دوپٹے کو سر سے گزار پیٹ کو ڈھانپے گیندے کے پھول بالوں میں پروئے۔

جب وہ پاندان کے ڈھکن سے وقتاً" فوقتاً" سونف نکال کر منہ میں ڈالتی تو افضل سعید کا دل ڈول ڈول جاتا۔

تصاویر کا سیشن چل رہا تھا۔ وہ لاڈلی کوثر کے ساتھ بیٹھے الفت کو دیکھ دیکھ کر توصیفی جملے کہتے تھے۔

"پاکیزہ کی مینا کماری لگ رہی ہے۔ تمہاری بھابھی ہے ناں.....؟"

کوثر کا سر اثبات میں زور زور سے ہلتا۔

کوثر کی دوسری جانب بڑی باجی تھیں۔

"امراؤ جان ادا کی بدبخت نائیکہ والے لچھن ہیں کم بخت کے سارے ہے۔ اونہہ!" کوثر اسٹرا کے ذریعے بوتل چڑھا رہی تھی' زور سے اچھو لگا۔

بڑی باجی اور دیگر کو سب کی جانب سے خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ مگر الفت کی جوتی سے..... وہ اپنے حال مست تھی۔

سب باہر کے مہمان رخصت ہونے پر یہ تمام لوگ بڑے کمرے کی فرشی نشست پر آرام وہ حالت میں چائے کے منتظر تھے۔

"تبریز (تمکنت کے سعودیہ والے بھائی جان) تقریباً" دو برس بعد آئے گا' رخصتی تب ہو گی۔ میں اس سے کہوں گا' درمیان میں کوئی موقع نکالے تو جتنی جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کی کون سی عمر نکل رہی ہے تئیسواں لگا ہے ابھی۔"

"دو سال کا انتظار ٹھیک ہے۔ اظہر بھی تئیسویں میں لگا ہے۔ لڑکوں کے حساب سے یہ کافی کم عمری ہے۔ ذرا تعلیم مکمل کر لے۔ اسے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ شادی تو ہو ہی جانی ہے۔ خدا بھائی کو سلامت رکھے جو تعلیم کا خرچا اٹھا رہے ہیں جو مرضی پڑھنا چاہے۔ باقی کاروبار ماشاءاللہ پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔ اللہ اور ترقی دے گا۔"

بڑی باجی اور باقی دونوں چھوٹی بہنیں بھی ہم خیال تھیں۔

"تعلیم اور کاروبار کا مسئلہ نہیں..... میں ہوں ناں کاروبار بڑھانے اور سنبھالنے کے لیے..... میں تو کہتا ہوں' آپ ابھی ہی رخصتی دے دیں۔ اچھا ہے استانی گھر آئے گی۔ اظہر کو خود ہی پڑھا لے گی۔ ہاہاہا..... اور عمر بھی ٹھیک ہے۔ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ تعلیم اور کاروبار ساری زندگی بڑھایا جا سکتا ہے۔ مجھے خبر ہوتی تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا الفت سے۔"

افضل سعید خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔

سب کا فہمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ الفت نیم دراز تھی۔ جھٹکے سے اٹھی۔ اسے لہجے کی نقل اتارنے میں مہارت حاصل تھی۔

"تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا..... ہونہہ..... الفت سے خوامخواہ..... الفت بے چاری نے آپ کے بیس برس میں..... فقط سات برس کا ہونا تھا۔ شادی کر لیتا الفت سے۔"

اس کا کٹیلا لہجہ..... مانو اسے آگ لگ گئی تھی۔

اس کی بات کی گہرائی جانچ کر کمرے میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ سب سے بلند آواز خود افضل سعید کی تھی۔

وہ اپنی اور ان کی عمر کے فرق کو جتانے کے ایک سو ایک طریقے جانتی تھی اور یہ والی مثال ہوئی ایک سو دو اپنی بات کہہ کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ وہ کچھ کھا رہی تھی نجانے کیا.....

بڑی باجی دانت کچکچا کر رہ گئیں۔ الفت کی باتیں..... سر پر زوردار ہتھوڑا تھیں گویا..... افضل کا قہقہہ۔

✵ ✵ ✵

اسد کا اسکول میں داخلہ اور ننھی افزا کی پیدائش بھی الفت کے اطوار بدلنے میں ناکام رہے تھے۔

بی بی نسیم کے علاوہ چھوٹی بچی کے بہلانے کھلانے کے لیے ایک جزوقتی لڑکی بھی رکھ لی گئی۔ مگر الفت کے لیے کوئی ذمہ داری' ذمے داری نہیں تھی۔

وہ پورے دن میں ایک سالن بنانے کا کام کرتی اور اسے بھی افضل پر سو سو مرتبہ جتاتی۔ اس کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ الٹے ہاتھ سے ہی ڈوئی گھما دیتی تو لذت آجاتی تھی۔

افضل گوشت خور تھے اور وہ نہاری' پائے مغز قورمے بریانی بنانے میں ماہر.....

افضل کے جسم پر چربی کی تہہ جمنے لگی تھی۔ الفت انہیں جتاتی تو بے فکری سے بات ہنسی میں اڑا دیتے۔ ان کی خوب محنت رنگ جمانے لگی نئے سے نئے قدم اٹھاتے ہوئے اب جھجک یا ناکامی کا خوف دل کو لرزاتا نہیں تھا۔ لیکن.....

اس بار کا ارادہ دل کو ڈانواڈول کر رہا تھا۔

وہ کاروباری مد میں کچھ نئے فیصلے کرنا چاہ رہے تھے اور سرمائے کے طور گھر کو بیچنے کا خیال تھا۔

پرکھوں کی زمین جائیداد چھوڑتے ہوئے دکھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس پانچ کمروں کے گھر اور بڑے سے آنگن سے انہیں بہت انسیت تھی۔ اسے خریدنا بھی اس وقت دانتوں پسینہ لایا تھا اور اب.....

انہیں کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن آخری قدم اٹھانے کا سوچتے ہی غیرارادی طور پر ٹھٹک سے جاتے۔

بڑی اور چھوٹی باجی متفکر مگر خاموش تھیں۔ کوثر نے البتہ رونا شروع کردیا۔

"ایسے موقع بار بار نہیں ملتے چھوٹی!"

"مجھے نہیں پتا۔ آپ سمجھائیے ناں بھابھی!..... اتنے ارمانوں سے میں نے ایک ایک چیز سجائی تھی۔ اپنی پسند کا رنگ' دیواروں کی تصاویر' پھول بوٹے اور منی پلاٹ اگانے کے لیے کتنے جتن کیے۔ لگتی ہی نہیں تھی۔ مٹی بدلی' کھاد ڈالی' چوری کرکے بھی لگا کر دیکھی اور اب جب اسے پھلتا پھولتا دیکھتی ہوں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور بھائی جی کو دیکھیں۔ آپ بھی تو کچھ بولیں ناں۔" آپ کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا کیا؟" کوثر نے اسے چھو کر ہلایا۔

وہ کرسی پر بیٹھی گھٹنے پر سر رکھے جھکی ہوئی پیروں کے ناخن کاٹ رہی تھی۔ حسب عادت ادائے بے نیازی عروج پر تھی۔

"میں کیا اور میرا دل کیا..... جن کا گھر ہے وہ رکھیں یا بیچیں۔ میں کاہے کو رو رو کر نحوست ڈالوں..... نیا خرید لیں گے۔ کرائے پر ملتے ہیں اس سے بھی اچھے۔"

اس کے حقیقت پسند جملے افضل سعید کے حق میں تھے۔ مگر سب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دھچکا لگا۔ الفت کو اس گھر سے ذرا سی بھی انسیت نہیں تھی کہ ذرا سا دل کڑھتا یا آنکھ نم ہوتی۔

☼ ☼ ☼

یہ اہم ترین فیصلہ تھا۔ کامیابی گھر اور کاروبار دونوں کے لیے بہترین ہوتی۔ اظہر اور اکمل کے کاروباری حوالے سے تحفظات تھے۔ تو دوسری جانب بہنوں کے اپنے خیالات..... گھر کا بیچنا جان پر کھیلنے کے مترادف تھا۔

کوثر بھائی سے زیادہ نزدیک تھی۔ وہ اپنی شادی سے پہلے جب سے گاؤں سے یہاں آئی تھی بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اسے کاروبار کی سمجھ بھی نہیں تھی مگر وہ گھر لوٹتے ہی ان سے پوچھتی تھی۔

"تھک گئے ناں....." پانی کا پیالا بڑھاتی۔ "آج کام زیادہ تھا ناں۔" وہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی گردن سہلاتی۔

اسے کاروباری معاملات کی الف' بے کا نہیں پتا تھا۔ مگر وہ پوچھتی تھی۔ نیا کام کیسا ہوا..... فلاں ہو گیا' ڈھمکاں کب ہو گا۔

اور تین سال پہلے اس کی شادی کے بعد افضل سعید کی زندگی سے چھوٹے چھوٹے بے ضرر سوال و جواب کم ہوئے تو وہ بوکھلا سے گئے۔

مگر کوثر کہاں تھی۔ سب سے چھوٹی کنیز اپنی پڑھائی لکھائی والی لڑکی تھی۔ وہ ان کی آمد پر چائے پانی پوچھ لیتی..... بس۔

افضل نے الفت کے ساتھ کوثر والا بے ضرر کاروباری رشتہ' بنانا چاہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

اسے کسی تھکاوٹ' فائدے' نقصان سے دلچسپی نہیں تھی۔

افضل کا کاروبار مندا جا رہا ہے۔ تو وہ کیا کرے۔ کھانا پینا کم کردے۔ تو لو کر دیا.....

مگر وہ کندھے سے کندھا جوڑ للو چپو نہیں کر سکتی تھی۔

افضل کو کامیابیاں مل رہی ہیں۔ تو ملتی رہیں۔

اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

اسے بس اپنی ذات سے پیار تھا اور اس سے زیادہ پیار اس کی ذات سے افضل کو تھا۔

اور پیار بھی بے جا لاڈ جو بگاڑ دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اظہر کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اسے اب الفت کے سہارے کی قطعاً" ضرورت نہیں تھی۔ وہ جب دل چاہتا' فیروز بیگ کے گھر پہنچ جاتا۔ اس کی عزت اور محبت میں اضافہ ہوا تھا۔ بیٹی کا دیور' بھتیجی کا شوہر..... مگر

مگر کسی بھی پابندی کے بغیر تمکنت اس کی آمد کی بو پاتے ہی منظر سے غائب ہو جاتی۔ کہیں سے کسی کی

پابندی یا پردے کا چکر نہیں تھا۔

مگر تمکنت کو بے حد شرم آتی۔

اظہر کو تو جیسے کسی کا لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کی موجودگی میں اسے پکار لیا کرتا۔ اس کے لیے یہ بڑے مزے کی سچویشن تھی۔ مگر تمکنت بے حد سلجھی ہوئی باوقار لڑکی تھی۔ ان کا رشتہ مذہبی اعتبار سے مکمل تھا۔ مگر معاشرتی حد بندی ابھی راہ میں حائل تھی۔

وہ جتنا اس کی جانب لپکتا' وہ اتنا دامن بچاتی۔

اس روز وہ اسکول سے نکلی تو وہ بائیک پر ٹانگیں پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ تیز دھوپ میں بھی طمانیت کا عالم یوں تھا جیسے گھنے درخت کے سائے میں کھڑا ٹھنڈک سمیٹ رہا ہو۔

تمکنت کے لیے یہ بالکل اچانک صورت حال تھی۔ یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔

"تم گھر میں لفٹ نہیں کرواؤ گی تو میں ایسے ہی یہاں آجایا کروں گا۔"

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ ارد گرد نکلتی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹ کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے بولی۔ "یہ کوئی جگہ ہے۔ اس طرح۔"

"نہیں تو ہم یہاں ہی تھوڑا کھڑا رہیں گے' کہیں دور چلیں گے میری اس بائیک کو ایسا ویسا نہ سمجھو' 125 ہے۔ افق کے اس پار بھی لے جا سکتی ہے۔" اس نے بائیک کی ٹنکی پر تفاخر سے ہاتھ مارا.....

وہ اسے انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر قریب آتی کولیگز جن کو دیکھ کر میں کچھ تصویر آشنا تھیں وہ تیزی سے بائیک پر بیٹھ گئی۔

اظہر اور اس کی بائیک دونوں ہواؤں میں اڑنے لگے جیسے.....

وہ اسے لیے ایک مشہور شاپنگ ایریا تک آگیا۔ پہلے شاپنگ کا ارادہ تھا پھر اسے خیال آیا۔ وہ صبح سے اسکول میں مغز ماری کر رہی تھی۔ بھوک لگی ہو گی تو اوپر بنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

ویٹر کو آرڈر اس نے کیا۔ تمکنت اتنے عرصے میں منہ پھلائے انگلیاں مروڑتی رہی۔

"مزے دار..... یار!" اظہر نے کھانے کی پلیٹس دیکھ کر چٹخارا ابھرا۔

"شروع کرو ناں....."

"مم..... مجھے اچھا نہیں لگتا..... یہ۔"

"کیا کھانا اچھا نہیں لگتا؟"

"نن..... نہیں دراصل مجھے اچھا نہیں لگتا کہ۔"

"کیا میں اچھا نہیں لگتا؟"

"نہیں نہیں..... یہ اس طرح ملنا۔ لوگ..... لوگ کیا۔ پبلک پلیس پر....."

"مجھے بھی....." اظہر نے ٹیبل پر ہاتھ مارا.....

"مجھے بھی ایسے تیز دھوپ گرمی کا خشک موسم..... بند ریسٹورنٹ میں ملنا اچھا نہیں لگتا۔ کالے سیاہ بادل ہوں۔ کن من ٹھنڈی ہوائیں۔ ہریالی کی مہک..... تمہارے بالوں میں پھول گندھے ہوں۔ جب ہم گھر سے نکلیں..... اور یہ بیک گراؤنڈ میں آرٹیفشل دھنیں نہ ہوں۔ میں بجاؤں اور تم گاؤ..... گاتے گاتے بارش تیز ہو جائے۔ پھر برسات میں ہمارا ایک ڈوئٹ..... کیسا؟"

تمکنت کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ پھر اپنی بے ساختہ ہنسی کو چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"یار تم کھل کر ہنستی بھی نہیں ہو۔" اس کی آنکھوں سے چھلکتی ہنسی اس کا دل سرشار کر گئی تھی۔

"یہ کھل کر ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔"

"اور وہ موقع کب آئے گا؟"

"جب آپ بڑے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے افضل بھائی نے یہ ہی کہا ہے۔" اس نے فوراً" تصحیح کی۔

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے' میں ابھی بڑا نہیں ہوا۔"

"نن..... نن نہیں..... مم' میرا نہیں ہے۔ آپ میری کلائی تو چھوڑیں ناں..... پلیز اظہر! میرا ہاتھ تو چھوڑیں..... لوگ دیکھ رہے ہیں۔" وہ اس کی اچانک جسارت پر حیران ہوئی اور آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔

"ارے تمکنت.....!" اظہر نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی۔ اس نے مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کلائی تھامی تھی۔ اس کی مردانہ سخت پکڑ سے کلائی پر سرخ شکنجہ ابھر آیا۔

"سوری یار.....!" وہ دونوں ہاتھوں سے کلائی سہلانے لگا۔

"چھوڑیئے۔ لوگ دیکھیں گے۔" وہ منمنائی۔

"میں لوگوں سے نہیں ڈرتا۔" وہ خفا ہوا۔ "اور تمہیں بھی دنیا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں ناں تمہارا محافظ۔"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی تو چھوڑیں ناں۔ ٹھیک ہے۔ کچھ نہیں ہوا ہے۔" وہ آستین ہاتھ تک درست کرتے ہوئے صلح جو انداز میں بولی۔

"کھانا کھالو..... تو پھر تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔"

"لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں..... سب کچھ تو ہے میرے پاس۔"

"معلوم ہے یار! تم کماتی ہو..... ہر چیز لے سکتی ہو اور ہم ابھی زیر تعلیم ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا اظہر!" وہ گھبرا گئی۔

"اتنا کماتی ہو اور کلائیاں خالی رکھی ہوئی ہیں۔ چوڑیاں نہیں خرید سکتی ہو۔"

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ایک ڈیسنٹ ٹیچر اسکول میں چوڑیاں چڑھا کر جاتی کیا اچھی لگے گی۔ مگر وہ خفا ہو گیا تھا اور بدگمان بھی۔

"چوڑیاں تو آپ دلائیں گے..... آپ نے آج تک لے کر ہی نہیں دیں' اسی لیے میں نے پہنی نہیں۔"

اس نے جھوٹ سچ ملا کر کہا اور وہ فوراً "خوش ہو گیا۔

"سچ..... سچ کہہ رہی ہو ناں؟"

"بہت سارے سیٹ لوں گی..... اتنے پیسے ہیں ناں۔" وہ شرارت پر آمادہ تھی۔

اس کا مدھم' شریر' دل موہ لینے والا لہجہ۔ اظہر کا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔

"اضافی کلائیوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم صرف پسند کرنا۔"

"نہیں..... آپ کی پسند سے۔" تمکنت نے اسے بے حال کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

الفت ہر فن مولا تھی۔ خصوصاً "چھوٹی سی بات کو بڑا بنانا اور بڑی بات کو چھوٹا ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

اس نے نئے محلے میں آتے ہی تنہائی اور بوریت کا رونا ڈال دیا۔ افضل کے پاس فی الوقت اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ نئے پروجیکٹ میں بے حد مصروف تھے کامیابی کا راستہ روشن تھا۔ وہ ان تھک محنت کر رہے تھے دن رات.....

صبح کو نکلتے تو رات گئے لوٹتے' اگلی صبح سویرے کا الارم لگا کر..... یہاں الفت کی سہیلیاں نہیں تھیں۔ دلچسپی کے لیے کوئی چیز نہیں.....

"مجھے ڈش لگوا دیں۔" اس کی نئی فرمائش.....

"یار! میں نے سنا ہے اس پر بہت بے ہودہ پروگرام آتے ہیں۔" افضل نے خدشہ بیان کیا۔

"سنا ہے....." الفت نے چٹخارا بھرا۔ "دیکھا تو نہیں۔" اس نے آنکھیں میچیں۔

"یار! اظہر' اکمل بھی آتے ہیں ہفتہ وار..... کیا سوچیں گے۔"

"سوچیں گے نہیں..... دیکھیں گے نت نئے پروگرام۔" اس نے ایک بار پھر آنکھ دبائی۔

"ڈش دیکھنے سے پہلے تمہارا یہ حال ہے بات بے بات آنکھیں مٹک رہی ہیں۔ تو بعد میں۔"

"بعد میں..... میں بالکل خراب ہو جاؤں گی سرجی!"

الفت کو مطلب پورا کرنا تھا۔ وہ بڑے دل موہ لینے والے انداز میں ان کے گلے میں جھول گئی۔

الفت کا ایسا بے ساختہ التفات..... افضل کے لیے حد ہوتا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے مان گئے۔

"دیکھیں ناں' پھر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ

کو پسند نہیں ہے ناں میرا گھر سے نکلنا۔ فل ٹائم پاس۔"

افضل سر ہلا کر رہ گئے۔ ورنہ کہہ سکتے تھے۔ اس کے پاس تو "گزارنے" کے لیے بھی وقت نہیں ہونا چاہیے تھا کہ پاس کرنے کی فکر پالتی۔

تین بچے۔ پورے گھر کی ذمہ داری اگر وہ ایک سلیقہ مند گرہستن کی طرح وقت کی تقسیم کرتی تو سر کھجانے کا وقت بھی نہ ملتا..... مگر..... مگر وہ الفت تھی۔

اور الفت نے خراب تو کیا ہونا تھا۔ مزید لاپروا ہو گئی۔

ننھی افزا جھولے سے گری پڑی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومڑا بھرا تھا اور چیخ چیخ اس کا گلا بند ہو چکا تھا۔

اسٹار پلس کے کسی سوپ کی ڈشن ڈشن ڈھاں ڈھاں سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ کمرے کے باہر موجود جوتوں کا ڈھیر بتا رہا تھا کہ اندر نئی نکور سہیلیاں موجود ہیں۔ افضل نے دانت پیس کر خود کو پرسکون کرنا چاہا۔

وہ بچی کو اٹھانے جھکے پھر رک گئے۔ جسم کے اندر خون کی جگہ گرم سیال دوڑ رہا تھا۔

"الفت..... الفت!" وہ حلق کے بل چلائے۔

اچانک آواز پر وہ چونکتی گرتی پڑتی آئی۔ افضل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ افضل کے پاس آٹومیٹک لاک کی چابی موجود رہتی تھی۔

افضل کے ہاتھ کے اشارے اور نظروں کے تعاقب میں وہ ٹھٹک گئی۔ "ارے یہ کب الٹی؟"

"اور یہ کب گری اور کب اس کا یہ حال ہوا؟" افضل نے دانت کچکچا کر جملہ مکمل کیا۔

"پتا نہیں چلا..... دراصل۔"

"مجھے معلوم ہے الفت! تمہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم۔" انہیں ایک دم احساس ہوا بچی ابھی تک اسی حال میں تھی۔ وہ تیر کی طرح بڑھے تھے اور بچی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ افضل نے اسے سینے سے لگایا' محلے کی سہیلیاں دبے قدموں سرک گئی تھیں۔

بچی کے ماتھے کو بوسہ دیتے افضل خود کو پرسکون کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

افزا کے ماتھے پر گومڑ تھا۔ اس کے سر کے اوپر نمی تھی۔ جس نے سفید کلف لگے سوٹ کے گریبان کو سرخ کر دیا تھا۔

سرعت سے ان کی انگلیوں نے زخم ٹٹولا پھر نظریں زمین پر جمیں تو چابی کا گچھا دکھائی دیا۔ نجانے بچی کس طرح گری تھی۔

افضل کے نرم ہاتھوں کا لمس اور ہونٹوں کی گرمائش۔

بچی سسک رہی تھی' اس کے کپڑے بھی گندے تھے۔ الفت صورت حال کو سمجھنے اور تاویلیں گھڑنے کے عمل میں تھی۔

اسے ہوش آیا جب افضل کے پے در پے دو تھپڑ اس کے گالوں پر پڑے اور بے حد صدمے کے زیر اثر ہڑبڑا کر لڑکھڑاتی گری تو پلنگ کے کونے نے ماتھے کو لہولہان کر دیا۔

افضل کو افزا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بچی کو دھلانے کے لیے باہر نکلے۔ وہ فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتے تھے۔

اور واپسی کا منظر ان کی توقع کے برعکس تھا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ اسد اور احد کے رونے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان کا غصہ بے حد شدید تھا اور گھر سے الفت کو غائب دیکھ کر دو چند ہو گیا ان کا پارہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ الفت کی لاپروائیوں کے سامنے ہمیشہ ڈھال تھے۔ مگر اس وقت..... فون کر کے..... کنیز کو بلوایا..... اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے اور اس کے بچے نہیں تھے۔ اسے تین بچوں کو سنبھالنے کا قطعاً "تجربہ نہیں تھا۔ گھٹ گھٹ کر روتا اسد..... گلا پھاڑتا ضدی احد عادتاً "ماں کی کاپی تھا اور دودھ کے لیے تڑپتی افزا اس نے خاموشی سے کوثر کو بلا لیا۔

کوثر اپنی بچی سنبھالتی گرتی پڑتی پہنچی۔ سب سے خراب حالت احد کی تھی۔ وہ ماں کے لیے رو رو کر پاگل ہو رہا تھا اور افزا کی بھوک..... وہ فیڈر منہ میں لینے کو تیار نہیں تھی۔

کوثر کیسا جبر کرتی۔ اتنے ننھے بچوں پر.....

کنیز گھر کی حالت دیکھ دیکھ حیران تھی اور آستینیں چڑھا کر پائنچے اٹھائے کونوں کھدروں میں گھسی تھی۔ بی بی نسیم ایک بار پھر گاؤں یا تراپر گئی ہوئی تھیں۔

"بھابھی کو لے آئیں بھائی!" کوثر ہار گئی۔

"نہیں لاؤں گا۔ آج کی حرکت کے بعد کبھی نہیں لاؤں گا۔"

"ان کی حرکتیں ہمیشہ کی یہی تھیں۔ آج کون سی انہونی۔" کوثر تاسف سے بولی۔

"فضول مت بولو اور سنبھال سکتی ہو تو سنبھالو ورنہ میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔"

"جو مرضی بندوبست کریں مگر بھائی جی! افزا اور احد کا حال بہت خراب ہے۔"

افضل نے کوئی جواب نہ دیا مگر چہرے کی سختی اور قطعیت کی چادر ذرا نہ سرکی۔ کوثر امید بھری نگاہوں سے ان کو دیکھتی رہی مگر وہ ریموٹ کنٹرول کا سیل بدل رہے تھے۔

"جب سچ مچ منانے کی ضرورت بلکہ منت ترلے کی ضرورت ہے تو اکڑ گئے ہیں اور جب ایک ٹھڈے کی ضرورت تھی تب بھاگ بھاگ کر جاتے تھے۔ افزا کا حال یہ ہے کہ ان کے پیروں گر جائیں۔ اور احد کی چیخ و پکار..... اف ناک رگڑ لیں۔"

کوثر نے جلے دل سے کہا۔ افضل پر ذرا اثر نہ ہوا۔

"ویسے بھائی جی آج آپ کو ہو کیا گیا تھا؟"

☼ ☼ ☼

"اپنی بیٹی کے لیے اتنی محبت..... میں کیا کسی کی بیٹی نہیں تھی اور چلو غلطی ہو گئی مگر بچی کو میں نے گرایا تو نہیں۔ خود بخود گر گئی۔ اپنی بیٹی ہی خون گوشت سے بنی ہے۔ دوسرے کی اولاد تو لکڑی کا بے جان ٹکڑا، راستے کا پتھر ٹھوکر مار گزر جاؤ..... کیوں جی؟"

الفت کی آنکھیں ماتھے پر ٹکی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی..... اپنی بیٹی کی گردان یوں کر رہی تھی جیسے وہ افضل سعید کی یا نکے تانگے کی اولاد ہو یا کم از کم الفت کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

کوثر ششدر تھی۔

وہ بمشکل سوئی افزا کو ابھی تک دھیرے دھیرے ہاتھ سے تھپک رہی تھی۔ بچی گود میں تھی۔

"بھابھی! آپ کی اپنی بچی....." کنیز الفت کی چلتی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"ارے جاؤ..... میری ہوتی تو..... میں جو مرضی کرتی۔ یہ ہیں ناں بیٹھے اس کے اصل مالک..... اب کیوں آ گئے؟ میں نے کوئی جان بوجھ کر گرائی تھی۔ بولیں ناں ابا میاں.....'

اس نے پریشان عرق ندامت سے بھیگے فیروز بیگ کا شانہ جھنجوڑا۔

"میں..... میں کیا کہوں۔" وہ واقعی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھے۔

"ہاں ہاں۔ آپ کیوں لیں گے میری سائیڈ جس کی روٹیاں کھاتے ہیں اس کی مالا جپیں گے ناں۔" الفت کی بدلحاظی کی حد تھی۔

"بکواس نہ کرو الفت!" افضل سعید کو حد درجہ ناگوار گزرا۔

"دیکھیے..... دیکھیے..... کیسی منہ زوری سے بول رہا ہے یہ شخص..... اب یاد آ گیا کہ الفت ماں ہے۔ جب ٹھوکر مار کے گئے، تب کیا میں ماں نہیں تھی۔" وہ حد درجہ بدتمیزی سے ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھی۔

کوثر، کنیز پہلو بدل کر رہ گئیں۔ افضل سعید نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ احد ماں سے چپکا کھڑا تھا مگر ماں نے ابھی تک اس کو پیار سے چھوا نہیں تھا۔ بچے کے لیے کافی تھا۔ ماں نظروں کے سامنے تھی اور وہ اس سے لگا کھڑا ہے۔ وہ اس کے چیخ چیخ کر بولنے سے پریشان تو تھا مگر..... ماں اور باپ دونوں سامنے ہیں۔ وہ بے فکر ہو چکا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ کہہ دیجئے اس شخص سے ..... خود صبح کے نکلے شام کو لوٹیں گے۔ میرے گھر سے نکلنے پر پابندی..... جی نیا محلہ ہے تو پرانے میں کون سا میں گلی میں ہیچک (پہل دوج) کھیلتی تھی۔ہاں نہیں تو۔"

"میں افضل کو اچھی طرح جانتا ہوں الفت.....! تمہاری حرکتیں پہلی بار ہی —— تھپڑ کھانے والی تھیں۔ آج بھی تم نے کوئی حد کردی ہوگی۔" ابامیاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ الفت کا مانو تن من جھلس گیا۔

اس کی آنکھوں سے شعلے اور سانسوں سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔

"اٹھو اور بچی کو دودھ دو۔" ابامیاں کے اشارے پر کوثر نے بازو بڑھا دیے۔ افزا کے ہونٹ دھیرے دھیرے لٹک رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"کیوں..... کیوں..... میں کیا گائے ہوں؟" اس نے بچی پر گہری نگاہ ڈالی۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔ مگر بچی اب دودھ پیے گی افضل کے چہرے کی اس طمانیت نے دماغ پھر گھما دیا۔

ابامیاں نے آگے بڑھ کر کوثر کی گود سے بچی لے کر الفت کے بازوؤں میں جبراً" گھسا دی۔

ماں کا رنگ روپ' آواز' انداز' کردار و اخلاق خواہ جیسا بھی ہو' بچے کے لیے اس کی پہلی پہچان اس کے وجود سے اٹھتی مہک ہوتی ہے۔ ماں کی گود کی خوشبو سانس میں جاتے ہی وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ دنیا کے ہر بچے کی پسندیدہ خوشبو ماں کے پسینے کی بو ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"عورت کی زبان اور مرد کا ہاتھ ایک بار کھل جائے تو اس ڈور کو دوبارہ گرہ نہیں لگائی جا سکتی۔"

افضل سعید کا نیا کاروبار دن دوگنی رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ انہیں توقع سے بڑھ کر فائدہ حاصل ہوا تھا اور مزید نئے راستے کھلے تھے۔

سب بہت اچھا ہو رہا تھا۔ لیکن افضل کے دل کا ایک بڑا حصہ بے سکون تھا۔ انہوں نے بی بی نسیم کو جلد بلوایا تھا۔ انہوں نے مستقل ایک بچی گھر رکھ دی تھی جو صرف بچوں پر نگاہ رکھے گی۔ الفت کی طرف سے ایک گرہ پڑ گئی تھی۔

وہ اپنی دلچسپیوں میں بچوں کو نظر انداز تو کرتی تھی مگر نقصان پہنچ جانے والا خیال..... دو جمع چار کرتے ہوئے حاوی رہنے لگا تھا۔

الفت سے محبت وہیں کی وہیں تھی۔ مگر اب انہوں نے آنکھیں کھلی رکھنی شروع کردی تھیں۔

انہیں اس روز کی لاپروائی پر بے پناہ غصہ تھا۔ مگر ان کے دل کے اندر انتہا درجے کی شرمندگی سانس لیتی تھی اور ان کی حساس طبیعت اندر ہی اندر سسکیاں بھرتی۔

انہوں نے —— افضل سعید نے الفت پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ اپنا ہاتھ توڑ ڈالتے۔ واقعی بچے جھولوں سے گرتے ہیں مگر آج تک کوئی بچہ جھولے سے گر کے مرا تو نہیں..... اور بچی تیسرے دن تک فٹ فاٹ ہو کر قلقاریاں مارنے لگی تھی۔ مگر الفت کی آنکھ کے عین اوپر ماتھے پر لگا چوٹ کا نشان اب مرنے کے ساتھ ہی جانا تھا اور افضل سعید شدید احساس جرم میں مبتلا تھے۔

ان جیسے نرم دل' حساس' محبت کرنے والے شخص کو اپنی محبت کو اس طرح ٹھوکروں کی زد پر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

جن گالوں کو وہ یوں چھوتے تھے جیسے نودمیدہ گلاب کی نازک پتیاں ان پر تھپڑوں کی برسات..... وہ قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ زندگی بھر ایسا نہیں ہوگا۔

انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا' کچھ بھی ہو دوبارہ ایسا کم ظرفی کا عمل نہیں دہرائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے۔

"وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

اسد افضل پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے خاندان بھر کا

لاڈلا تھا۔ الفت نے تو اسے جنم دیا تھا۔ مگر احد افضل کی پیدائش کے بعد ان کا دھیان احد کی جانب زیادہ تھا۔

اسد نے رنگ روپ باپ کا چرایا تھا۔ فقط اس کی آنکھیں ہو بہو ماں جیسی تھیں۔ جبکہ احد بنا بنایا الفت تھا۔ اس کی شکل' چال ڈھال' ادائیں' ضدی طبیعت اور من مانی کی عادت روٹھنا سب الفت تھا۔

اکلوتی بیٹی افزا ماں اور باپ دونوں کا **مکسچر** تھی۔ افضل سعید کا گمان تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اسد سے کرتے ہیں۔ مگر یہ افزا نے تو آکر ان کے پورے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔

لیکن.....

ایک روز.....

بی بی نسیم کام والی چھوٹی بچی کو ڈپٹ رہی تھیں۔

"توں اپنے اندا جے (اندازے) اپنے کول رکھ۔ بیگم بی بی کاکی کو پیار نہیں کرتیں تو کیا تیرے ورگی چھٹکی (تیرے جیسی چھوٹی) کو دکھا کر کرے گی۔"

"میرا یہ مطبل نئیں..... بی بی!" بچی کے انداز میں جھجک اور نہ سمجھا سکنے کی الجھن تھی۔

"افزا کتنی پیاری گڈی ورگی ہے سچی اگر اس کا ساہ گھٹنے کا ڈر نہ ہو (سانس گھٹنا) تو شوکیس میں سجا ڈالو..... پر بیگم بی بی تو اسے اپنے پاس ہی نہیں آنے دیتیں۔ کبھی ہاتھ بھی آگے کرے تو پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور جب بچوں کو سیریلیک کھلاتی ہیں تو ناں پچھو..... کہ۔"

"بس کرنی ڈھائی نئی فسادن.....!" بی بی نسیم ششدر تھیں۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں کہ اس بات کا علم صرف انہیں ہے (الفت بچی سے فرق کرنے لگی تھی) ادھر تو کم عقل بچی بھی یہی دیکھ اور سب سمجھ رہی تھی۔

"تجھے کاکی کھڈائے کے لیے رکھا ہے (بچی کھلانا) کہ تو نے رزلٹ کارڈ بنانا ہے خبردار جو کسی اور کے آگے بکواس کی تو۔

لے..... دس تے..... ماں کا پیار ناپنے چلی ہے۔ وڈی سپر کورٹ کی جج۔"

☼ ☼ ☼

شک رسی کے سرے پر لگی آگ کی طرح تھا اور اس کے دوسری جانب دھماکہ خیز مواد سے بھرا گولہ.....

یہ ناقابل یقین منظر تھا۔ یہ سچ تھا یا کہ جھوٹ..... مگر اندھا بھی وہ دیکھتا جو بینائی والا دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔

چھوٹی باجی کی چھوٹی بیٹی افزا سے تھوڑی چھوٹی تھی۔ وہ چھٹیاں گزارنے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھیں۔

الفت بڑے سے پیالے میں سوجی کا پتلا حلوہ لیے بیٹھی تھی۔ اسد..... احد اور دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ خود الفت ہلکے اور گہرے نیلے لان کے سوٹ میں نہائی دھوئی نکھری تیار تھی۔

وہ ایک چمچ اسد کے منہ میں دیتی..... وہ پانچ سال کا بچہ تھا اور خوب لطف اندوز ہو کر کھاتا تھا احد کچھ لاڈ کر کے کچھ منہ جدا کر ایک کی جگہ دو چمچ لے کر اگلی باری دیتا تھا۔ کرن بہت چھوٹی الفت اس کو چھوٹے سے چمچ کے سرے پر بہت معمولی سا حلوہ رکھ کر اس کے منہ میں دیتی پھر نفاست سے بب سے ہونٹ صاف کرتی۔

یہ منظر مکمل' خوب صورت' طمانیت انگیز اور بے عیب تھا۔ مگر نہیں.....

جب افزا کی باری آتی۔ الفت اس کے منہ تک چمچ لے کر جاتی۔ وہ منہ کھولتی۔ آنکھوں میں چمک ابھر آتی۔ وہ چمچ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر قلقاری مارتی اور واکر کے رنگ بال پر زور زور سے خوشی کے عالم میں ہاتھ مارتی۔

مگر یہ کیا..... بھرا چمچ اس کے ہونٹوں اور دو دانت سے ٹکرا واپس پلٹ جاتا۔ بچی تیز تیز زبان نکال کر مٹھاس کو چاٹتی۔ مگر اس کے منہ میں تو کچھ نہ جاتا۔ پیٹ تو ویسے ہی خالی۔

دو ایک چمچ اسد..... دو تین چمچ احد..... پھر افزا۔

افزا واکر کے رنگز پر زور..... زور سے ہاتھ مار کے ماں کو متوجہ کر رہی تھی۔ اس بار الفت نے جان چھڑاتے انداز میں ایک چمچ منہ میں دیا۔

بچی کے منہ سے چپ چپ کی تیز آوازیں ابھریں۔ اسے بہت بھوک لگی تھی اور بی بی نسیم کے

ہاتھ کا حلوہ پسندیدہ ترین۔

الفت بچی کو اذیت دے رہی تھی۔

وہ تین چار بار چمچ کو محض دانتوں سے ٹکرا کر واپس لے لیتی تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں کو حلوہ چکھانے کے بعد چمچ احد کے منہ میں دیتی تو وہ معصوم اس لاڈ اور امتیازی سلوک پر تالی پیٹتا۔

"مماجی ..... بہنا زیادہ بھوکی ہے' اسے دو ناں۔" اسد کا پیٹ بھرا تو بہن کا احتجاجی ہاتھ پیر مارنا نظروں میں آگیا۔ "اب میرا پیٹ بھر گیا۔"

"تو دے رہی ہو ناں!" الفت نے بے پروائی سے کہا۔

کرن کا پیٹ بھر گیا تو وہ کھلونوں سے ہاتھ مارنے لگی۔ اسد نے گاڑی چلانا شروع کی تو احد اس کے پیچھے لپکا ..... پیالا "تقریباً" خالی تھا۔ دیواروں سے لگے حلوے کو اپنی شہادت کی انگلی سے چاٹ الفت کھڑی ہو گئی۔

افزا کا پیٹ بدستور خالی تھا۔ وہ واکر کے اندر زور زور سے پاؤں مار رہی تھی۔ گردن اٹھا کر ماں کو اور ماں کے ہاتھ کے خالی پیالے کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے چیخنے کا وقت شروع ہوا چاہتا تھا۔

"اے کاکی ..... ! آ کر اسے فیڈر بنا دے اور اندر لے جا کر جھولے میں ڈال۔ نیند کرے گی۔" الفت چلا کر پلٹی۔

پشت پر دونوں ہاتھ باندھے افضل سعید سرد نگاہوں سے اسے اور پیالے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"بچے بھوکے ہو رہے تھے۔" ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں الفت نے مسکرا کر کہا۔

افضل سعید لاکھ دل کو سمجھاتے ..... آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کہتے ..... مگر بعض اوقات حقیقت وجدان کی طرح ہوتی ہے۔ بے عیب یقین ..... فقط یقین کرنے کے لیے۔

شک کی رسی کے سرے پر لگی آگ دھماکہ خیز مواد والے گولے تک پہنچی۔ زوردار دھماکہ ہوا تھا' افضل سعید نے الفت کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیا تھا۔

الفت بھونچکی رہ گئی۔ اس کا جرم کیا تھا؟

"ارے یہ بیٹی ہے۔ نو ماہ پیٹ میں رکھا۔ دودھ پلایا ..... مانو آستین میں سانپ رکھا ..... سانپ کو دودھ پلایا۔" الفت خون خوار نگاہوں سے گل گوتھنی افزا کو دیکھ رہی تھی۔

"جس دن سے میری زندگی میں آئی ہے۔ میری تو مصیبت آ گئی۔ مار کٹائی' گالم گلوچ۔ اپنی بیٹی اپنی ہے ..... کوئی گرم آنکھ سے نہ دیکھے ..... اور ہم کسی کی اولاد نہیں اور یہ ہمارے ابا میاں بیٹھے ہیں۔ سر جھکائے۔ آج بھی نہ پوچھیں گے داماد جی ..... ہماری بٹیا کے گال طمانچے لگا لگا کیسے لال کر دیے۔ آج بھی میرا ہی قصور نکلے گا۔"

الفت کی مرضی کا ماحول تھا۔ سب خاموش ہارے ہوئے اور اسے خطاب کی کھلی چھوٹ .....

افضل سعید کے لیے بہت مشکل' ناپسندیدہ کام تھا کہ وہ بی بی نسیم اور کاکی سے تفتیش کریں اور پھر وہ آنکھوں دیکھی ..... غصہ ٹھنڈا ہوا تو خیال آیا ..... شاید آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو۔ یونہی بدگمانی سی ..... کوئی ماں اپنی اولاد سے بھید بھاؤ کیسے کر سکتی ہے اور وہ بھی اپنی لاڈلی اکلوتی دس ماہ کی بیٹی ..... تین دن تک بچے خود ہی سنبھالتے رہے۔

لیکن افضل سعید غصہ اور عناد پالنے والے شخص نہیں تھے۔

دوئم ..... احد کی ضد اور رونا پیٹنا ناقابل برداشت تھا۔ سب اسے سنبھالنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔ افزا کو سنبھالنا نسبتاً" آسان تھا۔

احد کی ضد کے آگے وہ بھی اڑے رہے۔ پھر اسد کا بے حد خاموش رویہ .....

وہ ماں اور باپ دونوں کے درمیان سونے والا بچہ تھا۔ رات باپ کی جانب سے کروٹ بدل جب سسکیاں دبا دبا کر بے آواز مماجی کہہ کر رویا ..... تو افضل سعید کے جسم سے جیسے کانٹوں کا جھاڑ لپٹ گیا۔ رات کے دو بجے کا عمل نہ ہوتا تو اسی وقت جاتے۔

اور اب صبح صبح وہ کوثر' اظہر بچوں اور بی بی نسیم کے

ہمراہ حاضر تھے۔ احد حسب عادت ماں کو دیکھتے ہی مطمئن ہو کر کھیل میں مگن ہو گیا۔ اور خود ہی مماجی ..... کہہ کر لپٹ گیا ..... تو الفت نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ افزا بدستور بی بی نسیم کی گود میں تھی۔

اور الفت باقاعدہ افزا اور افضل سعید سے منہ موڑے کھڑی تھی۔

افضل سعید سے تو منہ موڑنے کی وجہ سمجھ میں آتی تھی لیکن افزا سعید سے .....؟؟؟

"بیٹی تو ماں کی سہیلی ہوتی ہے۔ یہ تو سنپولیا بن کر آئی۔ ابھی تو نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ..... تو ماں کی چوٹی نچوا دی ..... کل کو کھڑی ہو گئی۔ تو مٹی چٹوائے گی ..... ہاں نہیں تو۔"

فیروز بیگ اور اماں سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ وہ افضل سعید کے غیر انسانی سلوک پر احتجاج کر سکتے تھے۔ ناراض ہو سکتے تھے۔ لڑ سکتے تھے۔ گالیاں دے سکتے تھے۔ پر الفت کے رویے کے لیے کس در کو کھٹکھٹاتے۔

شوہر مارے تو انسانی حقوق کے علمبردار آجاتے ہیں۔

اتنی چھوٹی بچی پر ماں کا غیر انسانی رویہ بہیمانہ سلوک۔

الفت ان کا گھر تھی۔ ان کی بیوی ..... بچوں کی ماں ..... اور سب سے بڑی بات ان کی محبت ..... وہ اسے لیے بغیر کیسے گھر جا سکتے تھے۔

یہ ان کی زندگی کا اہم ترین وقت تھا۔ نیا کاروبار زبردست کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔ وہ عنقریب ایک گھر خریدنے والے تھے۔ افزا ان کی زندگی کے لیے کامرانیاں لے کر آئی تھی۔ ان کے پاس مستقبل کے بہت سے خواب تھے اور تعبیر حاصل کرنے کے لیے بہت لگن' شوق اور جذبہ .....

اللہ نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ صحت' ہنر ..... علم عقل اور عزت ..... اور عزت ایک بار چلی جائے تو .....

☼ ☼ ☼

الفت کے واہیات رویے' بے لگام زبان نے تمکنت اور اظہر کے رشتے کو نگاہیں چرانے' پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ الفت نے یہ وتیرہ اپنا لیا تھا کہ وہ پندرہ روز سیدھی رہتی۔ پانچ روز کسی معمولی سی بات پر منہ پھلاتی۔ افضل سعید کا ضبط آزماتی اور میکے روانہ ہو جاتی۔ روٹھنے اور منانے میں دس روز کٹ ہی جاتے۔

کبھی بچے اس کے ساتھ ہوتے۔ اسد اور احد کی پڑھائی اس کے نزدیک ابھی اتنی اہم بھی نہیں تھی کہ فوجی ڈسپلن کے تحت گھڑی اور تاریخ دیکھی جاتی۔

اور کبھی بچے گھر چھوڑ جاتی۔ پیچھے سے جو مرضی ہوتا رہے' فائدہ نقصان۔

افضل کے لیے دونوں صورت حال ایک سے بڑھ کر ایک تکلیف دہ ہوتیں۔

بچوں کی غیر موجودگی انہیں باؤلا کر دیتی۔

اور الفت کی غیر موجودگی بچوں کو .....

ہر دو صورت گھٹنے افضل سعید ہی کو ٹیکنے ہوتے۔

الفت کے غیر جذباتی' محبت سے خالی رویوں نے افضل سعید کی اپنی کسی وجہ سے الفت کی واپسی کو خیال و خواب کا قصہ کر دیا تھا۔ کتے کی صرف دم ٹیڑھی ہوتی ہے۔ الفت ساری کی ساری ٹیڑھی تھی۔

وہ خفا ہو کر میکے بیٹھتی تو اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اپنی جلی کٹی سے وہ اماں باوا کا کلیجہ جلاتی۔ چھوٹے بہن بھائی ناسمجھی کے عالم میں اس کی سنتے۔

افضل کی برائیاں جو صرف الفت کو دکھائی دیتی تھیں۔

اصل مسئلہ تمکنت کے لیے تھا۔ ان کی شادی کے دن اب نزدیک آتے جا رہے تھے تبریز بھائی کی عنقریب واپسی پر رخصتی کا ارادہ تھا۔ تمکنت کی بڑی آپا ..... شوہر کے ٹرانسفر کے باعث اندرون سندھ سرکاری گھر میں رہتی تھیں۔ سنا تھا رخصتی سے پہلے وہ بچوں کے ہمراہ حیدرآباد شفٹ ہو جائیں گی۔ تمکنت نے آپا

کے گھر سے رخصت ہونا تھا۔
ہر بار کسی بڑے پھڈے کے بعد جب پنچائیت بیٹھتی تو نندیں اس کا چہرہ کھوجتیں..... کہ ان بی بی کی خاموشی کے پیچھے بھی کیا ایسا ہی کوئی طوفان چھپا ہے۔ گلے پڑا پچھلا ڈھول پیٹ پیٹ کر ہی ہاتھ شل اور گردن جھک گئی اور ان کے جلوے تو ابھی باقی ہیں حالانکہ تمکنت کا چہرہ وہ چہرہ تھا۔
جو ہر انداز سے اپنا اندر چھلکاتا تھا۔
نفاست، نزاکت، شرافت، اس کے چہرے پر پھیلی نرم روشنی اس کے اندر کا عکس ہی تھی۔ مگر ان سب کی آنکھوں میں الفت کے انتہائی غلط رویے کی سلوٹ زدہ چادر آ گئی تھی۔ اس ملگجی دھند میں تمکنت کا چہرہ لرزتا دکھائی دیتا۔
اس کا ستھرا دل اس کے چہرہ کا نکھار تھا۔
مگر یہ نکھار سفیدی اور زردی میں بدل گیا۔ جب ایک روز الفت نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔
"میں تنگ آ چکی ہوں اس روز روز کی ڈرامہ بازی سے..... میں کوئی زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔ نہیں رہوں گی افضل سعید کے ساتھ..... وہ مجھے طلاق دے دے..... وہ کیا خود کو دنیا کا آخری مرد سمجھتا ہے۔ بوڑھا کالا دیو..... اور میرا ابھی بگڑا ہی کیا ہے؟"
فیروز بیگ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھک گئے۔ اماں کی آنکھوں کے آگے ترمرے ناچ اٹھے۔
اتنی بڑی بات..... ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔
"بیگ صاحب! سنبھالیے خود کو۔" وہ پسینہ پسینہ ہوئے فیروز بیگ کو سہارا دینے لگیں۔ تمکنت سینہ مسلنے لگی۔ فرحت اور عزت پنکھا جھلنے لگیں۔
"چھوڑ دیں ابا میاں! اس ڈرامے کو..... وہ میری نا سمجھی کا زمانہ تھا۔ جب آپ کے دل کے دورے سے ڈر کر اپنی پوری زندگی برباد کرنے کی ہامی بھری تھی۔ میں نہیں آنے والی ان بہکاووں میں۔ ہونہہ۔"
"ابا پلیز، ایسا نہ کہیں..... چچا جان کا حال تو دیکھیں اف۔" تمکنت ہاتھ جوڑتی آگے آئی۔
"ارے ہٹو..... ایک تمہارے چچا جان..... دوسرے جیٹھ جی اور تیسرے سیاں..... تم تو نماز کے بعد تسبیح میں بھی یہی تین نام کی مالا جپتی ہو ناں۔"
الفت نے اس کے ہاتھ جھٹکے..... وہ انگلی کی پوروں پر فیروز بیگ..... افضل سعید اور اظہر سعید کا نام گن رہی تھی۔
"لاحول ولا..... استغفار....." تمکنت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
"ارے اچھی روٹی کھلاتا ہے۔ نظر آ گیا اور جو ڈنڈے، مکے، گھونسے صبح و شام کھاتی ہوں، وہ نہیں دکھائی پڑتے۔" الفت کے جھوٹ کی حد کہاں تھی۔
"کپڑے..... قیمتی ہوتے ہیں۔ تن ہی تو ڈھانپنا ہے پتے باندھ لوں گی۔ اس پندرہ سو کے سوٹ کے پیچھے چھپے نیل نظر نہیں آئے تم لوگوں کو..... میں کیوں رہوں اس بڈھے کے ساتھ مار کھانے کے لیے..... میرا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔"
اس نے کسی چھوٹی بچی کی طرح دامن کو چٹکی سے پکڑ لہرایا اور گھوم کر جیسے خود کو دکھایا۔
"ارے تو اپنی حرکتیں تو دیکھو..... عورت ناجائز کو گراتے ہوئے سو بار سوچتی ہے۔ تو ایسے ہی بیٹھے بیٹھے کوکھ جھاڑ کے آ گئی۔ اری ناہنجار لوگ کچرا پھینکنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں۔ کوئی کام کی چیز نہ ہو اندر..... تو نے اپنا خون گوشت ضائع کر دیا۔"
اماں اتنا منہ پھاڑ کر یہ سچ کبھی نہ کہتیں۔ وہ فیروز بیگ کو یہ شرمناک بات بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کی ہٹ دھرمی اور فضول گوئی نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔
"اللہ کی بھی گناہ گار..... بندے کو بھی جواب دہ..... نہیں پیدا کر سکتی تھی تو آنے ہی کیوں دیا۔ گناہ کی طرح چھپا کر رکھا..... پالنے کی ہمت نہیں تھی۔ کیا کھلانے کو روٹی نہیں دے....."
"تمہاری تو ہر تان روٹی پر آ کر ٹوٹتی ہے اماں!" الفت نے انہیں ٹوک کر ناک سے مکھی اڑائی۔ "اس روٹی کے لیے..... پہلے مجھے..... اس قصائی کے آگے۔"

"اسے چپ کرواؤ....." فیروز بیگ کی لرزتی کانپتی آواز بمشکل نکلی انہیں یہ الزام کبھی برداشت نہ تھا۔
"ہاں..... ہاں..... چپ ہو جاتی ہوں..... نہیں بولتی۔ کہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے..... جیسے پہلے ہوا تھا۔ نوے کا سن تھا۔ آج ستانوے چڑھ آیا۔ ابا جیے ہی جا رہے ہیں۔ اس وقت تو ایک پل کا بھروسا نہیں تھا۔ ہونہہ!" اس کے جملے کی تلخی کم تھی۔ تضحیک آمیز مسکراہٹ کے سامنے۔
"اللہ کا واسطہ..... الفت آپا..... بس کریں۔ کسی ایک کو بخش دیں..... دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلی جائیں۔ آپ کا جرم ہر منزل پر سنگین جرم ہی ہو گا نام نہاد لبرل کو چھوڑ کر..... ایک معصوم ننھی جان..... جب اللہ نے زندگی پھونک دی تھی تو آپ کو عزرائیل بننے کی کیا سوجھی..... قصور کیا تھا مسئلہ کیا تھا؟"
"مجھے روز خواب آ رہے تھے بیٹی ہو گی۔" اس نے سچ اگل ہی دیا اس کا بھی یہی اندازہ تھا۔
"کیا۔" تمکنت کے سر پر دھماکا ہوا۔
"تو کیا مطلب..... آپ کی کون سی یہ ساتویں بیٹی تھی۔ یا سسرال کا ظلم و جبر تھا کہ بیٹی نہیں پیدا کرنا..... افضل بھائی تو جان چھڑکتے ہیں افزا پر..... وہ تو شکرانے کے نوافل ادا کرتے۔" اس کے سر سے سب گزرنے لگا۔ وہ بھونچکی الفت کا بے پروا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"ہاں تو تب ہی ناں..... پہلی نے آ کر کون سا مجھے تاج و تخت دلوا دیا۔ ٹھوکروں میں پڑی ہوں۔ دو ہو جاتیں تو..... میرا پائیدان بنا لیتے۔ باپ بیٹیاں مل کر۔ روز صبح و شام پیر پونچھتے۔ مٹی رگڑتے..... ذلیل کرتے گزرا کرتے..... ہونہہ۔"
تمکنت سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔
"اللہ آپ کو سخت سزا دیں گے۔ سخت ترین..... آپ معاشرے کی مجرم، شوہر کی نافرمانی اور نعوذباللہ اللہ سے مقابلہ..... جسے وہ زندگی دے رہا تھا، آپ نے چھین لی۔"
"ارے ہٹو..... آئیں بڑی مفتی اعظم..... بندے کی سزا سے تو نبٹ لوں..... اللہ کو تو سب پتا ہے۔ ایسے ہی گھونسے برسانا شروع نہیں کر دیں گے..... کم از کم میری بات سنیں گے تو..... یہاں تو سب۔"
"بس..... اب ایک لفظ نہیں۔ کوئی کفریہ کلمہ نہ نکل جائے منہ سے۔ آپ سچی، باقی سب غلط۔" تمکنت نے خوفزدگی کے عالم میں جھٹ سے ہاتھ جوڑ دیے۔
الفت پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔
دنیا کا سب سے آسان کام جرم کرنا ہوتا ہے اور سب سے مشکل کام جرم کو چھپانا..... الفت کی جرم کرنے تک کی پلاننگ بے عیب تھی۔ چھپانے کا پہلو نظروں سے چوک گیا۔ اور جرم بھی ایسا..... اور وہ شوہر سے چھپ سکتا تھا بھلا؟؟؟
اس نے تین ماہ کا حمل ضائع کروایا تھا۔
یہ افضل کی سوچ کے دائرے سے باہر کا عمل تھا۔
انہوں نے نہیں دیکھا۔ ٹھڈے کہاں پڑے۔ گھونسوں نے ناک سجائی یا آنکھ پھوڑی۔
ان کے غصے کی انتہا تھی۔ وہ سات سالوں میں پہلی بار..... پہلی بار اسے باپ کی دہلیز پر روتا سسکتا چھوڑ گئے۔
"اب تمہارے میرے راستے جدا....." غصے میں ایسے جملے نکلا ہی کرتے ہیں۔
مگر الفت کے لیے یہ قطعی فیصلہ تھا۔ افضل کے جملے نے راہ دی تھی۔
افضل کے لیے یہ الفت کی جانب سے انتہا تھی۔ وہ اس سے زیادہ کیا برا کر سکتی تھی۔ اور یہ افضل کی خام خیالی تھی۔
افضل کی سوچ کا اختتام الفت کا نقطہ آغاز ہوتا تھا۔
پھر کیا ہوا.....؟

✲ ✲ ✲

بچے ماں کے حاضری رجسٹر پر غیر حاضری کے سرخ نشان لگانے کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر رخصت اتفاقی ہو یا درخواست کے ساتھ..... وہ تین سے زیادہ دن نہیں برداشت کر پاتے تھے۔

اور اس بار کا جھگڑا تو انتہا تھا۔ افضل کا جانے سے انکار......

اسد بی بی نسیم اور پھپھی کے سامنے بہل جاتا۔ افزا پہلے ہی بی بی اور کاکی کی عادی تھی۔ مسئلہ احد کا اٹھتا ..... وہ الفت کا پرتو تھا اور کوئی بہانہ اس کے بہلاوے کے لیے کارگر نہیں تھا۔ مگر افضل سعید نے زندگی میں پہلی بار احد کے گال پر بھی ایک تھپڑ دے مارا کہ ماں کا نام بھول جائے۔ افضل کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔

ان کا کاروبار ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔

گھر بیچ کر کاروبار میں لگاتے ہوئے وہ ڈرے ہوئے تھے۔ خدشات تھے۔ مگر اب کاروبار نے بھی ترقی کی تھی اور وہ عنقریب گھر خریدنے والے تھے۔ یہ سرپرائز تھا۔

اظہر اور اکمل کے لیے وہ ایک ایک شہ زور ٹرک خرید چکے تھے۔ ان کے نام پر تاکہ ان کی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو۔

الفت پر وقتی طور پر جیسے لعنت بھیج چکے تھے۔

بہن بھائیوں کی ذمے داری اور معاشی مسائل میں گھرے افضل کی زندگی میں کوئی رنگینی نہیں تھی ان کے پاس ان سب کے لیے تو خوابوں کا ڈھیر تھا مگر اپنے لیے کچھ نہیں..... لیکن الفت نے ان کی زندگی میں آکر رنگ بھرے تھے۔ انہیں اولاد دی' گھر بنا..... وہ جیسے قوس قزح میں رہتے تھے۔ لال نیلے پیلے اودے رنگ مگر قوس قزح کی خوب صورتی رنگوں کے گول دائرے مناسب امتزاج اور توازن میں ہوتی ہے۔ رنگ بے ہنگم ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ جائیں۔ اپنا دائرہ بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ تو فقط سیاہی رہ جاتے ہیں۔ آسمان کی سیاہی دنیا کو اندھیرا کرتی ہے۔

رنگوں کی سیاہی منہ پر پڑ جائے تو زندگی اندھیر ہو جاتی ہے۔ اور ایسی ہی ایک کالک تھوپنے الفت ان کی زندگی کی طرف آ رہی تھی۔



گھر کی پے منٹ کرتے ہی افضل سعید نے اپنی مرضی کا کام شروع کروا دیا۔ ان کی ترقی کا سفر قابل رشک اور قابل تقلید تھا۔

افضل سعید کی شدید ترین خواہش تھی ایک نئی نکور ...... گاڑی لینے کی..... وہ اور انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

ہفتے کے آغاز پر..... وہ نیا آسمانی کلف لگا سوٹ اور نئے شوز پہن جب دفتر پہنچے تو ان کی 97ء ماڈل کی کرولا ..... ان کی شان کو چار چاند لگا رہی تھی۔

محنت مشقت کے بعد حاصل انعام کا غرور چہرے پر تنا تھا۔ ان کا سانولا رنگ دمک رہا تھا۔ دراز قامتی انہیں فاتح بناتی تھی۔ حسد' رشک' خوشی حیرت اور مبارکباد کے جملے سمیٹتے وہ دفتر میں داخل ہوئے۔

الفت کی ہٹ دھرمی اور طلاق جیسے..... بے ہودہ مطالبے کے باوجود..... حسب عادت تقریباً" مہینے بھر میں ان کا غصہ دم توڑ چکا تھا۔

وہ گھر' کاروبار اور بچوں میں مصروف تھے۔ الفت فون پر..... انہیں مسلسل طلاق دینے پر اکساتی تھی' بھڑکاتی تھی۔

"چھوڑ کر گئے تھے..... تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

میں نہیں رہوں گی اب۔ ناک سے لکیر کھینچو گے تب بھی نہیں.....

اپنی دولت اپنے پاس رکھو۔ روٹی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ شوہر نے نہیں..... "اماں کانپ جاتی تھیں۔

(اس کی طلاق کی گردان نے تمکنت کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اس کا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔)

اظہر بھائی کے زیر نگرانی اپنے کاروبار پر بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ دوسرے وہ گھر کو بھی دیکھ رہا تھا اس کی بے پناہ مصروفیت' تمکنت کے خدشات کو ہوا دیتی تھی۔

اظہر اور اس کی ملاقات کم ہوتی تھی۔ اظہر کی محبت اسی طرح تھی اس کا التفات اور لگاوٹ نثار ہوتی نگاہیں چھوٹے چھوٹے جملے..... سب وہیں کے وہیں تھے..... مگر تمکنت کے دل کو قرار نہ تھا۔

یہ کاروباری مرکز تھا۔ مال اتارا اور چڑھایا جا رہا تھا۔ میٹنگ' لوگ' رش مگر اس شور میں افضل سعید کا نام پکارا جا رہا تھا۔

وہ کچھ چونک کر تصدیق کے لیے اپنے ملازمین کی جانب مڑے۔

تو حیران ہوئے..... ان تمام کے چہروں پر خوف سے زردی کھنڈی تھی۔

وہ ان کے سوالوں پر جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ان سے نگاہیں چراتے تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟ بولتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟" ایک مسلسل چپ..... وہ الجھ کر خفا ہو کر باہر کو لپکے۔

"سیٹھ صاحب! باہر نہ نکلو۔" ایک بوڑھا ور کر منمنایا۔

"کیوں..... کیا ہوا ہے؟" وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"اکمل..... اظہر..... باہر آؤ..... دیکھو تو۔"

جوان خوان ہے بیٹا.....! ان کو آواز نہ مارو۔" وہی بوڑھا گھگیا تا ان کے روبرو ہو گیا۔

سیٹھ جی سے بیٹا..... انہیں لگا' وہ بچپن کی طرح باہر لوگوں سے بھڑنے جا رہے ہیں اور انہیں ان کے والد صاحب روک رہے ہیں۔

اکمل پیچھے اسٹور میں کارٹن گنوا رہا تھا اور اظہر کوئی کھاتہ کھولے اندراج کر رہا تھا۔ بھائی کی پکار پر باہر آئے تو منظر نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ وہ بھائی سے پوچھنا چاہتے تھے۔

تب ہی "افضل سیٹھ" کی پکار بہت واضح تھی۔ دروازے کے باہر کا رش اب ان کی نگاہوں کے سامنے ہی آ گیا۔ وہ چونکے اور تیزی سے بھائی کے پیچھے لپکے۔ نئی نکور 97ء ماڈل کی سیاہ کرولا..... کے نزدیک رش تھا۔

کیا گاڑی کو کوئی نقصان پہنچا؟؟؟

ان کے دفتر کے عین سامنے والے دفتر کے بیرونی حصے پر رکھی میز اور کرسی کے پاس ہجوم کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایڑیاں اٹھا' سر نکال ایک دوسرے کی بغلوں میں منہ دیے۔ اندر جھانکنے کی جستجو میں ایک دوسرے سے پیر کچل رہے تھے۔

مگر افضل سعید اور ان کے پیچھے آتے اکمل و اظہر کو دیکھ دائرے کا ابر خود بخود کھنچ گیا۔ ان کے لیے راستہ بن گیا۔ افضل کے دائیں ہاتھ میں موبائل اور بائیں میں نئی گاڑی کی چابی تھی۔ اکمل ہلکے براؤن سوٹ کے ساتھ تلے والے پسندیدہ جوتے میں تھا۔ جبکہ اظہر سیاہ جینز کے ساتھ گرے ٹی شرٹ میں اس کی انگلیوں میں پین پھنسا تھا۔

یہ ایک بہترین کاروباری صبح کا آغاز تھا۔ لیکن.....

تینوں بھائیوں کی نگاہ ایک ساتھ ہی سیاہ و سفید پرنٹ کے لان سوٹ میں ملبوس الفت پر پڑی اس نے دوپٹے کی بکل مار رکھی تھی اور ایک درمیانے سائز کا پرس بغل میں پھنسا تھا۔

آسمان ان کے سر پر گرا.....

دن کی تیز چمکیلی روشنی سیاہ تاریکی میں بدل گئی کہ آنکھوں سے بینائی رخصت ہونے کا گمان ہوا.....

پتھر کا ہو جانا لغت کا محاورہ نہیں ہے ایسا حقیقت میں بھی ہوتا ہے۔ وہ تینوں خوب صورت' خوش لباس' بے عیب مجسموں میں ڈھل چکے تھے۔

مگر اذیت اور ذلت یہ تھی کہ وہ مجسمے نہیں تھے۔ ان کا سانس چلتا تھا وہ اپنی عزت کے نکلتے جنازے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور سن رہے تھے۔

"جب میں رہنا نہیں چاہتی اس شخص کے ساتھ..... منہ سے طلاق مانگ رہی ہوں تو دیتا کیوں نہیں۔ ہو گا دولت مند' شان و شوکت' پیسے والا' بنائے بنگلے اور محل۔ گھومے بڑی گاڑیوں میں' خریدے ٹرک اور دنیا کی ہر شے.....

مگر میرے کس کام کی..... میں کیوں رہوں جب میں رہنا نہیں چاہتی..... مل جائے گی اسے دولت کے بل بوتے پر اور کوئی پاگل کی بچی مار کھانے کے لیے۔ بڑا عقل کل بنتا ہے۔ سمجھاؤ ناں آپ اسے..... کیوں نہیں فارغ کرتا مجھے۔ اس دن چھوڑ کر تو آیا تھا ناں..... پکا کاغذ کیوں نہیں دیتا۔"

کہتے ہیں مرنے کے بعد اعمال کے کارن چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ خوفناک ہیبت ناک اور اگر کسی زندہ کا چہرہ بگڑے تو..... افضل سعید کے جسم میں خون کی ایک بوند نہیں باقی تھی پھر بھی وہ زندہ کیوں تھے۔

اظہر کے منہ سے صرف بھابھی نکل سکا تھا۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

اکمل کو سب سے پہلے ہوش آیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"کیا کر رہی ہو بھابھی.....؟" اس نے اس کا شانہ ہلایا۔

"ارے ہٹو..... بھابھی کے بچے..... کوئی بھابھی والی نہیں۔" اس نے جھٹکے سے اپنا شانہ چھڑوایا۔

"آپ دوست احباب ہیں۔ کاروباری ناتا ہے۔ مشورے دیتے ہیں۔ سمجھائیں اسے' جب میں رہنا نہیں چاہتی تو فارغ کر دے..... اس کا راستہ صاف میرا بھی..... رکھے اپنے بچے بھی..... مجھے نہیں لینے۔ جب شوہر ملے گا تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ میرا کیا خاک بگڑا ہے۔" اس نے ٹھینگا دکھایا۔ "ہونہہ!"

اس کے کاروباری حریف حشمت اللہ کا دل لرز اٹھا۔ وہ کچھ دیر پہلے افضل کی نئی گاڑی پر رشک کر رہا تھا۔ وہ اب افضل کے حال پر کس کیفیت کا اظہار کرے..... اسے توبہ کرنی چاہیے۔

"عزت سے ذلت کا سفر اتنا مختصر.....؟"

اس کا دل چاہا' وہ اس عورت کا گلا گھونٹ دے۔ افضل سعید کے عزت کے جنازے میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

خوف خدا رکھنے والوں کے لیے یہ مقام عبرت تھا۔ وہ افضل سعید کو زمانوں سے جانتے تھے۔

"کیوں..... کیا کب کیسے.....؟ وہ عورت سچی بھی ہوتی مظلوم بھی.....

تب بھی اسے اس طرح یہاں آ کر..... آہ۔

"اب چپ کا ہے کی لگی ہے۔ دھمکی تو بڑی شان سے دے گئے تھے۔ میں تمہیں جی کر دکھاؤں گی۔ پوچھتے رہنا پیسے سے ناک..... ہونہہ۔

پیسہ کیا ہے ہاتھ کا میل..... لو میں نے جھاڑ دیا۔" اس نے تالی پیٹنے کے انداز میں ہاتھ بجا کر رگڑے۔

بے یقینی' خوف' سکتہ' جھٹکا..... ذلت' الفت کے ساتھ گزارے سات سالوں کی فلم نظروں میں پھر گئی۔

پھر اس کے ابھی کے جملے کانوں سے ٹکرائے۔

انہیں غش سا آ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سہارے کے لیے اٹھے ہاتھ کو اظہر نے تھام لیا تھا۔

"میں..... میں افضل سعید..... میں افضل سعید چوہدری..... الفت بیگ کو طلاق..... دیتا ہوں..... طلاق..... طلاق دے چکا ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں..... کوئی گنجائش..... نہیں..... کوئی..... رشتہ نہیں..... میں..... افضل سعید..... میں..... افضل۔ میں افضل....."

اونچا لمبا' عزت دار' شاندار مرد..... ہوش و حواس سے بے گانہ ہونے کو تھا۔

☼ ☼ ☼

"پرسوں کہا تھا نئی گاڑی میں مما کو لینے جائیں گے اب تو چار دن ہو گئے گاڑی پرانی ہو گئی۔ مما نہیں لائے۔" کوثر تو اسے سلا کر آئی تھی۔ بہلا پھسلا کر ڈانٹ کر پچکار کے..... ابھی وہ افضل سعید کے پاس آ کر بیٹھی ہی تھی۔ احد آنکھیں مسلتا آ گیا۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے تھے۔ پھولے گال خفگی کے باعث کپا معلوم ہوتے تھے۔ افضل سعید اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کا ذہن کہیں دور خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ اس کا گندمی رنگ' آنکھوں کی بناوٹ' ناک اور ٹھوڑی کا کٹ سب الفت جیسا تھا۔ وہ ان تین دنوں میں سب بھول چکے تھے مگر یہ ننھا چہرہ ایک دوسرے چہرے کی یاد جگا رہا تھا۔

اور یہ یاد اپنے جلو میں اور بھی بہت کچھ لائی تھی۔ ورنہ وہ ہر شے کو بھولے ہوئے تھے جیسے۔

"لے جاؤ اسے کوثر..... اب کوئی نیا ڈرامانہ شروع ہو۔" اکمل بھی نیم تاریک کمرے کے کونے میں

صوفے پر بیٹھا تھا۔

کوثر ہمت مجتمع کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ سب سے مشکل کام احد کے چہرے سے جھلکتی ہٹ دھرمی اس کے ارادے ظاہر کر رہی تھی۔

اور افضل سعید کا بے تاثر چہرہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کچھ سن نہ رہے ہوں کچھ دیکھ نہ پا رہے ہوں کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو......

ساری زندگی دامن بچا بچا کر چلنے سے کیا حاصل ہوا جب انت میں اتنی غلاظت کے اندر منہ کے بل گرنا تھا کبھی نہ اٹھنے کے لیے......

اتنی بڑی زندگی اور صدیوں پر پھیلا قصہ ایک جملے کے ادا ہونے کے بعد ختم ہو گیا۔ احد کی پکاریں اور چیخ چیخ کر رونا رات کے سناٹے میں اعصاب کے لیے کڑا امتحان تھا۔

"چلانا بند کرو۔ مر گئی وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔" افضل چوکھٹ پر کھڑے تھے۔

نہیں...... نہیں مری نہیں۔ نانا میاں کے گھر گئی ہیں۔ مجھے ممی چاہیے لا کر دیں۔" وہ ضد میں الفت سے آگے تھا۔ باپ کے چہرے کا سناٹا اور آنکھوں کی مردنی اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ افضل کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ احد کا بازو دبوچ لیا۔

اکمل اور کوثر نا سمجھی کے عالم میں تھے۔ شور کی آواز سے اسد آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

"آج کے بعد ممی کا نام نہیں لینا...... کبھی نہیں...... بھولے سے بھی نہیں...... غلطی سے بھی نہیں...... وہ اس گھر میں اب کبھی نہیں آئے گی۔ بھول جاؤ کہ ماں تھی بھی۔" باپ کے ٹھہرے لہجے نے احد کے جنون کو روک دیا تھا۔

"مما لا دیں۔" وہ سسک رہا تھا۔

اس کا لرزتا سسکتا وجود، سرخ دہکتے آگ جیسے گال...... بھیگی چپ چپ کرتی پلکیں وہ نیند کی وادی میں چلا گیا تھا یا بے دم ہو چکا۔



"میرا قصور اظہر......؟" اس کی بھری آنکھوں سے لہو ٹپک رہا تھا۔

"اور میرا قصور تمکنت جلال بیگ؟"

"مم...... مم...... دنیا کو کیا جواب دوں گی...... کیا منہ دکھاؤں گی؟"

"ویسا ہی منہ اور وہی جواب جو...... میں دنیا کو دے رہا ہوں۔" اظہر اپنی شہادت کی انگلی اس کے شانے میں چبھو چبھو کر کہہ رہا تھا۔

تمکنت کے پیر اکھڑ گئے وہ لہرائی تو گرنے کے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

"آپ...... تو مجھے بہت اچھی طرح جاننے کا دعوا کرتے تھے۔" وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"جاننے کا دعوا۔" وہ سرعت سے پلٹا۔ "اس وقت میں خود کو بھی بھول بیٹھا ہوں۔ اپنا نام، مقام، رشتے سب بھول چکا ہوں۔ یاد ہے تو صرف ایک تماشا گاہ جہاں ہماری زمانوں کی کمائی عزت لوگوں کے پیروں میں رُل رہی تھی۔ ہمارے شملے تماش بینوں کی ٹھوکروں میں پڑے تھے یاد ہے تو......"

تمکنت صوفے کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔ اظہر کے دونوں ہاتھ صوفے کی ہتھی پر تھے اور وہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

"اور...... محبت؟" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نوحہ پڑھا تھا۔

"او...... ڈیم اٹ...... محبت۔" وہ بھنا کر ایڑیوں پر گھوم گیا۔

"محبت اور عزت میں سے ایک چیز چننی ہو تو میرے ہاتھ صرف عزت کی طرف بڑھیں گے۔"

"تو تھام لیجیے ناں میرا ہاتھ...... میں آپ کی عزت ہی تو ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ "محبت بھی اور عزت بھی۔"

"عزت اس روز بازار میں سرعام لٹ گئی تھی اور محبت نفرت کے جذبات کو میں بھول گیا۔ ایک بے حسی ہے بس......"

"لیکن میرا قصور تو بتایئے۔" وہ بے دم ہو چکی تھی۔

"تو میرا جرم بھی بتا دو...... میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتا کہ وہ جا رہا ہے اظہر وہ جس کی بھابھی (آخ تھو) نے اس روز...... میں شاید زندگی بھر دفتر والے روڈ پر نہ جاؤں۔"

"لیکن میرا نام...... ناکردہ جرم کی سزا مجھے کیوں ملے۔"

"صرف تمہیں نہیں...... میں بھی بھگت رہا ہوں۔ ہمارا پورا خاندان، آنے والی نسل۔"

"میں ان جیسی نہیں ہوں اظہر......" رو رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

وہ اسے کیسے ٹھکرا کر جا رہا تھا۔

الفت نے اپنا کارنامہ بہت فاتحانہ انداز میں بے فکری سے بتایا تھا۔ رونا پیٹنا۔ بین کرنا سب ثانوی باتیں تھیں۔

وہ سرعت سے فون کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اظہر سے تصدیق چاہتی تھی۔ وہ افضل سعید سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی انگلیاں پاگلوں کی طرح فون کے بٹن دباتی رہیں مگر ہر در بند ہو چکا تھا۔

وہ حق دق سب کی صورتیں دیکھتی اور صبح سے شام کرتی۔

دنیا بھر سے منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے فیروز بیگ اس کے کسی کام نہ آسکتے تھے۔

کوثر اس کی مددگار بنی...... بھائی کے گھر اور زندگی کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر تمکنت اور اظہر کے رشتے کی فکر کھا رہی تھی۔ لیکن وہ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہتی تھی مگر یہ وقت بڑا کڑا تھا۔ ہر وقت الٹا ہی پڑتا تھا۔

افضل سعید دنیا سے منہ چھپا کر گھر میں پڑے تھے۔ اظہر اور اکمل کی رہائش وہیں دفتر کے اوپر تھی۔ وہ کب تک لوگوں کا سامنا نہ کرتے۔

اور وہ اکمل تھا انیس برس کا جوشیلا، خوش مزاج شوخ و شنگ رنگوں پر جان دینے والا کلف لگے کپڑے پہننا اور تلے والے جوتے اور تھسے، بیش قیمت گھڑیاں دل جان سے لگا کر رکھی بائیک...... اپنے ظاہری حلیے سے وہ ایک مغرور تاثر دیتا جو سامنے والے کو جھجک میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسے کاروباری حریف کے بیٹے نے روک کر پوچھ لیا تھا۔

"اس روز کیا ہوا؟" وہ بظاہر افسوس کر رہا تھا۔ افضل سعید کے طلاق والے فوری ری ایکشن کو سراہ رہا تھا مگر اس کے لہجے کی تضحیک اور آنکھوں سے چھلکتی کمینی مسکراہٹ۔ اکمل کے پورے وجود کو جھلسا گئی۔

وہ راستے میں کتنوں کو مارتا اور کتنوں سے بچتا گھر آیا تھا۔ اس کی ٹھوکروں سے گملے ٹوٹ گئے۔ دیوار گیر آرائشی شیشہ گلاس مار کے توڑ دیا۔ اس نے احد کے گال پر تھپڑ مارے پھر اپنے ان ہاتھوں کو دیوار سے ٹکرانے لگا اور آخر میں بے دم ہو کر اپنے بال نوچتا ڈھے گیا۔

"اکمل...... اکمل میرے ویر......!" بہنوں کے ہوش اڑ گئے۔ بڑی باجی اس سے چمٹ گئیں۔ کوثر پانی کا گلاس لے آئی۔ چھوٹی باجی بال سنوارتے ہوئے منہ سر چومنے لگیں۔

"ہمارا کیا تعلق اس کٹنی سے...... ختم قصہ...... اب ڈر کیسا؟"

"لیکن! لیکن میں کس منہ سے دفتر جاؤں باجی! لوگ آوازیں کسیں گے وہ دیکھو، جا رہا ہے وہی چوہدری اکمل سعید جس کی بھابھی۔" اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے۔

"کیسی شرم!" بڑی باجی نے چمک کر کمان اپنے ہاتھ لی۔

"کہنے والے کیا عقل کے اندھے...... یا بہرے تھے۔ سرعام بے عزت کرنے والی عورت اپنے تئیں منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ تماشا لگانے...... تماشا تو اس کا لگا۔ سہاگن بن کر آئی تھی اور طلاقن بن کر لوٹی...... آتے وقت کسی نے پہچانا ہو گا تو افضل سیٹھ کی بیگم...... اکمل اظہر کی بھابھی...... سعید سنز کی مالکن...... کسی کامے (کام کرنے والا) نے سلام بھی جھاڑا ہو گا پہچان کر راستہ بھی دیا ہو گا اور جب لوٹی...... تو کیا اوقات تھی

ٹکے کی نہیں..... نہ بیوی رہی نہ بھابھی نہ مالکن..... آتے وقت کوئی اسے ترچھی آنکھ سے دیکھتا تو آنکھ نکال کر ہاتھ پر رکھنے والا شوہر اور دیور تھے۔

اور واپسی میں کوئی ہاتھ پکڑ اندر بھی گھسیٹ لیتا تو کون والی وارث ہوتا تھا۔ کٹی پتنگ.....

وہ میرے بھائی کے منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ آئی تھی ناں..... خود کیسے لوٹی ننگے سر۔" ہونہہ۔

بڑی باجی کے اندر کا عناد اور غصہ رونے دھونے پیٹنے اور چلانے کے بعد اس وقت صرف اکمل کی تشفی کے لیے ٹھہراؤ بھیما اور دلائل سے پُر تھا۔

ورنہ بہنوں کی محفل میں وہ باقاعدہ مغلظات سے اسے کوس رہی تھیں۔

اکمل کے دہکتے دل و دماغ پر سکھ کی پھوار برس رہی تھی۔

ہاں انہوں نے یہی تو کہا تھا۔ وہ سینہ تان کر چل سکتے تھے۔ ان کی غیرت پر حملہ کرنے والی کو منہ توڑ جواب طلاق سے بڑھ کر کیا تھا۔

اکمل کوثر کے دیے پانی کے گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تب ہی نگاہ سیڑھیوں پر کھڑے اظہر پر پڑی۔ وہ اوپر سو رہا تھا۔ شور کی آواز سن کر آیا تھا۔

اس نے اکمل کا ردعمل اور بہنوں کے جملے سب سنے تھے۔ اس کا دماغ سن تھا۔ اس کے فون پر مستقل ایک سسکیوں بھری کال تھی۔ جسے وہ ڈسکنکٹ کر رہا تھا۔

ایک دمکتا چہرہ سسک رہا ہے۔ اس نے فراموش کر دیا تھا۔

زندگی بس اس "صبح" پر محیط ہو گئی تھی اور کچھ نہیں۔

اکمل کو اچھو سا لگا۔ وہ اظہر کی جانب انگلی کر کے چلایا۔ وہ بہنوں سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ اب کوئی تعلق نہیں..... اس کا ہے ناں۔ وہ اس ناگن کی بہن..... یہاں اس گھر میں میرے سامنے..... گھومے گی۔

اس سے کہو اسے فارغ کرے..... ابھی اسی وقت..... بولیں آپا....." وہ ایک بار پھر جنونیوں کی طرح چیخنا شروع ہو گیا۔

اظہر سیڑھیوں سے اترا۔

"میں نہیں لاؤں گا اسے اکمل..... کبھی نہیں..... کبھی بھی نہیں۔ میں بھی اسے طلاق دے رہا ہوں۔" وہ اس کی تشفی کروا رہا تھا۔

چھوٹی باجی اور کوثر لرز اٹھیں۔

"نہیں اظہر..... نہیں۔" کوثر اظہر کی پشت سے چپک گئی۔

"نہیں اظہر۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے اور سر نفی میں ہل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اظہر سے ملنے کی تمام کوشش بے سود تھیں۔ وہ اس کے ہاتھ آ کے نہیں دے رہا تھا فون نہیں سنتا تھا۔ اس نے پی سی او سے فون کیا اور چھوٹتے ہی بولی۔

"مجھ سے ایک بار مل لیں اظہر..... خدا کے لیے..... بس ایک بار۔" آپ گھر نہ آئیے گا۔ اسکول آجائیں۔ پلیز اظہر..... میں مر جاؤں گی۔ ف..... فون مت رکھیں اظہر! ہماری زندگی داؤ پر لگی ہے۔"

"ہماری زندگی ختم ہو چکی ہے۔" اس نے پہلی بار جواب دیا تھا۔

"نن..... نہیں۔ آپ میری بات تو سنیں۔" اگر آپ نہ آئے تو میں آجاتی ہوں آپ کے پاس اظہر! آپ جگہ بتائیے۔ میری کوئی نہیں سنتا..... بھائی اتنی دور..... آپا خود پریشان۔ وہ آئیں گی۔ چچا بستر پر پڑے ہیں۔ میں کس سے کہوں؟" رونے سے تمکنت کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں فون نہ کرنا تمکنت دوبارہ کبھی..... میں۔"

"میں آپ کے دفتر آجاؤں گی۔ آپ مجھ پر ایسے ظلم نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر رو پڑی اور اس کی تیزی اظہر کے وجود کو دہکتے کوئلوں پر ڈال گئی۔

"او آئی سی..... یہی..... یہی تو بات ہے۔ جانتا ہوں الفت بیگ کی بہن دفتروں چوراہوں تک آسکتی ہے۔ ہو ناں اسی الفت کی بہن..... متزلزل تھا میں، تمہارے اس پلان نے ذہن کلیئر کر دیا۔" وہ دانت پیس کر زہر خند بولا۔

"مگر دیکھ لو بی بی! ایک دفتر آنے والی کو کیا ملا..... تم بھی آ کر دیکھ لو..... کر لو شوق پورا۔"

وہ چبا چبا کر بولا اور ریسیور پٹخ دیا۔ وہ درمیان میں روتے ہوئے تڑپ تڑپ کر "اظہر! اظہر میری بات تو سنیں۔" پکارتی رہی "نہیں..... اظہر میری تو سنیں آئی ایم سوری میرا وہ مطلب نہیں اظہر....." وہ نڈھال ہو کر ڈھے گئی تھی۔

آپا کے ہاں چند روز میں بچے کی پیدائش متوقع تھی اور تمکنت کا معصوم دل لرز رہا تھا۔ وہ کہاں جاتی، کس سے کہتی۔ چچی اماں کو چپ لگ گئی تھی اور چچا فیروز بیگ دنیا سے منہ چھپائے بستر پر۔ گھر میں موت کا سناٹا تھا موت سے پہلے کا..... موت کے بعد کا۔

☼ ☼ ☼

"عدت کاٹ کر چلی جاؤں گی۔" اس نے ماں کے کوسنوں کے جواب میں مزے سے کہا تھا۔ اس کے پرس میں خوب نوٹ تھے۔ اپنے ذاتی..... اور افضل سعید کی جانب سے مہر کی رقم اور زیور..... نجانے وہ کس بے حس مٹی سے بنائی گئی تھی۔

اس صبح کے منظر کو قصداً" دہرا دیکھتی اور ان بھائیوں کے چہرے یاد کر کے حظ اٹھاتی۔ اسے بچے یاد نہیں آتے تھے۔ وہ ایف ایم ریڈیو کان سے جوڑے چھت پر نیم دراز رہتی۔ بھوک لگنے پر خود ہی پکا لیتی۔ کبھی پکے پکائے پر آ بیٹھتی۔ باہر سے سموسے رول منگوائی۔

اس کی بلا سے کہ کس کس کی زندگی آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔

تمکنت کی خیر خواہ کوثر تھی۔ اس نے اسے مطمئن رہنے کا مشورہ دیا۔

صحیح وقت کا انتظار..... افضل سعید کا نارمل زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ اکمل کے پرسکون ہونے۔ الفت کی دہکائی آگ کے سرد ہونے کا۔

مگر اس دن اکمل کے جنونی رویے، بے ہودہ فرمائش اور اس پر اظہر کی کرائی جانے والی تشفی۔ کوثر کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ان دونوں کی محبت سے واقف تھی۔ وہ تمکنت کی فطرت آشنائی کی دعوے دار بھی تھی۔

دوسری جانب اظہر کا دھماکے دار فیصلہ..... وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔

کیوں.....؟ کہاں.....؟ کب کس لیے.....؟ ابھی چند روز پہلے تک وہ کوثر جیسی سہیلی نما بہن کو قائل کر رہا تھا کہ اب حد ہو گئی ہے رخصتی لی جائے اور اب.....

وہ تمکنت سے اسکول جا کر ملی اسے اپنے گھر بلایا اور اظہر کو بھی بنا ارادہ ظاہر کیے بلوا لیا۔

اس کا خیال تھا۔ وہ تمکنت سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی موہنی صورت دیکھ اس کا سہما بکھرا اجڑا سراپا دیکھ کر پگھل جائے گا۔

"تم بیوی ہو۔ کیسے بھی کر کے منا لینا..... منت ترلے کر کے۔ رو پیٹ کر۔ لڑ کے، جھگڑ کے لپٹ کے..... اور مرد کا دل پگھلنا کیا مشکل ہے اور جب عورت بھی دل دار ہو تو..... اسے روک لینا۔"

اظہر اس کی ایک جھلک پانے کے لیے گھنٹوں دھوپ میں جلتا تھا۔ اتنے دنوں بعد اس کو دیکھ سب بھول جائے گا۔ کوثر نے اسے اندر دھکیل چٹخنی لگا دی۔

مگر یہ کوثر کی بھول تھی۔ اسے سب کچھ یاد آگیا تھا۔

وہ سب کچھ جو تمکنت کی، ان دونوں کی زندگی کو برباد کرنے والا تھا۔

وہ روتی رہی اور یقین دلاتی رہی کہ وہ دھندلی آنکھوں سے دھند بھرے آئینے میں اس کی صورت نہ دیکھے ایک ہاتھ مارے تو چہرہ واضح ہو جائے۔

اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ وہ "اس" جیسی نہیں ہے۔ وہ آخری سانس تک اس کا انتظار کرے گی۔

وہ بے یقین تھا اور اس کے دعوے کو استہزا سے

دیکھتا تھا۔

وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

وہ ٹھوکر مار گیا۔

دروازہ باہر سے بند تھا..... غصے نے اس کا دماغ آگ سے بھر دیا۔ اس کی ٹھوکر سے روشن دان کے پٹ بند ہو گئے۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں کوثر!" وہ حلق کے بل چلایا۔

کوثر باہر کھڑی کانپتی رہی۔ اس کے پیروں میں دم نہیں تھا۔ "ان اوچھے ہتھکنڈوں سے تم کیا جیتنے آئی ہو؟"

اس نے اس کا بازو دبوچا..... وہ سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اظہر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور اس کے بولنے کی صلاحیت پر شیطان کا قبضہ ہو گیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے..... آ گئی تمہارے ان آنسوؤں کی سمجھ۔ بے فکر رہو۔ تمہیں نامراد چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" تمکنت کے آنسو رک گئے۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں اظہر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگ جوگ کاٹنے والی تھوڑی ہو..... کرنا انجوائے لائف..... تمہارا مسئلہ حل کر کے جاؤں گا۔ ناانصافی کیوں بھئی؟"

"میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اس رشتے سے..... مزے سے نیا راستہ بنانا۔"

"آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا۔" تمکنت نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

متورم چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں، روتی ہوئی۔ بلکتی ہوئی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ یک دم خاموش ہو گیا۔

شیطان کامیاب ہو گیا تھا۔

تمکنت تیورا کے نیچے۔

اظہر کی دھاڑ نے کوثر کو کنڈی کھولنے پر مجبور کر دیا۔

"اچھا کیا تم نے..... مجھے تو دھیان ہی نہ رہا..... اتنے فون اور ترلے منتیں کس لیے ہو رہی تھیں۔ حل کر دیا ہے میں نے اس کا مسئلہ..... اب اجازت ہے۔ شکر دل پر کوئی بوجھ لے کر نہیں جا رہا۔"

وہ باہر نکل گیا۔ کوثر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

☼ ☼ ☼

تیرہ سالوں کی چار ہزار سات سو پینتالیس راتوں کو اس ایک رات میں سوچ لینا۔ کتنا عجیب لگتا تھا۔ اذیت کا ہر پل ہزار سال جتنا طویل ہوتا ہے۔ تو اس طرح تو شاید وہ اس وقت سے اذیت جھیل رہی تھی جب یہ دنیا تخلیق کی گئی تھی اور ابھی بھی خاتمے کی کوئی امید نہیں۔

وہ پاگل پن کر رہی تھی۔ ایک ضد کے پیچھے زندگی برباد..... اس نے عدالت سے رجوع کیوں نہیں کیا۔ وہ اب تک اس نام نہاد رشتے کو کیوں نبھا رہی تھی۔ ایسے سوالات کے اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔

وہ جواب میں کیا کہتی..... یہ انا نہیں تھی۔ اس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی چیلنج قبول کیا تھا نہ رشتے کی ڈور ٹوٹی تھی۔

ساری دنیا کے قیافے غلط تھے۔ وہ دور دور کی کوڑیاں لاتے..... احمق اتنی سی بات نہیں سمجھتے تھے یہ جوگ نہیں روگ تھا اور اسے محبت کہتے ہیں۔

وہ آپا کے پاس چلی گئی اور حیدر آباد کے بہترین اسکول میں ملازم ہو گئی اس نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ زندگی بس صبح اور شام تھی نہ کہیں آنا نہ جانا..... نہ کوئی دوست نہ دشمن..... وہ جانتی تھی۔ وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ وہ کوثر کو فون کر کے سب خیریت کی تسلی لیا کرتی تھی۔

اس نے دوبارہ کبھی کراچی شہر کا رخ نہیں کیا۔

یہاں وہ سڑکیں تھیں۔ جن پر وہ اس کو ہوا میں اڑائے پھرتا تھا۔

وہ بلند عمارتیں جن کی وہ یونہی خوامخواہ گردن اٹھا کر منزلیں گنا کرتے تھے اور وہ سمندر اور ساحل جو قدموں کے نشانوں کو خود پر پل بھر کے لیے بھی ٹھہرنے نہیں دیتا۔ اس کی ہر لہر ثبوت مٹاتی جاتی ہے۔

ہاں قدموں سے لپٹی ریت چلنے والوں کے گھروں تک جاتی ہے اور اس کی تو آنکھوں میں یہ ریت بھر گئی تھی۔

اس نے سب کی خبر رکھی تھی۔ خود کو بھول کر.....

افضل سعید کی خاموشی اور بے حسی یوں معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ جائے گی۔ مگر ایک روز وہ بہت نارمل انداز میں اٹھے اور یوں دفتر کی طرف روانہ ہوئے جیسے چھٹیاں گزار کر اگلے روز بندہ ایک نئی لگن سے روانہ ہوتا ہے۔ ان کی سیاہ کرولا اس روز کے بعد جب اس دن احاطے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا۔ چلتے ہاتھ اور اٹھتے قدم رک گئے۔ لوگ منہ کی بات بھول گئے تھے۔

کچھ نے ہڑبونگ پر قابو پاتے ہوئے سلام جھاڑا تھا اور افضل سعید نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا تھا۔

وہ اپنے ہمیشہ والے حلیے میں تھے۔ سفید کلف لگے کپڑے سیاہ چمکیلے جوتے گاڑی کی چابی اور موبائل..... ان کا دراز قد نمایاں اور کندھے سیدھے تھے۔

کاروباری مرکز میں آنے اور جانے والے بچے بچے کو اس صبح کا منظر ازبر تھا۔ یہ ایک علم تھا گویا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا تھا۔

لیکن افضل سعید نے جیسے پلٹ کر نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا کرنے کے فن میں ماہر ہو چکے تھے۔

ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اسد سعید۔ احد سعید اور افزا سعید..... اور بہن بھانجی، زندگی میں عورت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا عورت ذات سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ بہنوں سے ان کی تنہائی دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر گھر سنبھالنے کا بھی مسئلہ تھا۔ افزا بہت چھوٹی تھی۔ اس کی دیکھ بھال ملازموں پر نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ بہنیں ان کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔ مگر ان کا ایک ہی انکار تھا۔

"ایک عورت..... کی وجہ سے آپ سب کو برا نہیں کہہ سکتے۔" کوثر نے احتجاج کیا۔

"میں سب کو برا نہیں کہہ رہا..... میرے حصے میں اچھی عورت ہوتی تو پہلی بار ہی میں مل جاتی مگر اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں۔"

لیکن بچوں کی تربیت کا مسئلہ کھڑا تھا۔ انہیں سر جھکانا ہی پڑا۔

ان میں کمی بھی کیا تھی۔ اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔ بڑی باجی نے بہت دیکھ بھال کر انتخاب کیا۔ فاطمہ پڑھی لکھی، سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا۔ افضل سعید کو اب حسن کی چاہ نہیں تھی لیکن گھونگھٹ اٹھا کر جب فاطمہ کو دیکھا تو ششدر رہ گئے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔

اس کے حسن میں عجیب سی کشش اور تمکنت تھی۔

چہرے پر سنجیدگی اور متانت نے اس کی شخصیت میں ایک وقار سا پیدا کر دیا تھا۔ الفت کے ناز و انداز، لاابالی پن، ادائیں اس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو الفت کی یاد دلاتا۔ افضل سعید کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔ زندگی ایک ڈھرلے پر رواں ہو گئی تھی۔

افزا اپنی ماں کا ماضی اور باپ کا حال جانتی تھی۔ وہ بہت محتاط خاموش اور سمجھ دار بچی تھی وہ اپنی عمر کی باقی بچیوں کی نسبت زیادہ سنجیدہ تھی۔ کچھ ڈری سی..... لیکن اس کے دل و دماغ میں راسخ تھا کہ اسے بہت اچھی بیٹی بننا ہے۔ بہت اچھی.....

افضل سعید کی زندگی کا مسئلہ احد سعید رہا تھا۔ سال بھر کی عمر ہی سے وہ ایک ضدی بچہ تھا۔ ہٹ دھرم، بدتمیز اور ماں کے جانے کے بعد وہ جیسے ہاتھ سے نکل جانے والا تھا۔ لیکن اکمل نے اسے اپنی سرپرستی میں

لے لیا۔ اس کا ہر طرح خیال رکھا۔
انیس برس کی عمر میں لگنے والا جھٹکا جیسے اکمل کو دنیا کی حقیقت دکھلا گیا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ اس کا جوشیلا مزاج نرم روی میں بدل گیا۔ وہ دوستوں کی مجلس کا شائق تھا پھر کتابوں سے دل لگا لیا۔ اس کی سخت مزاجی اور پر غرور انداز نجانے کب عاجزی اور نرمی میں ڈھلا کہ وہ خود نا آشنا رہا۔
اسد اور احد بڑی باجی اور دیگر اہل خاندان کی موشگافیوں کے باعث بہت کم عمری میں سب چیزوں سے باخبر ہو گئے۔ وہ بہت بڑے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کی عزت تھی۔ افضل اور اکمل نے ان پر کڑی سے کڑی نگاہ رکھی تھی۔
وہ کالج جاتے تھے۔ اکمل کے ساتھ پانچ ٹائم مسجد اور درس میں شرکت کرتے۔ ان کے موبائلز پر باپ اور چچا کا بہت پکا چیک تھا..... وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ الگ تھے۔ مگر ٹھیک تھے۔
انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ انہیں سنبھال لیا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

سزا اور جزا انسانوں کے ہاتھ دی جاتی۔ تو انسان کی اذیت پسند، خود غرض، طوطا چشم فطرت کبھی تھوڑے پر اکتفا نہ کرتی۔ وہ سزا سنا تا ڈو مور کے نعرے کے ساتھ .....
اظہر سعید تیرہ سال بعد لوٹ آیا تھا۔
وہی شہر وہی ہوا، وہی لوگ..... ہاں وہی لوگ۔ پتھر دل بے درد.....
افضل سعید نے اپنے بچے بہت محنت سے پالے تھے۔ ماضی کے کسی طعنے کے بغیر۔
اکمل سعید کے چہرے پر پھیلی عاجزی اور نرمی اس کے احساس جرم کو بڑھاتی تھی۔ اسے اپنے کیے پر جی بھر کے افسوس ہوا۔
یہاں سب ماضی کو بھول حال میں جی رہے تھے۔

وہ سب اسے اچانک اسے دیکھ کر حیران تھے۔
سب زندگی میں آگے بڑھ چکے تھے۔
ماضی کا ایک داغ آج بھی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ مگر اس وقت کی درد چبھن، تکلیف اب یاد بن چکی تھی۔
اس کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے پچھتاووں کو زبان دے سکتا۔
اپنی خود ساختہ جلا وطنی کاٹ کر بھائی لوٹ آیا تھا۔ بہنوں کی خوشی کا حال ہی کیا..... وہ اسے چوم رہی تھیں، نثار ہو رہی تھیں۔ افضل سعید اور اکمل اپنے اندر ایک توانائی ہمت جوانی، خوشی بیدار ہوتے دیکھ رہے تھے۔
اس محفل میں قہقہے تھے۔ لطیفے۔ باتیں..... سب ایک دوسرے سے خوشی کے اظہار میں سبقت لے جانے کی دوڑ میں تھے۔

✡ ✡ ✡

اظہر نے اپنے واپس آنے کا مقصد دہرایا۔ تو جیسے طوفان آ گیا۔ یہاں سب بول رہے تھے۔ اپنی اپنی بولیاں مگر معنی ایک ہی تھے۔
حیرانگی، غصہ..... اچھنبا، بے یقینی.....
اظہر ایسا کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ تو اسے فارغ کر گیا تھا۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر کوثر سے کہا تھا۔ اس نے تمکنت بی بی کا مسئلہ حل کر دیا ہے طلاق دے کر۔ فارغ کر کے..... کوثر کرنٹ کھا کر تمکنت کی جانب مڑی تو وہ۔
زمین پر بکھری لٹی سی بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو اور شکوہ کناں بے بس نگاہیں اظہر کے بیان کی تصدیق کر رہی تھیں۔ کیسے تمکنت جلال برباد واپس پلٹی تھی۔ اس کا دوپٹا جو سر پر ٹکا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے سرک کر کندھے پر گر گیا تھا وہ چلتی نہیں گھسٹتی تھی۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کوثر کو کبھی نہیں بھولی تھیں۔

اور اظہر کہتا ہے۔ وہ اسے لینے جا رہا ہے۔ اسے اپنا بنانے۔
اب اتنا سب ہونے کے بعد..... وہ پاگل دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ یہ تو مذہبی معاملہ ہو گیا ناں..... طلاق دی ہوئی عورت کو دوبارہ..... کیسے..... کیسے۔
اکمل ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "یہی کرنا تھا تو ڈرامہ کیوں کیا۔" اس کی حلیمی بس نام کی تھی۔
بڑی باجیاں الجھ کر ناپسندیدگی سے بھائیوں کو سن رہی تھیں۔ اب باسی کڑھی میں ابال دینے کا فائدہ.....
اور کوثر لرز رہی تھی۔ سال میں ایک بار وہ فون سنا کرتی تھی اس کا۔ وہ پی سی او سے فون کرتی تھی اور حال احوال دیتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ شادی کر چکی ہے تو کیا اس نے نکاح پر نکاح کر لیا اور اگر اظہر ٹھیک کہہ رہا ہے تو اب..... اب کیا ہو گا۔ کون سا طوفان آنے والا ہے۔
تمکنت نے اپنا پتا کبھی نہ دیا۔ وہ بہت کھنکتے لہجے میں محبت سے سب کا پوچھ کر فون رکھ دیتی تھی۔
"مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کب کہا کہ میں بارات چڑھاؤں گا۔ گھوڑی پر بیٹھوں گا۔ میں تو بس اسے لے کر آؤں گا..... نہیں رہوں گا میں یہاں۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"
"اتنے سال گزر گئے بھائی جان.....! باجی! پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر گیا۔ اب محبت لگاؤ نہیں ہے۔ ایک بوجھ ہے جو اتارنا ہے بس۔"
وہ مرد تھا، رو نہیں رہا تھا۔ مگر رونا اور کسے کہتے ہیں؟
"ان پلوں کے نیچے پانی نہیں تھا جو گزر جاتا یہ غلیظ بدبودار کیچڑ تھی جو آج بھی وہیں کی وہیں جمی ہے۔ اور تم پھر اسی گزرگاہ کو اپنانا چاہتے ہو۔"
اکمل چمک کر بولا تھا۔ وہ اپنا سر پھوڑ دینا چاہتا تھا یا پھر اس کا.....
"اس کا قصور کیا تھا؟" وہ بیچ و بیچ کھڑا بول رہا تھا۔ اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ "ہم طاق راتوں میں اذان کے وقت، سورج گرہن دیکھ کر فوراً" سربسجود ہو جاتے ہیں، رو رو کر گڑگڑا اپنے کردہ ناکردہ، شعوری

لاشعوری گناہوں 'جانے انجانے جرائم سے توبہ کرتے ہیں۔ رحم مانگتے ہیں اور اگر کبھی معاف کرنے کا اختیار ہمیں دیا جائے تو ہم صرف فرعون رہ جاتے ہیں۔ کٹھور بے حس ظالم..... بھیانک چہروں والے 'تنگ دل خدا..... جب ہم انسان ہو کر انسان کا جرم معاف نہیں کر سکتے تو پھر کوئی حق نہیں کہ ہم داڑھیاں سجا کر ٹوپیاں پہن کر..... خود کو اللہ کا ماننے والے بتائیں۔ دکھائیں اور جبرا" جتائیں....."

اس کی آواز پھر لڑکھڑا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اتنا اونچا لمبا مرد.....

"میں اپنے لیے نہیں رو رہا۔ میں اس کے لیے نہیں رو رہا۔ خدا کی قسم..... میں تو اللہ سے ڈر..... رہا ہوں۔ اپنے لیے۔ کس منہ سے کب کیسے معافی مانگوں گا۔ کیونکہ جب خدا نے ایک اختیار مجھے دیا تو میں نے کیسے اندھادھند ناجائز فائدہ اٹھایا۔"

"تت..... تمہیں یاد ہے کوثر!" وہ بے چینی سے کوثر کی جانب مڑا۔ "اس کی چادر شانوں سے سرک رہی تھی اور اس کے پیر جوتے سے باہر تھے۔ ایڑیاں زمین پر گھسٹتی تھیں۔

اور مجھ جیسا کمینہ شخص..... (چچ) میں نے تو وعدہ کیا تھا۔ تمام عمر اس کے سر کو ڈھانپ کر رکھنے کا....."

"آپ نے اپنا فیصلہ صحیح کیا ہوگا۔ آپ نے جرم پکڑ لیا تھا۔ میں نے کس بات کی سزا دی؟" وہ افضل سعید سے مخاطب ہوا۔

تیرہ سال کا جوگ کاٹا..... اس پر احسان نہیں۔ کوئی اس قابل ہی نہ لگی۔

میں نے اسے کیا اپنانے جانا ہے 'وہ مجھے اپنائے گی؟ وہ تو سرخرو رہی..... ہمارے منہ پر دوسری بار بھی کالک ایک عورت ہی نے ملی۔

پہلی نے بے وفائی 'بے عزتی سے..... اور دوسری نے وفا سے عزت کو سنبھال کے۔ رکھ کر۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور آپ اسے معاف نہ کرنے کا کہہ رہے ہیں..... میرا تو دل لرز رہا ہے۔ وہ مجھے معاف کرے گی اور اس نے نہ کیا تو..... اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

✲ ✲ ✲

عصر اور مغرب کا یہ درمیانی وقت افطاری کی تیاری کے باعث چٹکی بجاتے کیسے گزر جاتا تھا۔ پتا نہیں چلتا اوپر سے آج صبح ہی سے کالے کالے بادل ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سارے حیدر آباد شہر پر تن گئے تھے۔ ان بادلوں کو برسنے میں نجانے کیا جھجک مانع تھی۔

تمکنت مین گیٹ تک جاتی اندرونی پتلی راہداری میں کرسی ڈال کر قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ وہ افطاری میں مدد دینے کے بعد مغرب کی اذان سے بیس منٹ پہلے ایک پارہ پڑھتی تھی۔ لائٹ جانے کے باعث اندھیرا تھا۔ گرمی زیادہ محسوس ہوئی تو ادھر آگئی۔ راہداری کی چھت نہیں تھی۔ حفاظت کے خیال سے سیاہ لوہے کی جالی لگی تھی۔ ہلکی کن من نے اس کے دوپٹے اور چند لٹوں کو نمی دے دی تھی۔ وہ کرسی پر پیر اوپر کیے پھوار سے صفحے کو بچانے کے لیے جھکی ہوئی سی تھی۔

حنا اور حرا پکوڑوں اور چاٹ سے نبرد آزما تھیں جبکہ سامنے آپا بڑے پتیلے میں لال سرخ شربت میں چینی گھول رہی تھیں۔

"کل بہت تیز میٹھا ہو گیا تھا امی!" حرا نے کہا۔

"اور پرسوں بہت پھیکا۔" حنا نے لقمہ دیا۔

"تو کون سی قیامت آگئی تھی۔" آپا بھنا گئیں۔ "تیز ہو گیا تو پانی ڈال لینا اور کم ہوا تو چینی بڑھا لیں گے ایسا کون سا ناقابل تصحیح کام ہو گیا تھا..... ہونہہ۔"

کاش زندگی کی تلخی کو کمی بیشی کو بھی ایسی آسانی سے بڑھایا اور گھٹایا جا سکتا پھوار 'دھار میں بدل رہی تھی اس نے انگلی پھنسا کر قرآن بند کر لیا۔

وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بے پناہ لطف اٹھا رہی تھی۔ مٹی کی سوندھی مہک نے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔

"ٹھک ٹھک" ..... اس کی مسکراہٹ کا دم ٹوٹ گیا۔" آپا کا یہ گھر پوش علاقے میں تھا۔ مگر کالونی کی

باؤنڈری وال کے پیچھے چھوٹے موٹے مزدور پیشہ لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتے تھے۔ بھوسی ٹکڑے والے' آواز لگا کر امرود اور فالسے بیچنے والے 'لفافے بنانے والے..... آپا نے ان میں سے کئی کو برف دینے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ ڈھیروں برتن جما لیتیں۔ عصر کے بعد سے دروازے پر لگاتار دستک ہوتی تھی۔

آپا عصر کے بعد خود ہی تھیلیاں بنا کر رکھ لیتیں اور دیا کرتیں۔

اس نے پیر نیچے لٹکا کر سوفٹی پھنسائی تب ہی صدا بلند ہوئی۔ "اللہ کے نام پر بابا اللہ بھلا کرے گا۔" دروازے پر شاید فقیر تھا۔

اس نے ذرا سا پٹ وا کر کے انگلی میں دبے دو سکے آگے بڑھائے۔

"اللہ تجھے سکھی رکھے۔ دلی مراد پوری کرے..... دے دے سخی دے دے۔" وہ ٹھٹکی۔

اس نے دروازے کا پٹ مزید کھولا۔ قیمتی گاڑی سے اترتی عورت اپنے پرس پر جھکی ہوئی تھی۔ باہر دو ہی فقیر تھے۔

تمکنت نے چونک کر دو سیڑھی نیچے کھڑے بلیو جینز اور بسکٹی جیکٹ والے فقیر کو دیکھا۔ اس کے سانولے پھیلے ہاتھ میں دو سکے تھے۔ وہ دو سیڑھی نیچے کھڑا تھا۔ اسے تمکنت کا چہرہ دیکھنے کے لیے اوپر نگاہیں اٹھانی پڑتی تھیں۔

"معا..... ف..... کرو..... بابا" دماغ میں تیار فقرہ ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں بکھرا۔

گھڑی کی سوئی نے اس بار جب اپنا چکر پورا لیا۔ تو چھوٹی سوئی بڑی سوئی کے اوپر تھی۔ سیکنڈ منٹ گھنٹوں کا حساب اب کی بار اس کی جنبش سے معلوم ہوتا تھا۔

دنیا ہونی کا نام ہے اور آخرت انہونی.....

وہاں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال عبث ہے اور آخرت ہزاروں سال کے بعد نہیں آئے گی۔ کبھی کبھار آخرت تیرہ سال بعد بھی آجاتی ہے۔

ترازو میں تولتے تو دونوں کا رشتہ برابری کا تھا۔

شک 'نفرت اور گمان و اندیشے نے ایک بار اظہر سعید کو اوپر کر دیا تھا تمکنت جلال بیگ دھاڑ سے نیچے زمین بوس.....

وفا 'یقین محبت انتظار 'اس بار وہ اونچی تھی۔ بلند اتنی کہ اسے دیکھنے کے لیے ایڑیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ وہ دسترس سے دور ہو چکی تھی۔

اظہر سعید کے لیے نگاہیں اٹھانے کا نہیں..... جھکانے کا وقت تھا۔ اس کا دایاں پیر سیڑھی پر اٹھا..... اس نے اپنی مٹھی بند کر لی۔

اور تمکنت نے آنکھیں..... وہ خود پر اختیار کھو رہی تھی۔ ہوا نے دونوں پٹ وا کر دیے۔

آپا نے حیرت سے گاڑی کو عورت کو اور مرد کو دیکھا..... چمچ پر ہاتھ لرزا تو سرخ پانی چھلک گیا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے اپنی بے یقینی کو یقین میں بدلتا دیکھ رہی تھیں۔

"خدا کی قسم..... خدا کی قسم تمکنت..... تم اسے کبھی معاف نہ کرنا۔ کبھی نہیں..... تاقیامت..... مگر اس کے ساتھ چلی چلنا..... فیصلے کا اختیار تمہارا ہے اور درخواست ہماری۔"

کوثر تیزی سے راستہ بناتی۔ تمکنت کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"زندگی بھر اس کے ساتھ رہنا 'ہنسنا بولنا' رونا' خوشیاں دیکھنا 'غم جھیلنا مگر اسے معاف نہ کرنا۔ اب کی بار اختیار تمہارا ہے تمکنت اظہر سعید..... معاف کر دو گی تو ساری عمر شرم سے پانی پانی رہے گا۔ نظروں سے نظریں ملانے کے مقابل نہ ہو گا۔ معاف نہ کیا تو جیے گا ایک احساس جرم کے ساتھ آخر سانس تک۔

ان تیرہ سالوں کے ایک ایک اذیت ناک پل کا حساب روز حشر کے لیے رکھ دینا مگر اللہ کے لیے اپنی زندگی کو میدان حشر نہ بناؤ..... جہاں سورج کندھوں پر سواری کرے گا۔"

کوثر کہنیوں سے اوپر اس کے بازو پکڑے اسے

جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بارش نے یقیناً" چہرے بھگو دیے تھے۔ مگر آنکھوں میں ڈولتی سرخی آنسوؤں کی تھی۔

تمکنت منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کا دماغ' آنکھیں' دل' سوچ سب ساتھ چھوڑ گئے تھے اس نے کتاب الہیٰ کو سینے میں بھینچ رکھا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگی۔

☼ ☼ ☼

کوثر سب کے ساتھ اوپن کچن والے لاؤنج کے فرشی دسترخوان پر بیٹھی تھی۔

اظہر بیرونی مہمان خانے میں تنہا تھا۔ بھائی صاحب اور آپا کے دونوں بیٹے تھوڑا بہت کھا کر نماز مغرب کے لیے جاتے تھے۔ حنا نماز سے پہلے کمرے میں گئی کہ کچھ چاہیے ہو تو......

"انہوں نے کچھ نہیں کھایا..... ویسے کے ویسے بیٹھے ہیں۔ ہر چیز جوں کی توں ہے' انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

آپا نے کوثر کی صورت دیکھی وہ اٹھنے لگی۔ تو یکدم تمکنت کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا تھا۔

میرون کارپٹ پر اس کے پیر اظہر کی نگاہوں میں آ گئے۔

درمیانی تپائی افطاری کے لوازمات اور موم بتیوں سے بجی تھی۔

وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں دوبدو تھے۔ تمکنت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے آئی تھی۔ اظہر میں اتنی ہمت کہاں۔

اسے دفعتاً" یہ احساس ہوا' وہ اس کے سامنے ایک پل بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس کا خود پر اختیار کھو گیا۔ وہ جھٹکے سے دوزانو ہو کر گیا تھا۔

تمکنت بھی کھڑی بھی نہ رہ سکی تھی۔ وہ بیٹھ گئی تھی۔

"کوثر ٹھیک کہہ رہی ہے میں چاہتا ہوں..... میں ساری زندگی تم سے معافی مانگوں اور تم مجھے معاف کرو..... لیکن میرے ساتھ چلو تمکنت مم' مم..... میں تمہیں لینے آیا ہوں..... آ گیا ہوں۔ ساری عمر میرا جرم جتانا کچوکے لگانا..... لیکن میرے ساتھ رہنا۔

میں خود کو سزا یافتہ دیکھنا چاہتا ہوں تمکنت۔" وہ رو پڑا تھا۔ اتنا اونچا لمبا مرد..... جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہنساتا تھا۔ لطف اٹھاتا تھا۔ اسے ہنستا دیکھنا دل کو خوشی دیتا تھا۔

اور اسی دل دار کو روتا دیکھنا؟؟؟

اس نے اس کے بند ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

وہ اس کے بغیر بہت روئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بہت ہنسی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ رونے میں آج شانہ بہ شانہ ہوتی۔

دونوں کی پیشانیاں ایک دوسرے سے جڑی تھیں۔ ہاتھوں پر گرتے آنسو ناقابل شناخت تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ایئرپورٹ پر کھڑے تھے۔ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودیہ عرب جانا تھا۔ عید میں ابھی چار یا پانچ دن باقی تھے۔ انہیں سی آف کرنے آنے والوں میں کوثر' کنیز اور چھوٹی باجی شامل تھیں۔ تمکنت کی آپا اور بھائی صاحب بچے بھی ہمراہ تھے۔

فلائٹ حسب معمول لیٹ تھی۔ اظہر کا چہرہ کسی قدر اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ مگر آج

.....

وہ جان چکا تھا کہ وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ مگر طیارے کے باقی مسافروں کی نسبت وہ اس انتظار سے مطمئن تھا۔ اس کی نگاہیں ہر آنے والے کو کھوجتی تھیں اور جب مایوس پلٹتی تھیں تو وہ تمکنت کا چوڑیوں بھرا ہاتھ مزید مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا۔

گلاس وال کے پیچھے والے چہرے پر اسے افضل

سعید کا گمان ہوا تھا۔ احد اور اسد اور شاید اکمل..... وہ پلکیں جھپک کر یقین کرنا چاہتا تھا۔ گھٹتا فاصلہ یقین کو جلا بخش رہا تھا..... ہاں یا نہیں۔

دل اور نظریں ہاں کی جانب مائل تھیں۔ وہ تصدیق کے لیے تمکنت کی جانب مڑا اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔

اور ایسی ہی ایک تصدیق افضل سعید نے دو دن پہلے اکمل سعید سے چاہی تھی اور سیاہ پڑا انجر دا مسلا ٹوٹا دل..... نفی سننا چاہتا تھا۔

افضل سعید کا دل تیرہ سالوں سے صرف خون کے بہاؤ کا ذریعہ تھا۔ اس میں جذبات' احساسات۔ محبت' خیال' یاد' گمان کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔

وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے اور اگر سمجھتے تو حیران ہو جاتے مگر وہ نفی کے منتظر تھے۔

یہ رمضان کے مہینے کا ایک نسبتاً" خاموش اور کاروبار کے حوالے سے ڈھیلا دن تھا۔ لوگ دیر سے آتے' نماز ظہر کے لیے اٹھتے اور عصر کے لیے گھڑی دیکھتے ہوئے مغرب کو کھوجتے۔ یہ شدید گرمی اور ایمان والوں کے امتحان والے روزے تھے۔

افضل سعید' اظہر سعید کے معاملے کو لے کر گم صم سے تھے اور آج بالکل دفتر آنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر آج یہاں روزہ کھلوانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شام کو کھلی دعوت تھی اور دن میں انہیں بند آنکھوں اور رواں ہاتھوں سے خیرات بانٹنی تھی۔

کچھ لوگوں کو خود رقوم دینے کے بعد وہ کچھ نقاہت محسوس کرنے لگے تو اپنے اے سی آفس میں جا بیٹھے۔ اکمل' اسد اور احد موجود تھے۔ وہ کسی کھاتے کو چیک کرنے لگے تھے۔ وہاں لائن لگا کر کھڑے تمام لوگ فارغ ہو گئے تھے۔

افضل سعید نے ارادہ باندھا کہ وہ بھائی اور بیٹوں کو اتنی شدید گرمی سے اندر بلا لیں۔ افطاری کے وقت دیگیں پہنچ ہی جانا تھیں۔ اسد اور احد اندر آ گئے تھے۔ اکمل میز کی درازوں کو لاک لگاتا ہوا کیش بکس اور دیگر چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ افضل سعید نے اشارہ کیا کہ وہ جلد اندر آ جائے۔

مگر ذرا سامنہ نکال کر دیکھا وہ کوئی عورت تھی۔ سیاہ تنگ پائنچوں کی شلوار سفید قمیص جو دھل دھل کر اپنا پرنٹ کھو چکی تھی۔ سیاہ دوپٹا چہرے اور کمر و سینہ کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے بغل میں سستا سا پچاس پچھتر روپے والا پرس تھا۔

اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں نمایاں تھیں جن کے سروں پر جھریاں سی تھیں مگر وہ کوئی بوڑھی عورت نہیں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو ڈھائی تین برس کا ہو گا

بچہ بسکٹی رنگ کی رنگین لائنوں والی نیکر بشرٹ میں تھا۔ اس سوٹ کی مالیت بھی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھی اور کثرت دھلائی سے وہ اپنی ملائمت کھو چکا تھا۔

بچہ ماں کے کندھے پر اونگھ رہا تھا۔

اکمل کی نگاہ اٹھی۔ عورت کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔ آگے بڑھے یا مڑ جائے۔ اکمل اپنی دکان بڑھا چکا تھا۔ اکمل نے آنکھیں چندھی کیں' اتفاق سے وہ کل ہی اس عورت کو اپنی گاڑی کے پاس ٹھٹک کر رکتا دیکھ چکا تھا۔

کاروباری مرکز میں مردوں کا زور تھا۔ یہاں چائے کی پتی یا اخروٹ اور بادام بیچنے والی عورتیں زمین پر کہیں بھی بیٹھ کر بیچا کرتی تھیں اور اگر یوہنی نہ ہو تو کسی بھی سیٹھ سے لجا کر گڑگڑا کر شام کی روٹی کے لیے کچھ پیسے پکڑ لیا کرتیں۔

یہاں جسم فروش عورتیں بھی نظر آ جایا کرتی تھیں۔ گھروں سے دور ٹرک ڈرائیور اور کلینرز ان کے گاہک ہوتے۔ مگر اکمل کے لیے یہ عورت نئی تھی۔ کچھ بیچ بھی نہیں رہی تھی اور اگر بکنے آئی ہوتی تو اونگھتا بچہ لے کر.....؟

اکمل دراز کے لاک سے چابی کھینچ رہا تھا۔ اس نے چابی دوبارہ لگالی۔ اندر صرف دو لفافے بچے تھے اس نے ایک اٹھایا پھر کچھ سوچ کر دوسرا بھی اٹھا لیا۔

عورت لفافے پکڑ کر لجاجت سے شکریہ کہنے یا

دعائیں دینے کے بجائے لفافے کھولنے کھڑی ہو گئی۔ اندر کی رقم ٹھیک تھی مگر اس کی ضرورت سے شاید بہت کم۔

وہ دفعتاً" کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ نقاب اتارے بنا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اکمل استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔

"پپ..... پانی!" رمضان کے مہینے میں یہ انتہائی احمقانہ بدتمیزی سی ڈیمانڈ تھی۔ اکمل نے روم فریج سے بوتل نکالی اور گلاس اس کی جانب بڑھایا۔

اس نے بنا رکے ایک ہی سانس میں پانی اتار لیا وہ دوسرا گلاس اپنے بچے کے لیے چاہتی تھی۔ اس نے پیسے اپنے پرس میں ٹھونس لیے تھے۔

اکمل کا اچنبھا دوچند ہو گیا۔ یہ عورت اب جاتی کیوں نہیں..... سارے کام تو ہو گئے تھے۔

وہ اپنی ایڑی کو جوتی سے کھسکا کر فرش پر مسل رہی تھی۔

"یہ میرا بیٹا ہے' سب سے چھوٹا.... ۔" اس نے بچے کا اونگھتا چہرہ گھما کر اکمل کے سامنے کیا۔

"بیمار ہے..... یہ دیکھو۔" اس نے بچے کی شرٹ پیٹ سے اٹھائی پیٹ حد سے زیادہ پھولا ہوا تھا۔

"اوہو.....!" اکمل نے سرہلایا۔ اسے یقیناً" زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ "کل..... کل آنا..... میں اور دے دوں گا۔ ابھی اتنا ہی کیش تھا۔" وہ تیزی سے بولا اور جلد از جلد اندر جانا چاہتا تھا۔ اسے روزہ لگ رہا تھا۔

اسے کرسی گھسیٹ کر نکلتا دیکھ کر عورت نے جوتی پیر میں فٹ کی اور پرس کو کندھے پہ جما لیا۔ وہ لوٹنے لگی تھی۔

"سنو..... اکمل!" اپنے نام کی بے تکلفانہ استحقاق بھری آواز پر وہ کرنٹ کھائے انداز میں پلٹا تھا۔

"اپنے..... اپنے بھائی سے کہنا..... اتنی دنیا کو خیر..... خیرات صدقہ زکوٰۃ دیتا ہے۔ میرے..... کچھ مسئلے ہی حل ہو جائیں اگر وہ کچھ مدد کر دے۔ فطرانہ..... یا زکوٰۃ وغیرہ..... تین بیٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا لڑکا بھی ہے۔ مہنگائی کا تو تمہیں پتا ہے ناں..... اس کے ابو کا پان کا کھوکھا ہے۔ مگر اس کو منہ کا کینسر ہو گیا..... اس لیے۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ اس کا نام کیسے جانتی تھی۔

چلو نام جاننا اہم نہیں۔ جلی حروف میں لکھا تھا۔ وہ کے باہر.....

افضل سعید ؍ اکمل سعید..... مگر وہ اسے کیسے مخاطب کر رہی تھی۔

"تت..... تم..... آپ کون؟" ایک حتمی احساس اس کے سر پر ڈنڈے کی طرح برسا تھا۔ وہ پرس وغیرہ درست کرتے ہوئے نقاب کو کس چکی تھی۔

اکمل نے سر سے پیر تک اسے بغور دیکھا۔ بوٹا سا قد..... پیروں کی جوتی اور بے حس تاثر والی۔ تو کیا ہوا جیسا احساس بتاتی آنکھیں۔

کس کی تھیں ایسی آنکھیں؟

کیسی آنکھیں..... لاپروا۔ خود میں مگن۔ بس اپنی کہنے والی۔

"کیوں کھڑے ہو اکمل..... فارغ نہیں ہوئے؟" افضل سعید باہر آ گئے۔

"ہو گیا۔" اس کا سر خود بخود ہل گیا۔

"جاؤ بی بی! کل آنا..... آج بس اتنے ہی تھے۔" وہ اس عورت سے مخاطب ہوئے مگر سارا دھیان اکمل کی طرف تھا۔

"پھر آ جاؤں کل..... کچھ کرو گے میرے لیے..... تم؟"

اس نے بچے کو شانے پر بدلا اور سرسری نگاہ سے افضل سعید کو دیکھا تھا۔

"آپ چلیے بھائی..... میں آیا۔" اکمل ایک ٹرانس میں تھا۔

افضل نے ایک نگاہ غلط انداز سے اندر جاتے جاتے اس عورت کے سراپے کو دیکھا تھا..... کچھ تھا..... کچھ چونکانے والا.....

وہ بے ساختہ شیشے کی دیوار سے چپک گئے۔ وہ باہر دیکھ سکتے تھے۔ مگر باہر والا انہیں نہیں۔

"وہ دونوں..... جو ابھی تمہارے ساتھ تھے، میرے بیٹے تھے ناں؟" اس کا لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔ جیسے کسی اجنبی کا تذکرہ یونہی نکل آئے۔ "باپ پر نہیں گئے ناں.....؟"

وہ مسکرائی تھی۔

اکمل کے پاس جواب نہیں تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے زبان چبالی جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اکمل کے ساتھ ہو رہا تھا اور وہی جانتا تھا۔

زمین' آسمان' سورج' چاند' رنگ' روشنی اندھیرا..... ایک ریل سی تھی جو نظروں میں گھوم گئی۔

"کل آؤں پھر میں..... بچی بڑی مجبور ہوں میں.....؟"

وہ آج بھی بس اپنی کہتی تھی۔ اکمل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ معمول کی طرح سرہلا گیا۔ عورت نے شیشے کے بند دروازے کو پل بھر دیکھا پھر وہ دروازے سے نکل گئی۔

افضل سعید کے گرد پھونکا سحر ٹوٹ گیا تو وہ دھاڑ سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئے۔ اکمل جوں کا توں تھا۔ وہ اس راستے پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا جہاں وہ مڑی تھی۔

"کک..... کون تھی..... یہ اکمل؟" انہیں سو فیصدی درست جواب معلوم تھا مگر اثبات میں ہلتا سر۔

"بھا..... بھابھی..... نہیں..... وہ الف..... الفت تھی۔ وہ کہہ رہی تھی....." اس بار افضل سعید نے اپنی زبان چبالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کس لیے یہ سب ڈراما..... وہ الجھ کر اکمل کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ تم بھی سب کچھ بھول گئے اکمل تم بھی تو..... یہیں موجود تھے۔"

ان کے لہجے کا تعجب اور آنکھوں کی حیرانی..... اکمل کے چلتے ہاتھوں کو روکنے سے قاصر تھی۔ وہ بہت سارے بڑے نوٹ ایک لفافے میں ڈال بند کرنے والا تھا۔

اکمل کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو افضل سعید کے اوپر کمرے کی چھت گر گئی۔ وہ آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

افضل سعید اپنی حیرانی' غصہ' خوف سب بھول کر اب اکمل کے لیے پریشان ہو اٹھے۔

اکمل نے فون پر منشی کو پیغام دیا تھا۔ "کالی چادر والی ایک عورت آئے تو انہیں فوراً" اطلاع دے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہو گا۔ میں نے اسے کچھ دینا ہے۔"

افضل سعید کی سماعتوں کے لیے یہ صور جیسی آواز تھی۔

افضل سعید اپنی نشست سے اٹھ کر اکمل کی کرسی کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کل اس کرسی پر الفت..... بھا..... بھابھی بیٹھی تھیں۔" افضل سعید نے نام پر پہلو بدلا۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔ وہ اکمل کا مسئلہ جاننا چاہتے تھے۔

"نہیں..... کل میرے سامنے میرا اعمال نامہ تھا۔" "ایک بار ظلم ہم سب کے ساتھ ہوا تھا۔ ناانصافی تماشا بے عزتی' ذلت اور ہم نے اگلوں کو یہی سب لوٹایا۔ جب اظہر نے ایک سراسر بے قصور کو ظلم کے بدلے زیادہ ظلم سے نوازا دیا۔ اس کی آنکھیں تو کھل گئیں۔ دیر ہی سے۔

اور کل دوپہر ایک اور چہرہ..... جس نے میری ہستی کو تہہ وبالا کر دیا۔

یہ جو میں ساری باتیں کر رہا ہوں ناں۔ یہ میں نے کسی کتاب میں کبھی نہیں پڑھیں۔ مجھے ان کا مطلب بھی نہیں معلوم یہ تو بس زبان سے ادا ہو رہی ہیں۔

کل..... کل میری آنکھوں نے اللہ کے انصاف کو دیکھ لیا اور آج میرے منہ میں اس کے الفاظ ہیں۔ مجھے خود پر یقین نہیں آرہا۔ میرے پاس تو کوئی نیکی نہیں۔ گناہ ہی گناہ..... لوگ چلے کاٹتے ہیں۔ وظیفے کرتے ہیں اور سجدے..... پھر بھی اللہ کو نہیں پاسکتے اور میں نے اللہ کو سمجھ لیا۔" اس نے کلائی آنکھوں پر رگڑلی۔

اور دل کبھی نہیں پھرتے اگر اللہ پھیرنا نہ چاہے۔

بڑے بڑے آفاقی جملے دل کی دیوار سے ٹکرا کر دھڑ دھڑ کرتے ہیں۔

اگر دل پتھر کا ہو لیکن دل موم سے ڈھالا گیا تھا۔"

اکمل نے تو نجانے کس کیفیت کے زیر اثر کہا تھا اور عمل کیا تھا۔ لیکن افضل سعید نے کالی شلوار والی اس عورت کو تھکے قدموں سے موڑ مڑتے دیکھا تھا۔

وہ روز حشر اس معاملے کو لازمی اٹھانے والے تھے' اپنی محبت کے بدل کی بے زاری عزت کے جواب میں ملنے والی ذلت۔

لیکن اللہ نے کل دوپہر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا تھا۔

سزاوار سزا پا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جس دن قرآن خوانی تھی۔ تم دونوں نے اکمل کے ساتھ باہر خیرات دی تھی۔"

اسد اور احد کو وہ دن یاد تھا۔ اس میں ایسا خاص وہ باپ سے کبھی نگاہ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔

"اکمل نے آخر میں ایک عورت کو..... دو لفافے دے دیے تھے۔" وہ قصداً" رکے۔

وہ دونوں اس قصہ کے سیاق و سباق سے ناواقف تھے۔ اسد اور احد نے وزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہلکی سی نگاہ اٹھا کر باپ کو.....

ان کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ مگر آنکھوں میں ادھیڑبن کا تاثر تھا۔ ان کے بیٹے نہیں جانتے تھے افضل سعید اپنی زندگی کا ناقابل یقین فیصلہ سنانے والے ہیں' اپنے حوالے سے اور ان کے حوالے سے.....

"اس نے نقاب کر رکھا تھا۔ تم لوگ چہرہ نہیں دیکھ سکے ہوگے؟ اور شاید..... " وہ کھو سے گئے" دیکھ بھی لیتے تو پہچان نہ پاتے۔" دونوں نے نا سمجھی کے عالم باپ کو دیکھا۔

"تم دونوں اچھے بچے ہو۔" ان دونوں کی حیرت بڑھتی جارہی تھی

"آج کل کے زمانے کے بچوں سے بہت مختلف میں بہت ڈر رہا کہ کیسے تربیت کر سکوں گا۔ کوتاہی نہ ہو جائے۔ مگر اللہ کی مہربانی اور انعام۔"

اپنی آواز کے بھرا جانے کا ان ہی کو معلوم ہوا۔

"بہرحال! اکم ٹو دی پوائنٹ..... کالج کے بعد تم لوگوں کا دفتر آنا' کام سیکھنا مستقبل کی پیش بندی ہے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور بری صحبت سے بچے رہو۔ لیکن بہرحال تم لوگ محنت کرتے ہو تو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ تم لوگوں کو حسب ضرورت دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ہیں تم لوگوں ہی کے پیسے..... " وہ رک گئے۔

اسد اور احد کے سر سے یہ ساری تمہید گزر رہی تھی۔ ان کے باپ نے اتنی طویل گفتگو اور وہ بھی ایسی لایعنی پہلے تو کبھی نہیں کی تھی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ابو..... مجھے' ہمیں نہیں سمجھ آرہا..... آپ پلیز۔"

"میں یہ چاہتا ہوں..... " وہ پیپرویٹ چھوڑ کر کرسی کے اگلے حصے پر جھک آئے۔ وہ اپنے بیٹوں کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"میں یہ چاہتا ہوں اسد سعید اور احد سعید..... تم دونوں اپنی ماں کو فنانشلی سپورٹ کرو۔

میں اس معاملے میں مشورے یا حکم دینے جیسی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ماں اور بچے کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا' کبھی بھی....."

افضل سعید کی آواز پرسکون ندی سے مشابہ تھی۔

"مگر میں تم لوگوں کو اطلاع دے سکتا ہوں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور..... اور جبکہ تم دے بھی سکتے ہو تو..... اس سے ملنا تعلق رکھنا' آنا جانا تمہاری اپنی صوابدید پر ہے لیکن بس ایک ہی حکم یا شرط کہہ لو' ہماری اس موجودہ زندگی پر اس تعلق کا اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔" وہ کھڑے ہو گئے" تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی دیکھ ریکھ کرو..... کرنی چاہیے بھی' منشی سے معلومات لے لینا' وہ مچھر کالونی کے علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

مگر میری واحد شرط کو گرہ سے باندھ لینا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ تم ہو۔"

اسد اور احد کے فق چہرے کچھ سمجھ نہیں پارہے تھے۔ سالوں پہلے ان کے سینے میں گوشت پوست کے دل کی جگہ پتھر کے دل ٹرانس پلانٹ کر دیے گئے تھے۔

اور پتھر جذبہ کب رکھتا ہے۔

مگر دل جب ایک بار دھڑکنا شروع کر دے تو دھیرے دھیرے ہر جذبے سے آشنا ہو جاتا ہے۔ دیر ہی سے سہی.....

دھڑکن زندگی ہے اور زندگی کے سو پہلو۔ اپنی باری آنے پر سب سامنے آجاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ایک احساس ندامت کسی پل سکون لینے نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ خود ادھر ادھر مصروف رکھ کر ہر ناپسندیدہ چیز کو بھول جانا چاہتے تھے۔

دل کے کسی کونے میں کمینی خوشی نہیں ابھری تھی اسے ذلیل و خوار دیکھ کر۔ وہ نشان عبرت بن کر آئی تھی۔

وہ بظاہر الفت کو بھول چکے تھے مگر دل کے اندر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ ایسی کیوں تھی۔ ضدی ہٹ دھرم اپنے آپ سے' صرف اور صرف اپنے آپ سے پیار کرنے والی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی ضد اور انا کے ہاتھوں دوسروں کو تو کیا نقصان پہنچائیں گے خود خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔

وہ ایسی کیوں تھی۔ جب وہ بہت محبت اور لاڈ کے ساتھ ان کے ساتھ تھی۔ تب وہ سوچتے تھے اور کبھی کبھار لاڈ سے پوچھا بھی کرتے تھے۔

"میں تو ہوں ہی ایسی ہی ہوں۔" وہ نخریلے انداز سے منہ بنا کر شانے اچکاتی۔

وہ منتوں مرادوں کے بعد مانگی جانے والی اولاد تھی۔ مگر کیا ماں باپ کی تمام دعائیں بس اس کی دنیا میں آنے تک کے لیے تھیں۔ دنیا کی اچھائی اور آخرت کی بھلائی کے لیے کیا کبھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھے تھے۔

وہ کس بے حس مٹی سے ڈھالی گئی تھی۔ اسے کبھی غلطی سے اولاد یاد نہ آئی یا اسے افضل سعید سے واقعی نفرت تھی۔ وہ کیسی ماں تھی۔ لیکن نہیں وہ اکمل کے سامنے اچھی ماں بن کر آئی تھی اس نے اپنے بچے کی بیماری کا کس فکر مندی سے بتایا تھا۔

اس نے کہا تھا" شوہر ملے گا تو بچے بھی مل جائیں گے۔" اس کا دعوا سچا تھا۔

لیکن شوہر اور بچے تو پہلے بھی تھے اور کیا وہ واقعی افضل سعید کو اتنا زیادہ ناپسند کرتی تھی۔ وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ کیوں تھی؟ اس کے ہر رویے نے ہر دفعہ افضل کو حیران و پریشان کیا تھا اور وہ کیسے آگئی تھی؟ یہ بے شرمی تھی یا ہٹ دھرمی۔ لاپروائی بے نیازی۔ کیا تھا یہ۔

افضل سعید اس ٹین کی چھت کو اور چھت فراہم

کرنے والے کو دونوں کو دیکھ آئے تھے۔ کیا تھا اس شخص میں ۔ اس نے عدت گزارنے کے دوماہ بعد خود ہی اس شخص سے عقد کرلیا تھا۔
وہ ایسی کیوں تھی۔ کوئی نفسیات دان ہوتا تو شاید تحلیل نفسی سے بتاتا۔ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی.....
وہ ہٹ دھرم تھی ضدی..... کیا افضل سعید اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ وہ تمام عیش و آرام کو ٹھوکر مار کر چلی گئی۔ اس نے ان کے منہ پر جوتا مارا تھا اور آج زمانے کی جوتیوں میں پڑی تھی۔
اس نے کبھی پلٹ کر اپنے ماں باپ کو بھی نہ دیکھا۔ اور آج کیسے ان ہی لوگوں سے مدد کی امید لیے آگئی تھی۔
کیا وہ جانتی تھی افضل سعید اسے کبھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ وہ ان سب کے بارے میں کتنا اندر تک جانتی تھی۔ اس نے انہیں دیکھ کر اپنا نقاب نہیں گرایا تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں۔ وہ آنکھیں ملانے کے قابل نہیں تھی یا انہیں اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔
وہ کیا تھی۔
اتنی ہی مغرور، بے حس وہ کسی بھی احسان کو اپنے اوپر احسان نہیں مانتی تھی۔ جو کچھ پہلے کیے گئے اس کی جوتی سے اور جو وہ لینا چاہتی تھی۔
دیتے ہو تو دو، نہیں تو نہ سہی۔ کسی اور سے تو مل ہی جائے گا۔
اکمل اور افضل نے تو اس واقعے سے عبرت حاصل کی تھی۔ توبہ کا ارادہ۔ شکر کے سجدے..... کیا الفت نے بھی ایسی کوئی ایک کیفیت محسوس کی تھی؟
اگر کی تھی تو مقام شکر.....
اور اگر نہیں تو اس کا مطلب اللہ بھی اس سے خفا تھا۔



اظہر سعید کا گمان صحیح تھا۔ یہ افضل اور اکمل تھے۔ ان کے چہرے سپاٹ تھے۔ تمکنت نے چند ان کی آنکھوں میں کسی بھی جذبے کی تلاش کی اور جب ناکام ہوئی تو غیر محسوس طریقے سے اظہر کے پیچھے چھپ سی گئی۔ اس کے ہاتھ کی تحتی اظہر کو اپنے بازو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔
وہ دونوں ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے۔
"یہ کچھ بولتے کیوں نہیں....؟" تمکنت نے ڈرتے ڈرتے شانے کی اوٹ سے چہرہ نکالا افضل سعید اسی کو کھوج رہے تھے۔
وہ ایک دم آگے بڑھے۔ کیا وہ اسے نوچ کر اظہر سے دور کردیں گے۔ تمکنت کے ناخن گوشت میں دھنس سے گئے۔
لیکن اگلا پل حیرانی کا تھا۔ افضل سعید نے اظہر کو بازو سے دبوچ کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ جو پہلے ہی اظہر کے وجود میں چھپنے کی کوشش کررہی تھی۔ گھسٹتی ہوئی ان کے بازو کے گھیرے میں چلی گئی۔
افضل سعید نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تھپتھپایا تھا۔
ایک ناقابل یقین احساس سے گھر کر اس نے ذرا سر اٹھا کر ان کا چہرہ کھوجنا چاہا.....
وہاں نرمی، سکون اور خوشی تھی اور آنکھوں میں جھلملاہٹ سی۔ وہ کیوں بھلا.....؟
"دل موم کا دیا ہوتا ہے جل جل کر آنکھوں کے رستے پگھلتا ہے پھر ایسی روشنی..... دنیا کو سجادیتی ہے اور آخرت کو سنوار.....



کنیز نبوی

دو ٹکے کے آدمی

رات آدھی سے زیادہ بیتی جاتی تھی۔ ہوا نے خنکی کی چادر چہار سو پھیلا دی۔

بوجہ سردی موئے تن کھڑے ہوتے رہے۔ وہ علاقہ سے مسلسل جیتنے والے اسمبلی ممبر ڈیفنس کے ایک فلیٹ سے شراب اور شباب سے خمار آلود ہو کے اپنے بنگلے پر آئے۔

"سائیں...! سائیں...!" ٹھٹھرتی سردی میں صرف شلوار' قمیص میں ملبوس مفلوک الحال اس کے پیچھے آیا۔

وہ ناگواری سے پلٹے۔

"سائیں... یہ آپ کی گاڑی کے پیچھے بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا ہے۔" اسے روکنے کے لیے پیچھے سے دوڑ کر آگے والے چوکیدار نے اپنے ناکردہ جرم کی وضاحت دی۔

"سائیں! میری بیوی مرجائے گی۔"

"کون ہو تم؟" وزیر موصوف کی اکڑی پُر تنفر گردن میں جنبش ہوئی۔

"سائیں...! سائیں...! آپ کا ووٹر۔ ہمیشہ آپ کو ووٹ دیتا ہوں" مفلوک الحال نے صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھا۔ "ابھی... ابھی پچھلے الیکشن میں بھی تو آپ ہی کو دیا ہے"۔ آواز جیسے اس اجنبیت پر فنا ہونے کو تھی۔

بڑے آدمی نے بھنویں سکیڑ کر اس اچھوت کو دیکھا۔ وہ اسے یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھلا یاد رکھنے کے قابل کب تھے؟ بس ان کو تو صرف ایک الیکشن کے دن ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔

"سائیں! میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ اسپتال صرف آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ کہیں کوئی گاڑی نہیں مل رہی۔" اس نے کہتے ہوئے عاجزی سے ہاتھ باندھے۔ آپ عنایت کیجئے! اگر تھوڑی دیر کے لیے اپنی کوئی گاڑی دے دیں۔ تو میں اپنی بیوی کو اسپتال پہنچا سکوں۔"

ناامیدی کی کیفیت میں اس نے آس بھری نگاہ سے گاڑیوں کی لمبی لائن کو دیکھتے ہوئے عرض کیا۔

اس کی بات سنتے ہی چہرے کے تناؤ میں اضافہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ لب بھینچ کر چوکیدار کو غصے سے دیکھا۔

چوکیدار ان کی آنکھوں سے پیغام وصول کرتے ہی فوراً "مستعد ہوا۔ اسے شانے سے پکڑا۔

"ابے چل! بڑا آیا گاڑی لینے والا۔ شکل دیکھی ہے اپنی 'پراڈو میں بیٹھنے والی ہے؟"

"سائیں! خدا کے لیے رحم کریں۔ میری بیوی تڑپ تڑپ کر مرجائے گی۔ کسی چھوٹی سی گاڑی کا انتظام کر دیں۔" انہوں نے سنی ان سنی کر کے اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

"سائیں... سائیں... میں آپ کا وو... ووٹر۔"

چوکیدار اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ دو سیاہ آنکھوں سے نکلی التجا نے اندر تک اس کا پیچھا کیا۔

"دو ٹکے کے لوگوں کو ذرا شعور نہیں' دردزہ بیوی کو میری... میری پراڈو میں بٹھانے آیا ہے۔ کہیں جو پھٹ پڑے تو ساری گاڑی کا ستیاناس۔" اس کے منہ سے مدہوشی کے مشروب وجود سے اقتدار کی بے حسی کے بھبکے اٹھنے لگے۔

عوامی خدمت گاروں نے ہمیشہ کی سرد مہری اوڑھ رکھی ہے۔ کوئی احساس نہیں جو ان برف کی سلوں کو پگھلا سکے۔

✡ ✡ ✡

چار ماہ بعد انہوں نے عید پر آنے کی وجہ سے تعلقے میں کھلی کچہری لگائی۔

لوگ ان سے عید ملنے لگے۔ اپنے مسائل بتانے 'درخواستیں دینے لگے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے' مسکراہٹ کو زبردستی ہونٹوں پر لاتے۔ لوگوں سے مختلف کاموں کی درخواستیں اور سی ویز وصول کر کے اپنے سیکریٹری کو دیتے رہے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر طوطا چشم سیاست دان سیاست کی بولی "حاضر' حاضر" کی رٹ لگاتا رہا۔ شام پڑے اپنے شہر کے بنگلے پر واپس آئے۔ اپنی ماں کے پاس ایک اور عرض گزار دیکھ کر



انہیں بے تحاشا غصہ آیا۔
ابھی ابھی تو بوری بند ان دیکھی درخواستوں سمی ویز کو دریا برد کرنے کا حکم دے کر آئے تھے۔
"بیٹا! یہ صبح سے بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنی بیٹی کی نوکری کے لیے آئی ہے۔"
وہ خاتون اسے دیکھ کر مؤدب سی کھڑی ہو گئی۔
"سائیں.... میری بیٹی نے ایم ایڈ میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ اسے کہیں ٹیچر لگا دیں۔"
اس نے بڑی امید سے سی وی اسے تھمائی۔ انہوں نے ماں کے سامنے ناچار سی وی وصول کی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ گالیاں دے کر گھر سے نکال دیں۔
اور وہ جو سارا دن ان کی ماں کو اپنی غربت میں بھی بیٹی کو پیٹ کاٹ کے، کروشیہ کاڑھ کے سلائی کر کے پڑھانے کے قصے سناتی رہی تھی، خوشی خوشی رخصت ہوئی کہ وزیر موصوف نے سی وی خود اس سے لی ہے تو اب نوکری ضرور دیں گے۔
وہ سہلاتے سی وی لے کر اپنے کمرے میں آئے، ____ ڈسٹ بن میں سی وی پھینک کے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔
"تھک گئے؟" ان کی بیوی جو آئے دن پیرس، لندن، دبئی جائیداد خریدنے اور نئے اکاؤنٹ کھلوانے جاتی رہتی تھی۔ جو ملکی معروف کمپنیوں اور بینکوں میں شیئرز خریدنے کی رسیا تھی، نے اپنے کیوٹکس پر پھونک مارتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں... دو ٹکے کے لوگوں سے مغز ماری کرتے سخت تھکاوٹ و بوریت ہوئی۔ ہر کوئی کہتا ہے نوکری دے دو۔ نوکریاں تو جامن کی طرح درختوں پر اگتی ہیں ناں کہ سب کو تھما دوں۔ جاہل لوگوں کو کون سمجھائے۔"
وہ نفرت سے بولے۔
"شاید وہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان کے ووٹوں سے وزیر بنے ہیں۔" ان کی بیوی ہنسی۔
"ہونہہ! ووٹوں سے وزیر بنا ہوں۔ ارے سب پیسے کا کھیل ہے۔ ان کے پاس ہو تو یہ جاہل گنوار لوگ بھی الیکشن کا کھیل کھیلنے لگیں۔" وزیر موصوف مونچھ تلے استہزائیہ مسکرائے۔
غریب کا نصیب بھی گرمی جیسا ہی ہوتا ہے۔ نہ کبھی خود ٹھنڈا ہوتا ہے، نہ غریب کو ہونے دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

کمدار بیمار ہو گیا تھا اور گنے کی فصل کو کھاد دینا تھی لہٰذا سائیں سے ملنا ضروری تھا۔
خزاں رسیدہ درخت کے لنگڑے لولے سائے میں صبح سے ان کا ہاری بیٹھا اونگھتا رہا۔ بے حسی کے پتے جھڑ جھڑ کر اس کے گرد ناچتے رہے۔ نہ کسی نے کھانے کو پوچھا نہ چائے کو۔ ان کی ماں نے باہر لان میں ازلوں سے سر جھکائے بیٹھے اس ہاری کو دیکھا۔
"اکیسویں صدی میں بھی طوق غلامی گردن میں ڈالے یہ ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔" وہ سوچتے سوچتے ڈائننگ ٹیبل پر آ گئیں۔
"بیٹا! تمہارا ہاری (مزارعہ) تمہارے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سوکھ گیا ہے۔"
"اماں! ان لوگوں کو تو بالکل شعور نہیں کہ صبح صبح کسی کے ہاں نہیں جانا چاہیے۔ اب آپ خود ہی سوچیے! میں ان دو، دو ٹکے کے لوگوں کی خاطر اپنا سکھ، چین، آرام خراب کر کے سویرے اٹھوں گا؟ ایڈیٹ جاہل، بدتمیز لوگ۔"
"تمہاری ہی زمین کے لیے تم سے کھاد طلب کرنے آیا ہے۔" ان کی ماں کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج در آیا۔
"اوہ! چار بج گئے، مجھے ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔" وہ عجلت میں اٹھے۔ ان کے سیکریٹری نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔
ہاری دوڑتا آیا۔ "قبلہ سائیں... فصل سوکھ جائے گی... اگر بروقت کھاد نہ ملی تو۔"
وہ ازلوں سے سر جھکائے، ہاتھ باندھے عرض کرتا رہا تھا۔ آج بھی کر رہا تھا۔ فصل سوکھ جاتی تو بھی بے قصور ہوتے قصوروار وہ ہی گردانا جاتا۔

ممبر اسمبلی نے ایک اچٹتی سی نظر اس صدیوں سے ایستادہ غلام انسان پر ڈالی۔ بات کا جواب دینا خلاف شان سمجھا۔ سیکریٹری سے مخاطب ہوئے۔
"تم جا کر زمین دیکھ کر جائزہ لے آؤ۔ زمین کو کتنی کھاد چاہیے۔ بل بنا کر بھیج دو۔"
گاڑی زن سے بنگلے سے باہر نکل گئی۔ وہ کلمۂ شکر ادا کر کے اس جنت نما جہنم سے باہر نکل آیا۔
"پتا نہیں کیوں، ہمارے مقدروں پر ہمیشہ پت جھڑ کا موسم طاری رہتا ہے۔ گھنی چھاؤں ملتی ہی نہیں۔"

☼ ☼ ☼

پیار کا موسم جوبن پر تھا۔ ہر طرف درختوں نے نئی شادابی، تازگی اوڑھ رکھی تھی۔ امید کی نئی کونپلیں نمو پذیر ہونے لگیں۔ اقتدار کی کھوکھلی جڑوں پر ووٹوں کے پتے اگنے کا موسم آ گیا۔
اسمبلی ممبر نے اپنے امریکا پلٹ بیٹے کو عوامی لباس میں ملبوس دیکھا تو خوشی سے باچھیں کانوں کی لوؤں کو چھونے لگیں۔
بڑا تاریخی دن تھا آج کا۔ ان کی چوتھی نسل اقتدار میں شامل ہو رہی تھی۔ ان کے دادا انگریز سرکار کے زمانے میں، پیرو کار باپ ہمیشہ سے کبھی کیبنٹ کا وزیر، کبھی سینیٹر تو کبھی اسمبلی ممبر رہا۔
پھر اقتدار ان کی طرف منتقل ہوا۔ وہ تیس سالوں سے ان داؤ پیچ کے ماہر کھلاڑی اب اپنے بیٹے کو بلدیاتی الیکشن میں لا رہے تھے۔ تاکہ ضلعی ناظم بن کر مستقبل میں وزیر بننے کی تیاری کر لے۔ صدیوں پر مبنی شہنشاہیت ملک کے عوام پر مسلط تھی۔
ان کے باڈی گارڈ نے پراڈو کا دروازہ کھولا۔
دونوں باپ بیٹے نے بلدیاتی الیکشن کی کیمپین (مہم) شروع کر دی۔
چائے پانی کھانا سب میسر تھا۔ جو بھی آفس میں آتا اس پر عزت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔
دونوں باپ بیٹا خندہ پیشانی سے لوگوں کا استقبال کرتے۔ سالوں سے وعدوں کی ایک لمبی زنجیر میں دلاسوں کی اور کڑیاں ملا کر اس کی طوالت بڑھائی جا رہی تھی۔ طوالت ہر الیکشن میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔
آہستہ آہستہ سارے لوگ اس زنجیر کے طول و عرض میں زنجیر پا ہوتے گئے۔
ہر بار ووٹوں کی بہار ختم ہونے پر وہ زنجیر زنگ آلود ہو جاتی۔ اس پر جھوٹ کی کائی جم جاتی۔
یہ موسم بہار یعنی الیکشن کا ایک ماہ ان غریبوں اور دو ٹکے کے آدمیوں کا بے حد خوبصورت گزرتا۔ بڑے بڑے سردار، میر، پیر، وڈیرے، سابقہ وزیر، ایم این اے، ایم پی ایز، ان دو ٹکے کے آدمیوں کے پاس آتے۔
مدتوں سے التوا میں پڑی تعزیتوں کا قرضہ چکایا جاتا۔ شادیوں کے لفافے ملتے، تب جب بچے پیدا ہو چکے ہوتے۔ گلے شکوے کرتے دو ٹکے کے آدمیوں کو پسینے کی بساند کے باوجود گلے لگایا جاتا۔ ان کے آگے متکبر ہاتھ باندھے جاتے۔ منانے کے جتن کیے جاتے۔
ایک اور باری لینے کے لیے بے وقوف بنایا جاتا۔
الیکشن ان اشرافیہ کے لیے اولمپک کے کھیلوں کی طرح محض ایک کھیل ہی تو تھا۔ جہاں ہر کوئی اقتدار کے تمغے جیتنے کے لیے پیسے کی بازی لگاتا۔ جو جیت جاتا اس کی بلے بلے۔ جو ہارتا وہ کمر سہلاتا، شراب میں غم غلط کرتا رہتا۔ جیت کا تمغہ سجانے والا ہر طرح سے کما لیتا۔ ہارس ٹریڈنگ ہو یا وزیر و مشیر بنے یا نوکریاں بیچے۔ ان عوام کے غم بیچنے والوں کے دور میں اگر اللہ کے کرم سے قدرتی آفات آ جاتیں تو وہ اور بغلیں بجاتے کہ اب مفت کا مال بنانے کا موقع آیا۔
چار ہزار کا خیمہ آٹھ ہزار میں خریدا جائے گا۔
درکار راشن کی فہرست میں آدھا سامان بڑھا کر لکھا جائے گا۔ کھاد کی بوریاں کروڑوں میں بیچی جائیں گی۔
غرض سیاست دان کے عیش ہی عیش ہو جاتے۔ دو کروڑ الیکشن میں لگا کر دو ارب کما لیتے، سودا مہنگا نہ تھا۔ بس شرط یہ تھی کہ چکنی چپڑی باتوں سے صرف بے وقوف بنانا آتا ہو۔
الیکشن کی بہار عروج پر تھی۔ کیمپین ختم ہوئی۔ صبح دو ٹکے کے سارے آدمی جمع ہو کر اپنی بدقسمتی پر

ٹھپہ لگانے والے تھے۔

کیونکہ خوش قسمتی درمیانے طبقے کے لوگوں اور غریبوں کے لیے ناپید تھی۔ یہ جوا وہ کھیلے جس کی جیب نوٹوں سے بھری ہو۔

جو دال آٹے کے بھاؤ میں ہی پھنسا ہو' وہ تو صرف ٹھپہ لگانا جانتے ہیں' اپنی غربت وبد قسمتی اور دو ٹکے کی شناخت پر۔

الیکشن کی آخری رات پابندی کے بعد چوری چھپے انتخابی مہم چلائی جا رہی تھی۔

ہر دو ٹکے کے آدمی کے پاس عزت ماب ایم این اے، وزیر موصوف بذات خود چل کر جا رہے تھے۔

کسی کو اسکول بنوانے کا آسرا' کسی کو نوکری کا جھوٹا دلاسا' کسی گاؤں کو گیس دینے کا عارضی وعدہ۔

یہ سارے دم دلاسے اس موسم بہار کے لیے تھے۔

ان دو ٹکے کے آدمیوں نے ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا' مگر پھر بھی وزیر موصوف ساری رات چل چل کر لوگوں کو نیند سے اٹھا کر تجدید وعدہ لیتے رہے۔

اور آسروں کی بوسیدہ پیوند زدہ گٹھڑی انہیں تھما تے رہے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ اس گٹھڑی سے ہیرے نہیں پتھر نکلیں گے۔ مگر وہ اپنی ازلی تقدیر کے آگے مجبور تھے۔

دونوں طرف کے امیدوار طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے' جن کے لیے وہ لوگ شجر ممنوعہ ہی تھے۔

اس آخری رات ان دو ٹکے کے لوگوں کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس رات اگر دام لگانے والے کروڑوں کے دام لگاتے تب بھی دو ٹکے کے آدمی سستے پڑتے۔ وہ لوگ اپنی قیمت سے واقف نہیں تھے۔

تب ہی دو ٹکے کے رہ گئے تھے۔ ان کو آگہی نہ تھی۔ جس اشرافیہ نے نظام بنایا' اس نے ان کو جاہل رکھنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ سو ان لوگوں کے دروازے پر کھڑے وزیر صاحب بندہ عاجز بنے منتیں کرتے رہے۔

اور اس دن خواتین کے پولنگ اسٹیشن پر اپنی بے روزگار ایم ایڈ بیٹی کے ساتھ آ کر اس نے مہر سارے نشانوں پر لگا کر ان پر کالک مل دی تھی۔

یہ اشارہ تھا کہ کوئی امیدوار اہل نہیں' سب نااہل تھے' جو الیکشن میں غریبوں کو اور مقروض کر کے مفرور ہو جاتے۔ اس نے اپنا غصہ نکالا۔ اپنی غربت اور کم حیثیتی کا بدلہ چکا دیا۔ یہ باور کرا دیا کہ ہم اپنی حیثیت پہچان جائیں۔ تو اس کم حیثیتی سے چھٹکارا مل جائے۔

غربت کے باوجود ڈگریاں لینے والوں کے پاس سفارش و رشوت نہ ہو' تو ڈگریاں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اس کی بیٹی بھی سلائی کرنے لگی۔ اپنی محنت کی روزی ہی کمائی ہے تو ووٹ ان کو کیوں دیں۔ اس سے بہتر ہے کہ خارج کر دیں۔ جب تک کوئی اچھا اہل امیدوار انتخاب میں حصہ نہ لے۔

اور اس صبح جب ایک اور دو ٹکے کا آدمی ووٹ دینے کے لیے اٹھا تو اس کی نیند پوری نہ تھی۔ کیونکہ وزیر صاحب اور ان کے کارندے باری باری اس سے وعدہ لینے آ رہے تھے۔

ایک دن کے یہ بھکاری سالوں تک غریب عوام کو بھکاری بنا رکھیں گے۔

کوئی آپشن نہ تھا۔ کوئی آدھا چور' کوئی پورا چور کوئی کالا چور' کوئی سفید چور۔ تھے تو سب ہی چور' ان کی خوشیوں کے خوشحالی کے اسے درد زہ میں مبتلا اپنی بیوی یاد آئی' جس نے تڑپ تڑپ کر موت کو گلے لگایا تھا۔

اس کے اندر دھواں بھر گیا' لاوا پھٹ پڑا تو اس نے بیلٹ پیپرز پھاڑ کر اس کے پرزے بیلٹ بکس میں ڈال دیں۔ اور ٹھپہ مہر اپنے منہ پر لگا لیا۔

کیونکہ دو ٹکے کے آدمی ہونے کے ثبوت دینے کا موقع اس سے بہتر نہیں ملے گا۔

دونوں صورتوں میں منہ پر سیاہی ہی ملنی تھی تو کیوں نہ جو کل ملنی تھی وہ آج ہی مل لی جائے۔



دیدۂ بینا

اُمِ طیفور

ناولٹ

مسز افتخار کے پوتے کے عقیقہ کی تقریب زوروں تھی۔ ان کے علاقے کی کم و بیش تمام خواتین اس محفل میں شامل تھیں۔ فارحہ بھی اپنی ساس مسز فرحت زبیری کے ساتھ موجود تھی۔ مسز افتخار نے نشست اور طعام کا انتظام لان میں ہی کر رکھا تھا۔ فارحہ اور اس کی ساس کے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ یہ مکس گیدر نگ نہیں تھی۔

فارحہ کی ساس فرحت آپا کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ سلیقہ اور قرینہ بے مثال تھا۔ متمول اور خوشحال تھیں مگر زبان چٹنی روٹی کے ذائقے سے بھی آشنا تھی۔ خوش قسمتی سے، بہو بھی ہم مزاج تھی۔ تمام خواتین کھانے سے فارغ ہو کر گروپس کی شکل میں کرسیوں پر براجمان سبز چائے کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ ملک صاحب کی بیگم ہر دو منٹ بعد سرد آہ بھرتیں اور اپنی نم ہوتی آنکھوں کو ٹشو سے ہلکا سا رگڑ لیتیں۔ وہ بہت چپ چپ سی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ بڑی ہنسوڑ طبیعت کی تھیں، پر آج کل ان کے گھریلو مسائل نے ان کے سارے قہقہے اور برجستہ جملے ماضی کی جھولی میں پھینک دیے تھے۔ بہت کم کم ہی وہ کسی خوش رنگ محفل میں نظر آتی تھیں۔ آج بھی فارحہ اور اس کی ساس فرحت آپا کے بے حد اصرار پہ وہ ان کے ہمراہ چلی آئی تھیں۔ سات ماہ ہو گئے تھے ان کے شوہر ظہیر ملک کی وفات کو، مگر ابھی تک وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھیں اور سنبھلتیں بھی کیسے؟ ملک صاحب گئے تو اپنے ہمراہ بیگم کی من مانی اور راجدھانی بھی لے گئے۔ سارا ٹھہکہ اور طنطنہ پانی کا بلبلا ثابت ہوا۔ کل کی آئی بہو نے سسر کا کفن میلا ہونے سے بھی پہلے ساس کو کونے سے لگایا اور پورے گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پیسے کی حریص تھی۔ ملک صاحب کے مرنے



کے بعد ان کا بیٹا کاروبار کو صحیح سے سنبھال نہ سکا' نتیجتاً" گھاٹا پڑا اور پہلے سی خوشحالی نہ رہی تو ساس کے ہاتھ سے روپے پیسے کا حساب کتاب بھی لے لیا۔

وہ عورت جو خاوند کی زندگی میں ملکہ تھی' بہو اور بیٹے کے ہاتھوں پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی۔ یہ وہی بیٹا اور بہو تھے' جن کے ناز یہ دونوں میاں بیوی اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ لمبی چوڑی شاپنگز کروائی جارہی تھیں۔ کبھی ملک صاحب بہو بیٹے کو شمالی علاقہ جات کی طرف روانہ کردیتے کہ ذرا فریش ہو آئیں۔ تب یہی بہو بھی "امی جان' امی جان" کہتے زبان نہ سوکھتی تھی' اب اپنے بچوں کو سکھاتی تھی کہ "صرف دادی کہتے منہ ٹوٹتا ہے؟ دادی جان کہنے میں ہی پون گھنٹہ ضرور لگانا ہے....؟" واہ رے' وقت کی چک پھیریاں.... کب' کس کو' کس رخ پر پٹخنی دے جائے' کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔

یہ تو مسز ملک کا دم غنیمت تھا جو ان کی سنتی تھیں اور حوصلہ دیتی تھیں مگر طبیعت میں یاسیت گھر کر چکی تھی۔ بہو سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ذرا سی چٹکی بھی لیتا تو دنیا کی تمام بہوؤں کے بخیے ادھیڑ دیتی تھیں۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر وہ ہر بہو کو غلط ہی سمجھنے لگی تھیں۔ دولت کی بھوکی' حریص اور نفس پرست۔ اب مسز ملک کے دائیں طرف جو خاتون بیٹھی تھیں۔ انہیں اس علاقے میں شفٹ ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے۔ وہ اپنی بڑی بہو کا ذکر لے بیٹھیں' جس کا سلوک ان میاں بیوی اور باقی گھر والوں سے بہت اچھا تھا اور سب اس کے گن گاتے تھے۔ مسز ملک نے ان کی بات سن کر نخوت سے سر جھٹکا اور دھیما سا ہنس دیں' پھر بولیں۔

"سلمیٰ بہن! آپ کو ایک مشورہ دوں۔ اپنی بہو سے اتنی امیدیں مت لگایئے گا۔ نہیں تو بڑی ہزیمت اٹھانا پڑے گی آپ کو۔ ابھی تو سال بھی نہیں بیتا آپ کے بیٹے کی شادی کو۔ ذرا قدم جم لینے دیجیے اس کے' پھر دیکھیے گا وہ آپ کے قدموں کے نیچے سے زمین کیسے کھینچی ہے۔"

مسز ملک بھڑاس نکال کر ہانپنے لگی تھیں جبکہ وہ خاتون ہکا بکا ان کی شکل تک رہی تھیں۔ تب ہی فرحت آپا نے جھٹ سے صورت حال سنبھالی۔

"اصل میں سلمیٰ بہن! برا مت مانیے گا۔ آج کل مسز ملک کو ان کے گھریلو مسائل نے کچھ پریشان کر رکھا ہے' جس کی وجہ سے وہ تلخ ہو جاتی ہیں' وگرنہ ان کی بات کا مطلب وہ نہیں ہے جو...."

"کیوں.... کیوں وہ مطلب نہیں ہے فرحت آپا!" مسز ملک نے درمیان سے ہی فرحت آپا کی بات اچک لی۔

"یہ بہوؤں کی خوش مزاجیاں صرف چار دن کی چاندنی کی طرح ہوتی ہیں۔ اچھا بننے کا ڈھونگ کرتی ہیں۔ جب تک ساس' سسر پیسے کی چمک دکھاتے رہیں' تب تک ان کی آنکھیں سسرالیوں کی جھوٹی محبت سے خیرہ ہوئی رہتی ہیں۔ جیسے ہی پیسہ ختم' تماشا ختم! پھر ساس' سسر گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار سے بھی کم تر لگنے لگتے ہیں۔ تب یاد رہتی ہے ان بہوؤں کو تو بس شوہر اور اس کی جیب کہ کیسے شوہر کے پیسے کو اس کے بوڑھے اور "فارغ المال" ماں باپ سے بچانا ہے۔"

بات کرتے کرتے مسز ملک رو دی تھیں۔ فرحت آپا نے ان کا دکھ دل سے محسوس کیا تھا مگر وہ دلاسے کے علاوہ اور کیا دے سکتی تھیں' جب کہ فارحہ کو قطعاً" مسز ملک کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے سب بہوؤں کو ایک ہی لائن میں لاکھڑا کیا تھا۔ وہ بھی بہو تھی۔ اس کی ساس کا بھی دل برا ہو سکتا تھا یہ سب باتیں سن کر۔ اس کی سسرال بھی خوشحال تھی مگر وہ نہیں سمجھتی تھی کہ ان کے گھر کا بہترین ماحول صرف پیسے کی دین ہے۔ فارحہ اور اس کی ساس کے بہترین تعلقات کی بنیاد میں اس کی خوش مزاجی کا بھی عمل دخل تھا۔ یہ اس کی مستحکم سوچ تھی۔

فارحہ نے ماحول کی کشیدگی محسوس کرتے ہوئے فرحت آپا کو گھر چلنے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ فی الوقت جلد سے جلد اپنی ساس کو مسز ملک کی "پہنچ" سے دور کرنا چاہتی تھی۔ اس ساری گفتگو کو اس نے مسز ملک کی نیم جہالت سے منسوب کیا تھا۔ اپنی نظر میں اس کی ساس' اچھی ساس اور وہ خود بہترین بہو تھی۔

☼ ☼ ☼

سارے دن کی چہل پہل اور گہما گہمی کے بعد سب گھر والے فارغ اور پر سکون ہو کر لان میں بیٹھے تھے۔ فارحہ مزیدار سی کافی بنا لائی تھی۔ اس کے شوہر رضا اور سسر کو اس وقت کافی پینے کی عادت تھی۔ سو وہ دونوں ساس' بہو بھی ان کے ساتھ کی خاطر کافی پہ اکتفا کرتی تھیں حالانکہ دونوں چائے کی ازحد شوقین تھیں۔

ساس' سسر اور شوہر کو کافی دینے کے بعد فارحہ اپنا مگ لے کر کین کی کرسی پہ پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئی۔ دائیں ہاتھ میں مگ پکڑے اور بائیں سے اپنے سیدھے پیر کا پنجہ دباتے ہوئے وہ آج کے دن کی گہما گہمی کو تفصیلاً" اپنی ساس کے ساتھ ڈسکس کرنے لگی۔

فرحت آپا اور ان کے شوہر جلال صاحب نے بھرپور سرپرائز دیا تھا اپنے بیٹے اور بہو کو۔ پچھلے سال جب دونوں میاں بیوی حج کرنے گئے تھے تو وہیں دونوں نے نیت کی تھی کہ ان شاء اللہ اگلے سال فارحہ اور رضا کو حج پہ بھیجیں گے کیونکہ جلال صاحب کو احساس تھا کہ بڑھاپے میں کیے گئے اور جوانی میں کیے گئے حج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مقبول ہونا یا نہ ہونا' یہ رب کے ہاتھ ہے۔ مگر انسان کو کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو جوانی میں ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جائے اور جلال صاحب نے اس سال بہو بیٹے کو حج پہ بھیجنے کا مکمل انتظام کر لیا تھا۔

جلال صاحب ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہترین منصب پہ تھے۔ برسوں دیے تھے اس نوکری کو۔ تجربہ کار اور وضع دار انسان تھے۔ حق حلال کی کمائی نے خوش حالی بھی دی تھی۔ جبکہ رضا ابھی تک جم نہیں سکا تھا۔ بار بار نوکری تبدیل کرنے کی وجہ سے ساکھ پہ بھی اثر پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بڑی مشکل سے بیس ہزار ماہانہ تنخواہ پہ نوکری لگی تھی' وہ بھی جلال صاحب کے توسط سے۔ تنخواہ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی مگر تین بچے' ان کی پڑھائی اور دیگر اخراجات بیس ہزار میں ممکن نہیں تھے' سو پورے گھر کے ستر فیصد اخراجات جلال صاحب کی ہی ذمہ داری تھے۔ گھر کے بل' راشن' بچوں کی فیسیں وغیرہ' کب کیسے اور کہاں سے پوری —— ہوتی ہیں' فارحہ کو کبھی فکر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لیے اس کے ساس سسر چھپر چھاؤں تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رضا کی جیب اس کی اور بچوں کی بے جا فرمائشیں پوری کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ لہٰذا تینوں بیٹے جب بھی فرمائشوں کی پٹاری کھولتے' فارحہ انہیں دادا جی کے پاس بھگا دیتی اور دادا جی جیب کا منہ کھول دیتے۔ وہ صرف اپنے پوتوں کے لیے نہیں' اپنے نواسے' نواسیوں کے لیے بھی دیالو تھے اور آج جو خوشی فارحہ اور رضا کو انہوں نے دی تھی' اس کا تو تصور بھی محال تھا۔ سب کو خبر تھی۔ دونوں نندیں بھی اس سرپرائز میں برابر کی شریک تھیں۔ ویسے بھی فارحہ کی دونوں سے خوب بنتی تھی۔ فارحہ کو بچوں کی طرف سے جو ذرا سی پریشانی تھی بھی' وہ اس کی دونوں نندوں نے یہ کہہ کر دور کر دی تھی کہ وہ دونوں بہنیں باری باری بچوں کی دیکھ بھال کی خاطر یہاں رہیں گی۔ پھر دادا' دادی تو تھے ہی۔ فارحہ کی امی بھی بہت خوش تھیں۔ ان کی بیٹی کو اتنی چھوٹی عمر میں حج کا بلاوا آیا تھا' یہ معمولی بات نہیں تھی۔ لوگوں کی عمریں بیت جاتی ہیں۔ آس لیے قبر میں اتر جاتے ہیں مگر حج کی سعادت نصیب نہیں ہو پاتی۔ سو فارحہ پہ تو سجدۂ شکر لازم تھا۔ کافی کا خالی مگ ٹرے میں رکھنے کے بعد اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تاکہ عشاء پڑھ سکے' ساتھ میں شکرانے کے نوافل بھی پڑھنے تھے۔

رضا اٹھ کر اندر جا چکے تھے جبکہ فرحت آپا کا اس

وقت تک لان میں بیٹھنے کا پروگرام تھا' جب تک کہ جلال صاحب لان میں اپنی روزمرہ کی ہلکی پھلکی چہل قدمی سے فارغ نہ ہوجاتے۔ یہ دونوں میاں بیوی کا روز کا معمول تھا۔ جلال صاحب لان میں چکر کاٹتے اور فرحت آپا کی نظریں ان کے قدموں کے چکر کاٹتیں۔

فارحہ ٹرے تھامے ابھی برآمدے کی سیڑھیوں تک ہی پہنچی تھی کہ اسے اپنے پیچھے زوردار دھمک کے ساتھ فرحت آپا کی چیخ بھی سنائی دی۔ رخ موڑنے سے پہلے فارحہ کے دماغ میں پہلا خوف اسی بات کا سرسرایا تھا کہ کوئی چور' ڈاکو دیوار پھاند کر اندر آگیا ہے مگر مڑ کر دیکھنے پہ اس کی خود کی چیخ نکل گئی تھی۔ جلال صاحب گھاس پہ گرے بری طرح جھٹکے کھا رہے تھے۔ فرحت آپا بوکھلائی سی ان پہ جھکی چیخ رہی تھیں۔ یکدم صورتحال بدل گئی تھی۔ چند منٹ پہلے سب خوش باش اپنی کرسیوں پر براجمان تھے۔

فارحہ نے فوراً" خود پہ قابو پایا اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے بدحواس ہونے کے بجائے رضا کو بلانے اندر بھاگی۔ جتنی دیر میں رضا اس کی آواز سنتا کمرے سے باہر نکلا' وہ ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اتار چکی تھی۔ رضا کو چابیاں پکڑا کر مختصراً" جلال صاحب کے بارے میں بتا کر باہر بھگایا اور خود کمرے میں رضا کا بٹوا لینے بھاگی۔

اگلے پندرہ منٹ میں جلال صاحب قریب ترین پرائیویٹ اسپتال میں آئی سی یو میں داخل تھے۔ انہیں فالج کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹرز نے اگلے چوبیس گھنٹے خطرناک قرار دیے تھے۔ فارحہ نے نندوں کو اطلاع بھجوادی۔ خاندان بھر میں جس نے سنا' بھاگا چلا آیا۔ پل میں پانسا پلٹ گیا تھا۔

فرحت آپا کی جان سولی پر ٹنگی تھی۔ رضا شدید پریشانی کے عالم میں ڈاکٹروں سے مشاورت میں مصروف۔ دونوں نندیں کبھی اسپتال ماں کے پاس دلاسے کے لیے تو کبھی گھر پہ اکیلی پریشانی سے ہلکان ہوتی فارحہ کے پاس۔ عجب ہولناک صورتحال تھی۔

جلال صاحب ایسا ستون تھے' جن پہ ان کے پورے گھر کی عمارت کھڑی تھی۔ بچوں کی جان تھی باپ میں تو بیوی کی تو کل متاع ہی جلال صاحب تھے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو کبھی بھی' زندگی کے کسی موڑ پر بچوں پہ انحصار نہیں کرتی تھیں' بلکہ اپنی ہر ضرورت' ہر بات' ہر دکھ سکھ کا ساتھی شوہر کو سمجھتی تھیں۔

ان کا روم روم خاوند کے لیے دعاگو تھا۔ شاید ان کی ہی طلب اتنی شدید تھی کہ اٹھارہ گھنٹے بعد جلال صاحب خطرے سے باہر نکل آئے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی جان تو بچ گئی تھی مگر دایاں حصہ بری طرح اثرانداز ہوا تھا۔ بولنے کی طاقت تقریباً" ختم ہوگئی مگر سب کے لیے ان کا بچ جانا ہی نعمت تھا۔ اللہ نے جلال صاحب کی نہیں' بلکہ سب گھر والوں کی سانسیں بڑھادی تھیں۔ رضا نے ایک اچھے اور فرماں بردار بیٹے کی طرح رات' دن ایک کردیے تھے' بیٹیوں نے جس قدر ممکن تھا' اسپتال اور گھر کی ذمہ داریوں میں ماں اور بھابھی کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ فرحت آپا کو فارحہ کی بھی فکر تھی۔ جس پہ پورے گھر کی ذمہ داری یکدم آن پڑی۔ وہ تو ہر کام پوچھ پوچھ کے کرنے کی عادی تھی' کہاں اب یوں تن تنہا مگر فارحہ نے نہایت سلیقے سے اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا تھا۔

جلال صاحب بارہ دن اسپتال میں رہے تھے اور ان کے گھر شفٹ ہونے تک فارحہ پورے گھر کا انتظام سنبھال چکی تھی۔ فرحت آپا بہت خوش ہوئی تھیں یہ سب دیکھ کر مگر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی بیٹیاں کچھ خاموش سی ہیں۔ جلال صاحب کی عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا اور اتنے رش میں وہ اپنی بیٹیوں سے ٹھیک سے بات نہیں کرپائیں اور پھر وہ دونوں۔۔۔ جلد ہی چلی بھی گئیں' کھانا کھائے بغیر۔

رات آٹھ بجے تک بہت مصروفیت رہی۔ اس کے بعد جلال صاحب دواؤں کے زیر اثر سوگئے تھے اور فرحت آپا تھکی ہوئی سی لاؤنج میں چلی آئیں۔ جہاں پہلے سے ہی رضا اور فارحہ موجود تھے۔ ماحول میں کچھ کھینچاؤ سا تھا۔ بچے بھی موجود نہیں تھے۔ حالانکہ صبح سے دادا جی کے کمرے میں بیٹھے تھے مگر عصر کے بعد سے نظر نہیں آئے تھے۔ فرحت آپا وہیں ایک صوفے پہ بیٹھ گئیں جبکہ فارحہ چائے لانے کا کہہ کر کچن میں جا چکی تھی۔ یہ تو انہیں محسوس ہوچکا تھا کہ دونوں میں کوئی تکرار ہورہی تھی مگر حیرت اس بات پہ تھی کہ ان کے آنے پہ خاموشی کیوں ہوگئی تھی جبکہ اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی رضا اور فارحہ میں بحث ہوتی تو فارحہ لازمی ساس کو بیچ میں لا بٹھاتی تھی اور پھر ایک اچھی ساس کی طرح فرحت آپا بھی فارحہ کی ہمنوا بن جاتی تھیں۔

نامعلوم وہ کیسی تبدیلی تھی' جو انہیں اپنے گھر کے ماحول میں محسوس ہورہی تھی۔ ان سے رہا نہ گیا تو وہ رضا سے پوچھ بیٹھیں۔ جواباً" رضا فارحہ پر تلخ ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"امی! دماغ خراب ہوگیا ہے فارحہ کا۔ وہی درست کررہا تھا۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔ صبح سے مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہورہا ہے۔" فرحت آپا حیران' پریشان سی کہہ بیٹھیں۔

"کچھ نہیں امی! اس کے باپ کا مال استعمال ہوتا ہے نا اس گھر میں' اس لیے آگ لگی ہوئی ہے اسے۔"

"رضا۔۔۔!" فرحت آپا تو اس کے لہجے پہ ہی حیران تھیں۔ لفظوں پہ غور تو بعد میں کرتیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں امی! یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ اس گھر کی ایک ایک چیز میرے ابو جی کی کمائی کی ہے۔ اسے کوئی بھی' کیسے بھی' استعمال کرے۔ اس کو کیوں موت پڑ رہی ہے؟"

رضا یکدم آواز تیز کر بیٹھا تھا' جس کے نتیجے میں کچن میں مگ پٹخا گیا تھا اور چند لمحوں بعد فارحہ لاؤنج میں موجود تھی۔

"میرے باپ کا مال نہ ہو' میرے شوہر کا تو ہے۔ کل کو میرے بچوں کا بھی ہوگا۔ بے دریغ کیوں لٹایا جائے۔" یہ لہک لہک کے بولنے والی فارحہ تھی۔ فرحت آپا کو یقین کرنا پڑا۔

"فارحہ بچی! ہوا کیا ہے' بتاؤ بھی تو۔۔۔؟ یہ سب کچھ ہمارے بچوں کا ہی ہے' تمہارا بھی ہے۔ پر پتا تو چلے آخر ہم نے اپنے مال میں سے کیا بے دریغ لٹادیا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی فرحت آپا تھوڑی سی تلخ ہوگئی تھیں جبکہ ان کی بات سن کر فارحہ جواب دینے کے بجائے واپس کچن کی طرف مڑ گئی تھی۔ یہ بھی کھلی بدتمیزی تھی۔ فرحت آپا نے سوالیہ نظروں سے رضا کو دیکھا تو وہ بولا۔

"امی! آج صبح ابو جی کے گھر شفٹ ہونے کی خوشی میں آپ نے جو ہزاروں روپے صدقہ کیے ہیں' وہ روپے خنجر کی طرح فارحہ کے دل میں گڑ گئے ہیں۔ مجھ سے ابھی یہاں بیٹھی یہی بک بک کررہی تھی کہ ایک تو ابو جی کے علاج کے پیچھے لاکھوں لگ گئے۔ پرائیویٹ اسپتال کی فیس' دوائیوں کا خرچ اور پھر اتنے دن کی دیکھ ریکھ میں ہی ہمارے حج کے لیے اکٹھے کیے روپے برابر ہوگئے' اوپر سے صدقے کی مد میں بھی ہزاروں لٹانے لازم ہیں کیا۔۔۔ یہ زہر اگلا ہے اس نے۔" رضا نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ پٹخ دیا۔

"اب بھی کیا میں غلط ناراض ہورہا ہوں' بتائیں ذرا۔۔۔ مجھے تو اس وقت ہی سے فارحہ' فارحہ نہیں لگ رہی جس رات میں ابو جی کو اسپتال ایڈمٹ کروا کے گھر آیا تھا اور چیک بک سے ایک بڑی رقم کا چیک کاٹا تھا۔ اسی لمحے فارحہ اپنے اصل روپ میں آگئی تھی۔ آخر ہمارے حج کے لیے یہ رقم ابو جی نے ہی جوڑی تھی نا! آج ان ہی کی جان بچانے کے کام آگئی تو اسے حیا نہ آئی منع کرتے۔۔۔ یعنی میں حج کر آتا مگر باپ کو کندھا دینے کے بعد۔۔۔!"

رضا بے دم سا یکدم آنسو بہانے لگا۔ اسی اثناء میں فارحہ تن فن کرتی کچن کی لائٹیں بند کرکے کمرے میں جاچکی تھی اور فرحت آپا۔۔۔ ان کی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا

کہ شوہر کی زندگی بچ جانے کی خوشی کریں یا اپنی بہو کے بدلنے کا ماتم۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر رضا کے پاس آ بیٹھیں اور اس کا سر اپنی گود میں دھر لیا۔ ماں کا لمس پاتے ہی وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

"امی.... آپ کو نہیں پتا۔ ان چند دنوں میں سب کچھ بدل گیا۔" وہ روتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"میں تو پھر اس کا شوہر ہوں۔ اس نے تو ثوبیہ اور سمیرا کا بھی کالحاظ نہیں کیا۔ آپ کو لگتا ہے آپ کی دونوں بیٹیاں اسپتال کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر کا بھی خیال رکھ رہی تھیں؟"

رضا نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پتا نہیں بتایا تھا یا پوچھا تھا مگر فرحت آپا کا دل بری طرح دھڑکا تھا' خوف سے!

"کیا مطلب رضا! تم کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہنوں نے میری غیر موجودگی میں فارحہ کی اور گھر کی خبر گیری نہیں کی.... کیا میں تمہاری بات کو شکایت سمجھوں؟" فرحت آپا نے دکھ سے بیٹے سے استفسار کیا۔

"نہیں امی.... بالکل نہیں۔" رضا نے بے چینی سے ماں کے ہاتھ تھامے۔

"میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ.... کہ.... بلکہ امی مجھے معاف کر دیجیے۔ میں اچھا بیٹا نہیں ہوں۔ میں نے آپ کی اور ابو جی کی چند دن کی غیر موجودگی میں ہی آپ کی بیٹیوں سے میکے کا مان چھین لیا۔ فارحہ نے انہیں لفظوں کی ایسی مار ماری کہ وہ پہلے دن سے ہی جو گئیں تو واپس نہیں پلٹیں اور میں کچھ نہیں کر سکا۔ مجھے معاف کر دیں امی! فارحہ نے اتنی باتیں کر دیں اور میری بہنوں نے وانت سے دانت نہیں اٹھایا۔ فارحہ نے انہیں کہا کہ ابو کی تیمارداری پہ ہی بڑا خرچ ہو گیا ہے اب مہمان داری پہ بھی کریں.... اور میں کچھ نہیں کر سکا امی! مجھے ثوبیہ نے قسم دی تھی کہ آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ ابو جی کی بیماری نے پہلے ہی آپ کو اتنی تکلیف میں رکھا' مزید پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔ میں بے بس ہو گیا امی۔ میرے علم میں ہونے کے باوجود میری بہنیں اپنے بیگز اٹھائے واپس چلی گئیں اور.... اور.... لیکن امی! ان دنوں میں' میں نے اللہ سے اپنے ماں' باپ کی زندگی کی ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں کیونکہ امی! آپ کے اور ابو جی کے چند دن کے لیے منظر سے ہٹ جانے پر فارحہ نے میری بہنوں کا میکے آنا بند کر دیا تو اللہ نہ کرے آپ دونوں کو کچھ ہو جائے تو.... تو امی! میں کیا کر سکوں گا....؟"

رضا بے ربط بولے گیا اور جی بھر کر ماں کی گود میں رو لیا مگر فرحت آپا کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ آگے کے حالات ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ شوہر بیمار ہو گئے تھے اور یہ بیماری کتنے ماہ تک محیط تھی' اللہ جانتا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتی تھیں کہ جلال صاحب کے بیمار ہونے کا مطلب گھر کی آمدنی اور خوش حالی میں واضح فرق تھا' جس نے ہر چیز پہ اثر انداز ہونا تھا اور کل کی آئی بہو نے' سسر کے پیسے' ان ہی کی بیماری پہ خرچ ہونے پہ واویلا مچا دیا تھا۔ آگے جا کر تو گھر کے اخراجات کا زیادہ بار رضا کی ہی پسلیوں کو سہنا تھا اور رضا اب ان کا بیٹا بعد میں تھا' فارحہ کا شوہر پہلے تھا اور فارحہ کی آواز کی گھن گرج تو وہ سن ہی چکی تھیں۔ بس اب انہیں یقین کرنا تھا کہ یہ لاؤڈ اسپیکر انہی کے گھر کا ہے' جو عنقریب ان کی رسوائی کا اعلان گھر گھر نشر کرے گا۔ رضا کی طرح وہ بھی بے بس تھیں' بالکل بے بس۔

☼ ☼ ☼

دن بے مزا اور راتیں بے کیف ہو چکی تھیں۔ وقت کو جیسے کسی نے جکڑ رکھا تھا۔ لمحہ لمحہ کاٹنا عذاب تھا۔ سارا دن گھر میں الو بولتے تھے یا دو بوڑھے پنچھیوں کے ہنکارے سنائی دیتے تھے اور وہ تھے جلال صاحب اور فرحت آپا! فارحہ تو روٹین کے کام نمٹا کر جو کمرے میں گھستی تو بچوں کی اسکول سے واپسی پہ ہی باہر نکلتی' کھانا کھلاتی اور بچوں سمیت دوبارہ کمرے میں غروب

ہو جاتی۔

ساس سسر نے کیا کھایا' کب بنایا.... اس سے اسے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ صرف ڈیڑھ ماہ پہلے کی ہی تو بات تھی۔ سب کچھ کس قدر خوبصورت تھا۔ جلال صاحب کی نوک جھونک' فرحت آپا کی حجتیں' فارحہ اور رضا کی تکرار' بچوں کی شرارتوں کی بہار' کب دن سے رات ہوتی' پتا بھی نہ چلا تھا۔ ان تمام خوبصورت لمحوں اور خوشیوں کو جیسے نظر کا کینسر چاٹ گیا تھا۔ بیماری نے جلال صاحب کو ناکارہ کیا اور بہو رانی نے ساس کو۔ پرانی ملازمہ نے حق نمک ادا کیا جو تنگی کے باوجود چھوڑ کر نہ گئی بلکہ اپنے چار جوڑے لے کر ادھر ہی دن رات کے لیے آ گئی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ بھائی کے در پر تھی۔ بانجھ تھی اور طلاق یافتہ بھی۔ کسی کو پوچھنا بھی نہیں تھا' سو جلال صاحب اور فرحت آپا کی خدمت میں جت گئی۔

فرحت آپا کو بہت آرام ملا تھا سکینہ کی چوبیس گھنٹے کی موجودگی سے۔ جب سے فارحہ نے دوبدو جنگ کا اعلان کر کے ناطقہ بند کیا تھا' یہ سکینہ ہی تھی جس کی مدد سے وہ جلال صاحب کی بیماری سنبھال رہی تھیں۔

جلال صاحب کافی چڑچڑے ہو گئے تھے۔ بول نہیں سکتے تھے مگر ہر چیز دیکھ رہے تھے اور سمجھ بھی گئے تھے۔ اذیت آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتی دکھتی تھی۔ کیا رعب و دبدبہ تھا ان کا۔ ساری عمر فرحت آپا' جلال صاحب کے غصے سے خوف کھاتی رہی تھیں۔ بچے بھی باپ کے غصے سے دبکتے تھے۔ سب کی دیکھا دیکھی فارحہ نے بھی کبھی تیز آواز میں بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اب اسی بہو کے گستاخانہ کلمات اپنے کانوں سے سنتے تھے اور بے بسی سے سر پٹختے تھے۔ حالانکہ فرحت آپا کی بھرپور کوشش ہوتی کہ ان کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچے' مگر فارحہ ایسی کوئی کوشش نہیں کرتی تھی۔

شاید اس کی دن رات کی تضحیک اور طعنے تشنے ہی تھے' جن کی وجہ سے جلال صاحب بیماری سے مایوس ہونے کے بجائے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے بہتری کی جانب گامزن تھے مگر اس کے باوجود ابھی انہیں بہت وقت لگنا تھا۔ پہلے صرف غوں غاں کی آواز نکالتے تھے جبکہ اب پورے فقرے کا ایک لفظ کم از کم منہ سے نکل جاتا تھا۔ اپنے تینوں پوتوں کو دیکھ کر زیادہ شدت سے رد عمل سامنے آتا تھا۔ گو کہ فارحہ نے ان کے دادا' دادی کے کمرے میں زیادہ گھسنے پہ پابندی لگا رکھی تھی مگر سالوں جن بچوں نے دادا دادی کی محبت کا شہد کھایا تھا' انہی سے دور رہنا ان بچوں کے لیے زہر تھا۔ بچے بھی وہ' جو گود کے نہیں' بالترتیب چار' سات اور نو سال کے تھے اور جلال صاحب کا بڑا پوتا تو ہو بہو ان ہی کا عکس تھا۔ صاف گو اور صاف دل۔ ہاں زبان کا ابھی سے ہی ذرا تیز تھا مگر قابو میں بھی کر لیا جاتا تھا۔ اسی کو سب سے پہلے اعتراض ہوا تھا ماں کی پابندیوں پر اور اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ چند دن تک تو باپ کی شام میں واپسی کا انتظار کرتا' جیسے ہی رضا گھر آ جاتا' دونوں بھائیوں کا ہاتھ پکڑتا اور دادا' دادی کے کمرے میں گھس جاتا۔ وہیں کھانا کھاتا' باپ کو بھی زبردستی لے آتا اور رضا کے سامنے فارحہ کو مجبور کرتا کہ سب ہی کا کھانا دادا کے کمرے میں لے آئیں۔ ہم سب یہیں کھائیں گے۔ رضا بھی بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا کیونکہ وہ کم از کم اس بات سے ناواقف تھا کہ فارحہ نے بچوں تک پہ پابندی عائد کر رکھی ہے۔

فارحہ شوہر کے سامنے بے بس سی بیٹے کو گھورتی کھانے کے لوازمات لینے چل دیتی۔ چند دن تو جبر کیے زہر پیتی رہی مگر پھر اس صورت حال سے بچنے کے لیے بچوں کو کھلی چھٹی دے دی کہ چاہے تو رات کو بھی دادا' دادی کے کمرے میں سوئیں مگر روزانہ رات کے کھانے کا ٹنٹنانہ ڈالیں۔ وہ کچن سے کمرے کی مسلسل پریڈ نہیں کر سکتی۔ جواب میں اپنے ہی بیٹے نے شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کندھے اچکا دیے تھے اور وہ محض کھول کے رہ گئی تھی۔ اس کے بچوں کا رویہ اس کی توقع کے برعکس تھا۔

جلال صاحب کی بیماری کے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے تینوں بیٹے دادا' دادی سے کس قدر ہلے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ساس سسر کو آرام سے کونے پہ لگالے گی کیونکہ جب سے رضا نے گھریلو اخراجات پورے کرنے کی خاطر پارٹ ٹائم جاب شروع کی تھی' وہ صبح کا گیا عام طور پر آٹھ بجے گھر آنے لگا تھا۔ جلال صاحب کی بیماری نے اسے بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا تھا مگر چونکہ سارا دن کی روٹین سے لاعلم رہنا اس کی مجبوری تھی اور فارحہ جانتی تھی کہ اس کی ساس منہ سے دھواں بھی نہ اگلیں گی۔ وہ فساد سے کوسوں دور بھاگتی تھیں مگر اپنے بچوں کے لیے وہ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ تینوں "فسادی" تھے۔ باپ کو پوری رپورٹ دیتے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ رضا کا دل مزید اس سے دور ہو پہلے ہی حالات نے ان کے درمیان کافی فاصلے بنا دیے تھے۔ کچھ ذمہ داریوں کے بوجھ نے بھی اسے بے حد حساس بنا دیا تھا۔

رمضان شروع ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ رقم جوڑ سکے' تاکہ رمضان کو بالکل اسی طرح اہتمام سے منا سکے جیسے جلال صاحب اور فرحت آپا کا چلن تھا۔ سحری' افطاری کے اہتمام کے علاوہ عید کی تیاری کے لیے بھی بڑی رقم چاہیے تھی۔ بہنوں کی عیدیاں' بچوں کے کپڑے' جوتے۔ ماں' باپ کے لیے تحفے اور فارحہ کے لوازمات۔

وہ تو ابھی سے ہی تھکنے لگا تھا۔ پتا نہیں جلال صاحب اور فرحت آپا ہمیشہ اتنا اہتمام کیسے کر لیتے تھے؟ وہ کبھی تھکے کیوں نہیں؟ ان کی پیشانیاں اتنی شفاف کیسے تھیں کہ ان کے بچوں کو کبھی بھی فکر' دکھ یا پریشانی کی ہلکی سی سلوٹ کبھی نظر نہ آئی۔ اولاد... صرف اولاد کے لیے' والدین اتنی خاک چھانتے ہیں اور یہی سوچ اسے ٹوٹنے نہیں دیتی تھی کہ اب وہ اپنے والدین کو بالکل ویسے ہی حالات لوٹانے کی کوشش کرے گا۔ جیسے انہوں نے صحت مندی کے دور میں اپنی اولاد کو مہیا کیے۔ رضا کی سوچوں نے ایک بالکل مختلف کروٹ لے لی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کے تین نہیں پانچ بچے ہیں اور بے شک اسے اپنی اولاد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ فارحہ سے بھی زیادہ۔

✵ ✵ ✵

رمضان جس خاموشی سے آیا' اتنی ہی خاموشی سے گزرتا جا رہا تھا۔ رمضان کا مخصوص شور شرابا اور جوش مفقود تھا۔ صرف دو انسانوں کی جہاں دیدہ آنکھیں رب کے حضور آنسوؤں کی لمبی لمبی تسبیحیں پروتی تھیں یا پھر پریشانیاں کثیر سجدوں کی بدولت پرنور رہتی تھیں۔ ادھر فارحہ تھی کہ اس کے لیے شادی کے دس سالوں میں پہلا رمضان تھا جو بے تحاشا تھکن اور ہڑبونگ لے کر آیا تھا۔ اب سے پہلے تو فرحت آپا کی بدولت کتنے ہی کام تھے جو مل بانٹ کر ہو جاتے تھے۔ ڈھیروں لوازمات بھی تیار ہوتے تھے' پھر بھی عبادت کے لیے معقول وقت ہاتھ آتا تھا لیکن اس دفعہ تو فارحہ بمشکل نماز پڑھ پاتی اور پھر سے کچن کی ٹینشن۔

اب بھی سکینہ کا ساتھ تھا۔ مگر کام تھے کہ نبٹتے ہی نہ تھے۔ صبح سحری کے لیے اٹھتی تو پھر ٹیک لگانا نصیب نہ ہوتا۔ محض دو گھنٹے بعد ہی تو بچوں کو اسکول کے لیے اٹھانا ہوتا تھا اور یہ دو گھنٹے سکینہ کے ساتھ کچن سمیٹتے کہاں جاتے' سمجھ سے بالا تھا۔ پہلے فرحت آپا نے یہ ذمہ داری اٹھا رکھی تھی کہ فجر پڑھ کر وہ کچھ دیر کی نیند لے کر اٹھ جاتی تھیں اور پھر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر کے روانہ کر دیتیں۔ پھرتیلی تھیں' آرام سے ہینڈل کر لیتی تھیں۔ بچوں کے جانے کے بعد تلاوت کرنے بیٹھ جاتیں اور پھر فارحہ کے لیے آرام کا بھرپور وقت فراہم کرتی تھیں مگر اب رویوں میں کیا تناؤ آیا' رشتوں میں بھی کھچاؤ آ گیا تھا۔ کوئی بھلی سی گھڑی ہوتی تو ہلکا سا پچھتاوے کا احساس فارحہ کے دل میں جاگتا ضرور تھا مگر اب انا پیچھے مڑ کر دیکھنے نہیں دیتی تھی۔

رمضان المبارک کا دوسرا عشرہ شروع ہوا تو رضا نے تمام کوششیں بروئے کار لا کر فرحت آپا کو عید کے لیے مناسب رقم فراہم کر دی تھی۔

ایک شام رضا گھر آیا تو ماں' باپ کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا اور وہیں پہ فرحت آپا کے ہاتھ پہ پیسے دھر دیے۔ اس وقت فارحہ اور بچے بھی وہیں موجود تھے اور رضا جان بوجھ کر فارحہ کی ضد میں اپنے ماں' باپ سے زیادہ التفات جتاتا تھا۔ دونوں کے درمیان سرد جنگ کی سی کیفیت ہنوز قائم تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ فارحہ کو چوٹ لگاتا تھا مگر اس بات سے بے خبر کہ اگلے دن فارحہ اس کے دفتر جانے کے بعد اپنی چوٹ پہ لگانے کے لیے مرہم کا بخوبی انتظام کر لیتی تھی۔ فرحت آپا کو خوب ذلیل کر کے۔

جلال صاحب کی بیماری کے بعد سے جب رضا نے پہلے ماہ کی تنخواہ ماں کے ہاتھ پہ دھری تھی۔ تب بھی فارحہ نے اگلی صبح شوہر کی غیر موجودگی میں وہ تماشا لگایا تھا کہ فرحت آپا نے آئندہ کے لیے قسم کھالی تھی۔ سو اس دفعہ اس رقم کو بھی صبح رضا کے جانے کے بعد خاموشی سے انہیں فارحہ کے حوالے کر دینا تھا۔ دلوں میں زہر بھر جائے تو رشتے نیلے پڑ جاتے ہیں۔ ان ساس' بہو کا رشتہ بھی نیلا پڑ چکا تھا۔ مگر فرحت آپا' بیٹے کا بھرم ٹوٹنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ رضا جذباتی تھا۔ اس کا مان ٹوٹتا تو وہ فارحہ سے اپنا رشتہ توڑ دیتا۔ نتیجہ بھگتتے تین معصوم بچے! زندگی کا کیا تھا۔ اس نے تو گزر ہی جانا تھا۔

رات کے پیچھے دن بھاگا چلا آتا اور ایسے ہی کسی دن کے اوپر رات اترتی اور ان کی زندگی میں آخری ثابت ہوتی۔ زندگی کا کیا ہے۔

✵ ✵ ✵

آج بائیسواں روزہ تھا۔ آخری عشرہ شروع ہوتے ہی "جلال ہاؤس" کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ عبادتیں زور پکڑ لیتیں۔ ساری ساری رات قرآن پڑھا جاتا۔ عید کی تیاریاں ایک ولولے کے ساتھ شروع ہو جاتیں۔ کس کو کیا دینا' دلانا ہے' یہ سب کچھ دونوں ساس بہو بخوبی نپٹاتی تھیں۔ ملازموں کے جوتے' کپڑے تک بجٹ میں شامل ہوتے مگر اس دفعہ چونکہ فرحت آپا تمام رقم فارحہ کے ہاتھ میں تھما چکی تھیں۔ سو کسی بھی بات میں دخل انداز ہونے سے گریز کر رہی تھیں اور فارحہ کا تو دل کر رہا تھا' دیواروں سے سر ٹکرائے' کیونکہ اس پر یہ آشکار ہو چکا تھا کہ وہ کوئی اچھی منتظم نہیں تھی۔ عید بجٹ میں سے کچھ رقم بے کار کے کاموں میں اڑ بھی چکی تھی اور بقایا پیسوں میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

دل تو چاہتا تھا کہ لمبی تان کے سو جائے اور جب اٹھے تو عید گزر چکی ہو۔ سب کچھ متاثر ہو گیا تھا۔ ساس پہ رہ' رہ کر تاؤ آتا کہ صرف جلال صاحب کی سیوا کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ سکینہ تھی تو' وہ ان کی چمچی۔ رضا اور بچے گھر میں جب تک موجود ہوتے دادا' دادی کا دل بہلاتے رہتے۔ اکیلی تو وہ خود پڑ گئی تھی۔ نندوں سے بے حد دوستی تھی' پر ان کا کانٹا خود ہی کھینچ نکالا تھا۔

جب سے جلال صاحب بیمار ہوئے تھے۔ دونوں نندیں گن کر بھی تین دفعہ آئی ہوں گی۔ وہ بھی اکیلی' بغیر خاوند اور بچوں کے۔ تاکہ شوہروں کے آگے میکے کا بھرم نہ جائے۔ بھابھی کے تیور انہیں خوف زدہ کرتے تھے کہ میکے کی کمزوری سسرال والوں کے ہاتھ نہ لگے۔ فارحہ کی زبان بند رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے منہ نہ لگا جائے۔ دونوں جب بھی آتیں' سیدھی ماں' باپ کے کمرے میں چلی جاتیں اور وہیں سے واپسی۔ فارحہ سے اگر سامنا ہو بھی جاتا تو سلام لے کر منہ پھیر لیتیں۔

جواب میں جانتی تھیں' فارحہ بی بی کچھ نہیں پھوٹیں گی۔ ہاں! بھتیجوں میں جان اٹکتی تھی۔ جب سے جلال صاحب بیمار ہوئے تھے اور فارحہ نے ساس' سسر کا حقہ پانی بند کیا تھا۔ تب ہی سے فارحہ کا اپنے میکے کی طرف جانا ذرا کم کم ہی تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کے میکے والوں کا رویہ تھا۔ جب سے فارحہ نے فخریہ

اپنی ماں اور بہنوں کو بتایا تھا کہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیسے ایک جھٹکے میں ساس کے پیروں سے اس کی سلطنت کھینچ نکالی ہے۔ گھر کے تمام اخراجات کو اپنے کنٹرول میں لیا ہے۔ تب ہی سے اس کی ماں اور بہنیں اس سے سخت نالاں تھیں اور فارحہ ان سے خفا۔ لو بھلا! کیسی ماں' بہن تھیں جنہیں اپنی بیٹی کے اختیارات پر اعتراض تھا۔ امی کو دکھ تھا کہ فارحہ نے ان کی تربیت کو کھوہ کھاتے ڈالا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ فارحہ کی ساس اس کے ساتھ بے حد اچھی ہیں' کوئی تنگی ترشی نہیں۔ رضا پیار کرنے والا شوہر ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ آمدن کم تھی اور گھر کا زیادہ بار جلال صاحب کی تنخواہ پر ہے مگر اس کے باوجود فارحہ کو پھپھولا بنے تو انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ یہی گلہ بھائی' بہنوں کو بھی تھا۔

وہ بہنیں جو خود منہ سے اپنے لیے فارحہ جیسی سسرال مانگتی تھیں۔ وہ کیسے فارحہ کے اس اقدام کو سراہتیں؟ اب جو بھی تھا' وہ ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکی تھی اپنی زندگی کا۔ اسے انتظار تو کرنا تھا گرد بیٹھنے کا۔ پھر سب اسی کا تو ہوتا۔ وہ' رضا اور بچے' آہ! کتنا پیارا لگتا ہے بولنے میں۔ مگر فی الحال وہ اپنے محاذ پہ بالکل اکیلی تھی۔

سکینہ کو کچن سے آوازیں دیتی اور سر کو دوپٹے سے لپیٹتی وہ پچھلی طرف بنے کمروں کو چل دی۔ آج سے شروع کرے گی تو کچھ دن تک صفائیوں کا کام ختم ہو گا نا! وہ دل میں دنوں کا حساب کرتی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔

دروازے کے سامنے دیوار پہ فل سائز کھڑکیاں تھیں' جن پہ گہرے رنگ کے موٹے پردے پڑے تھے۔ آج وہ بڑے دنوں کے بعد اس طرف کے کمروں کی صفائی کرنے آئی تھی۔ شاید اتنے ہی دن بعد جتنے دن اسے سب سے لاتعلق ہوئے ہو گئے تھے۔ کمرے میں سیلن کی بو اور عجیب طرح کی گھٹن تھی۔ حالانکہ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر ان کے پٹ کھول دیے۔

نرم گرم دھوپ کے سنہری جھونکوں نے یک دم کمرے کی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ اچانک اس کا دھیان دائیں طرف سے آنے والی آوازوں سے بٹ گیا۔ اس نے خود کو بچاتے ہوئے۔ ذرا سا جھانک کر دیکھا تو کم و بیش دس فٹ کے فاصلے پہ ایک جانا پہچانا منظر اس کی نظروں کو جلا گیا۔ کبھی ایسے مناظر کا وہ خود بھی حصہ تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی محفلیں وہ خود سجاتی' سنوارتی تھی۔

پچھلی طرف جلال صاحب نے پھل دار درخت لگا رکھے تھے۔ بڑے سارے صحن میں مزے دار سی دھوپ تیر رہی تھی۔ وہیں صحن کے بیچوں بیچ تخت پہ جلال صاحب گاؤ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ جبکہ فرحت آپا بڑی مشاقی سے ان کی دائیں پنڈلی کا مساج کر رہی تھیں۔ جلال صاحب کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ نہ صرف چند قدم چل لیتے تھے بلکہ ٹوٹے لفظوں میں بات کا مفہوم سمجھانے کے قابل بھی ہو گئے تھے اور اس بات کا سہرا ان کے پوتوں کے سر تھا۔ جتنی لگن سے وہ جلال صاحب سے باتیں کرتے تھے اور کندھے دباتے ہوئے انہیں بلوانے کی کوشش کرتے تھے' وہ قابل تحسین تھا۔ اپنے اسکول کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر ماں کے نازیبا رویے کو بیان کرتے ہوئے خود کو تمام معاملے سے بری ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

اس وقت بھی فارحہ صاف دیکھ اور سن سکتی تھی کہ اس کا بڑا بیٹا' کس طرح اپنے چھوٹے مگر مضبوط ہاتھوں سے دادا کے کندھے دباتے ہوئے پٹر پٹر کیے جا رہا تھا۔ جبکہ دونوں چھوٹے بیٹے' دادا جی کی چھڑی کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ دونوں کو لاٹھی ٹیک کے چلنے کا شوق چرایا تھا آج کل۔ فارحہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ دل پتا نہیں کیوں خالی خالی سا محسوس ہوا۔ شاید پچھتاوا۔

نہیں پچھتانا نہیں! اتنی آسانی سے سب حاصل کر کے چھوڑ دینا حماقت اور ذلالت ہے۔ اس نے خود

کو ڈپٹتے ہوئے واپس مڑنے کا قصد کیا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے اپنے بیٹے کے منہ سے نکلتے ایسے کلمات ٹکرائے جنہوں نے اس کی ہستی کے پرخچے اڑ کر دیے تھے۔ وہ لاکھ سے خاک ہو گئی۔

اس کا وہ بیٹا جسے وہ محض نو سال کا ایسا بچہ گردانتی تھی' جسے وہ جب اور جیسے چاہتی اپنے من پسند سانچے میں ڈھال لیتی۔ تھوڑا سا دباؤ اس کی سوچوں پہ ڈالتی اور دادا' دادی سے اس کے جذباتی لگاؤ میں دراڑیں پڑ جاتیں۔ اس کا وہی سیانا سپوت دادا جی کے کندھے دباتا ہوا دادی سے بولا تھا۔

"دادی جی! آپ نے وہ پیسے ماما کو واپس کیوں کیے۔ جو آپ کو پاپا نے عید کے لیے دیے تھے؟" وہ بھنویں اچکاتا دادی سے سوال کر رہا تھا۔ جبکہ عید کے نام پہ فارحہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"بس میرا بچہ!" فرحت آپا جلال صاحب کو موزے پہنا رہی تھیں۔ "میں سارا دن تو تمہارے دادا جی کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ کہاں سے اتنا ٹائم لاتی کہ شاپنگ بھگتاتی پھرتی۔" فرحت آپا نے نرمی سے بات نبھائی۔

"نہیں دادی جی! غلط بات' آپ بچوں سے جھوٹ مت بولیں۔" وہ دادا جی کے کندھے چھوڑ تخت پہ چڑھ کر بیٹھ گیا' پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں دادی جی! ماما آپ سے لڑتی ہیں اور پیسے بھی لڑائی کی وجہ سے آپ نے انہیں دیے ہیں۔ میں پاپا کو اسی دن بتا دیتا اگر مجھے ان کی ٹینشن کا خیال نہ ہوتا۔ وہ اکثر ساری رات جاگتے ہیں دادی جی! میں نے دیکھا ہے انہیں۔ مگر میں نے سوچ لیا ہے دادی جی! اگر ماما نے مجھے آپ سے اور دادا جی سے دور کرنے کی کوشش کی تو میں پاپا کو کہہ کر بورڈنگ میں چلا جاؤں گا۔ مگر ماما کے پاس بھی نہیں رہوں گا۔ پاپا کہتے ہیں یہ گھر دادا جی کا ہے' ہر چیز دادا جی کے پیسوں کی ہے۔ پھر بھی ماما نے سب کچھ آپ سے چھین لیا ہے۔ جب میں پاپا کی طرح ڈھیر سارا کمانے لگوں گا تو آپ کو اور دادا جی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ماما' پاپا کے پاس یہ دونوں رہیں گے۔"

اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرف اشارہ کیا جو دادا کی چھڑی چھوڑ کر سائیکل دوڑانے میں مصروف تھے۔ فرحت آپا کا منہ حیرت سے کھلا تھا اور جلال صاحب کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ شاید دکھ کا یا پھر خوشی کا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حیران پوتے کی باتیں سن رہے تھے۔ یقین کرنا دشوار تھا کہ اتنا فہم و ادراک اپنے نو سالہ بچپن میں سموئے ہوئے ہے۔ ان کی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

"دادا جی! میں نے عید سے کچھ دن پہلے ہم تینوں بھائیوں کے منی باکس کھولنے ہیں۔ ان میں سے جتنے پیسے نکلے گے' وہ میں آپ کو دوں گا۔ آپ دونوں پھپھو کے ہاں عیدی لے جاتی ہیں۔ ہم پھپھو اور چھوٹی پھپھو کو عیدی دے کر آئیں گے۔" اس نے اپنا ارادہ بتایا۔

"بہت غلط بات ہے بیٹا!" فرحت آپا پوتے کو گھورتے ہوئے بولیں' جبکہ آنکھیں اس کی محبت نے نم کر دی تھیں اور جلال صاحب بھی مستقل فخر سے مسکرائے جا رہے تھے۔

"ماں سے چھپ کر کوئی بھی کام نہیں کرتے۔ وہ ماما ہیں آپ کی۔ آپ سے پیار کرتی ہیں اور انہوں نے کچھ نہیں چھینا ہم سے۔ سب آپ ہی لوگوں کا تو ہے بیٹا! ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اتنے پیسے سنبھال نہیں پاتے' اس لیے تمہاری ماما کو دے دیتے ہیں۔ ماں' باپ کے لیے غلط نہیں سوچتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے اور صاحب زادے! اپنے پیسے کو سنبھال کر رکھو۔ سمجھے! زیادہ ہوشیار مت بنو۔ آج مجھے پتا چل رہا ہے کہ میرے پوتے کے پیٹ میں داڑھی ہے۔" ان کا کام تو سمجھانا تھا۔ یہ سب ان ہی کے بچے تھے۔ وہ ایک کو دوسرے کے خلاف کیسے ہوتا دیکھ سکتی تھیں۔

"اچھا جاؤ ذرا' کچن میں دیکھو کوئی ہے تو نہیں۔ میں ذرا تمہارے دادا جی کے لیے یخنی بنا لوں' جاؤ شاباش۔" انہوں نے پوتے کو وہاں سے اٹھایا۔ مگر وہ جاتے جاتے بھی انہیں لقمہ دے گیا۔

"دیکھا! آپ ماما کے ہوتے ہوئے کچن میں نہیں جاتیں 'بہادر بنیں دادی جی! بہادر.....!"

فرحت آپا نے افسردگی سے سر جھکالیا۔ جبکہ کھڑکی سے ذرا ہٹ کے کھڑی فارحہ پتھر کی ہوچکی تھی۔ اس کے تمام اعضا جیسے جم سے گئے تھے۔ بے جان ہوتے ہاتھوں سے اس نے اپنے پیٹ کو جکڑا جس میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ پتا نہیں کیسے اپنے کمرے تک آئی۔ اور بیڈ کے ساتھ کمر ٹیک کر نیچے کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔ یہ کیا ہوگیا؟ چالاکی اور بے حسی کا اٹھتا متعفن دھواں اس کے بچوں کو اس سے بہت دور لے گیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ان سے تو دور نہ کر سکی 'پر خود کو سب سے دور کرلیا' رضا سمیت۔

"نہیں 'بالکل بھی نہیں' ایسا کیا ہوگیا جو رضا مجھ سے دور ہوں.... چار دن کی سرد مہری کوئی ساری عمر پہ محیط کیسے کرسکتا ہے؟ کچھ دن' محض کچھ دن کی بات ہے۔ بس میں اپنے اور رضا کے تعلقات کو پرانی ڈگر پہ لے آؤں گی۔" اس نے ایک دفعہ پھر اپنے اندر کی آواز کو ڈپٹ کر امید کا دامن تھاما۔

اس کا ضمیر اس پہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے پاگل کہہ رہا تھا۔

"یاد رکھنا فارحہ بی بی! تمہارے ساس 'سسر تمہارا حال ہیں۔ اس حال میں تمہیں ہر حال میں جینا ہے۔ اپنے حال سے نباہ کرلو۔ تمہارا مستقبل' تمہارے بچے' تمہیں نباہ لیں گے۔ ورنہ سوچ لو! ببول بو رہی ہو' کانٹے تمہارے ریشے ریشے کو زخمی کردیں گے۔ اپنے بچوں کو بچالو تمہارے بچے تمہارے تین قیمتی رتن..... تمہارے ہاتھوں سے پھسل کر وقت کے صحرا میں گم ہوجائیں گے۔ اپنے بچوں کو بچالو۔ خود کو بچالو۔"

وہ پسینے پسینے ہوگئی تھی۔ کوئی کانٹوں بھری جھاڑی تھی' جس کی مار نے اس کا پور پور چھلنی کردیا تھا' ضمیر کا چابک شاید ایسا ہی زوردار ہوتا ہے۔

فارحہ نے تھک کر سر جھکالیا۔ اس کے چہرے پہ گرتے آنسو اس کے ہارنے کی دلیل تھے۔ وہ ہار گئی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ہاتھوں ہاری تھی۔ ساری دنیا اس سے چھوٹ جاتی' اسے پروا نہیں تھی۔ پر وہ بچے جن میں اس کی جان تھی۔ انہیں کس دل سے گنواتی۔ اس کے کانوں میں اپنی ماں کے کہے بول گونج اٹھے۔

"ظالم مت بن فارحہ! اپنی ساس کا اکلوتا بیٹا اس سے دور کرکے یہ گمان مت کرنا کہ تم نے تین بیٹے پیدا کیے ہیں۔ ایک نہ رکھے گا' دوسرا نہ رکھے گا' تیسرا تو ہے ہی! کبھی کبھار دس بیٹے بھی ایک ماں نہیں سنبھال پاتے۔ مت اپنے پرسکون آشیانے کو چنگاری دکھا۔" ماں کی تنبیہہ آج بھی اکثر اس کے حواسوں کو جھنجھناتی تھی۔

"آپا! تم ناشکری ہو۔ ہم تو اپنے لیے تمہارے جیسی سسرال کی دعا کرتے ہیں لیکن تم تو ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مار رہی ہو۔" اس کی بہنوں نے بھی اسے کتنا سمجھایا تھا۔ پتا نہیں وہ خود کو عقل کل کیوں سمجھ بیٹھی تھی۔

کیوں میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں نے کیوں مسز ملک کی کہی بات سچ ثابت کردی۔ سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے۔ 'بہو تب تک خوش رہتی ہے' جب تک گھر میں ریل پیل ہو۔ ذرا تنگی ہوئی نہیں' بہو کا ظرف تنگ پڑ جاتا ہے۔" اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ایسی بہو نہیں۔ دس سال جس سسر کی کمائی سے بے تحاشا کھایا' اس کے آگے دس گھنٹے بھی زبان کا بھرم نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں کے آگے رہ' رہ کر وہ منظر گھوم رہا تھا' جب اس نے اکڑ کر ہتھیلی فرحت آپا کے آگے کی تھی۔ جس میں رضا کے تھوڑی دیر پہلے تھمائے وہ نوٹ دبے تھے جن کو وہ گھر کے خرچے کے لیے دے کر دفتر نکل گیا تھا اور اس صلح جو عورت نے پل بھی نہ لگایا تھا اور پورے وقار اور تمکنت سے اپنی گرہستی اس کی ہتھیلی پر دھر دی تھی۔

یہ وہی عورت تھی جو ہر تہوار پہ جی بھر کر فارحہ پر خرچ کرتی تھی۔ صرف یہی نہیں تم اس کے میکے میں بیٹھی اس کی چھوٹی بہنوں کو ہر عید' تہوار پہ عیدی کے نقد یا ڈھیر سا پھل فروٹ بھیجنا جیسے فرض تھا۔ کبھی فارحہ کو کہہ دیتیں اور وہ بہنوں کے جوڑے بنا لیتی۔ آج اسی عورت کی بیٹیوں اور اپنی نندوں کے لیے اس کے پاس ٹکا نہیں تھا۔ وہ انہیں چائے کا ایک کپ پلانے کی روادار نہیں رہی تھی۔ اسے چنداں فکر نہیں تھی کہ اس کی ساس اپنی بیٹیوں کو عیدی کیسے بھوائیں گی۔ کیا بھائی ہونے کے ناتے رضا کا فرض نہیں تھا کہ بہنوں کو کچھ دے؟ پر اس نے کسی کو کچھ کرنے کے قابل رہنے کب دیا تھا۔

عصر کی نماز پڑھ کر اس نے اپنے لیے دعا مانگی۔ رب سے معافی طلب کی اور حوصلہ جوڑتی باہر نکل آئی۔ تینوں بچے فرحت آپا کے کمرے میں جلال صاحب کے ساتھ ان ہی کے بستر میں گھسے سو رہے تھے۔ اسے ملال سا ہوا کہ وہ اتنی دیر سے کمرے میں بند تھی تو کیا کسی بچے کو ماں کی ہڑک نہیں ہوئی۔ کسی نے اس کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی۔ ساس پر تو اس کے اپنے رویے نے بند لگادیے تھے مگر بچے....؟ وہ دبے پاؤں کوریڈور سے گزرتی باہر لان کی طرف نکل آئی۔ لان میں بچھی کرسی پر فرحت آپا کو دیکھ کر اسے ایک دفعہ پھر ڈھیروں رونا آیا۔ کتنا سکون تھا ان کے چہرے پر' کس قدر جذب کے ساتھ وہ قرآن پاک کی تلاوت کررہی تھیں۔ کبھی وہ بھی ان کے ساتھ والی کرسی پر براجمان رمضان کی برکتیں سمیٹتی تھی۔ دونوں بیٹھے بیٹھے کتنے سپارے ختم کرلیتی تھیں۔ پھر افطاری کی تیاری کے لیے کچن کی راہ لیتی تھیں۔

وہ دو قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے آہستہ سے اپنے بازو اٹھائے اور نرمی سے فرحت آپا کی گردن کے گرد حمائل کردیے اور وہ بری طرح سسک اٹھی۔ فرحت آپا نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی پرسکون مسکراہٹ اور آنکھوں میں شکرانے کے آنسو چمک اٹھے۔ وہ دیکھے بغیر جانتی تھیں کہ ان کے گرد محبت سے لپٹے بازو فارحہ کے ہیں۔ وہ اس کے ہر ہر انداز سے واقف تھیں۔ دس سال کا ساتھ تھا۔ بیٹیوں سے بڑھ کر چاہ کی تھی۔ ماں والا مان دیا تھا اور ماں اپنی اولاد کی ہر ادا کو پہچانتی ہے۔ وہ پشیمان تھی۔ انہیں خبر تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جتانا بے معنی تھا اور ابھی پلوں کے نیچے بہت سا پانی تھا۔ بات گھر کی چار دیواری کے اندر ہی تھی۔

وہ محبت سے اس کے ہاتھ سہلائے جارہی تھیں۔ انہوں نے قرآن پاک آگے پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔ جب وہ خوب رو چکی تو اسے پیار سے کھینچ کر اپنے سامنے کیا۔ فارحہ وہیں گھاس پر گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئی اور سر فرحت آپا کی گود میں دھر دیا۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنی ساس کے ظرف کی وسعت کی قائل ہوگئی۔ انہوں نے فارحہ کا ماتھا چوما اور کہا۔

"چلو اندر! رضا آتا ہوگا۔ افطار کا وقت قریب ہے۔ مل کر تیاری کرتے ہیں۔ میں اور تم' تم اور میں۔"

وہ یوں بولیں جیسے دو سہیلیاں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ فارحہ ان کے انداز پہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اردگرد کھڑے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی میٹھی میٹھی ہوا نے رمضان کی برکتوں اور رحمتوں کی ٹھنڈی پھوار برسادی۔



حالات کی کشتی جس تیزی سے الٹی تھی' اتنی ہی تیزی سے سیدھی ہوکر وقت کی موجوں پہ سبک رفتاری سے رواں دواں ہوگئی۔ بروقت تدبیر کرنے سے بہت سا نقصان ہونے سے بچ گیا تھا۔ فارحہ نے دونوں نندوں کو فون کرکے ستائیسویں روزے کی افطاری کی دعوت دی تھی۔

جلال صاحب کے پاس بیٹھی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور رو دی۔ جلال صاحب جو کہ پہلے سے کافی صاف اور بہتر گفتگو کرنے لگے تھے۔ انہوں نے فارحہ کے سر پر ہاتھ دھر کر محض اتنا کہا۔

"بیٹا! مجھے نوکری پر تو لوٹنا تھا تم میرے صحیح ہونے کا انتظار تو کرتیں۔ ذرا سا ہی تو کرنا تھا۔"

اور فارحہ کی شرمندگی کے مارے رگیں کھنچ گئی تھیں۔ گیاوقت کبھی واپس نہیں آتا مگر حال میں رہتے ہوئے انسان بہتر مستقبل کشید کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے۔



ایک دفعہ پھر پرانا منظر تھا۔ وہی ہلا گلا، وہی رونقیں، ٹی وی لاؤنج کی سینٹرل ٹیبل پر رنگ برنگے خوب صورت کاغذوں میں لپٹے بڑے بڑے پیکٹ دھرے تھے۔ نیچے فرش پر پھلوں اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں تھیں۔

آج انتیسواں روزہ تھا۔ امید تھی کہ چاند نظر آجائے گا۔ اگر کل عید ہوجاتی تو بہت سے کام ادھورے رہ جانے تھے۔ ابھی دونوں نندوں کو عیدی بھی پہنچانی تھی۔

دو پیکٹ اس کے میکے پہنچنے تھے۔ بچوں کی اور اپنی کچھ عید کی تیاری باقی تھی، پھرواپس آکر صبح کے لیے لمبی چوڑی تیاری تھی۔ اس لیے اس وقت فرحت آپا اور فارحہ شدید مصروف تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر بچوں اور رضانے مل کر طوفان کھڑا کیا ہوا تھا۔ افطاری کی تیاری آج مصروفیت کی وجہ سے بروقت نہیں ہوسکی تھی اور روزہ کھل چکا تھا۔ سو فارحہ کا ایک پاؤں کچن میں اور ایک ڈائننگ روم میں تھا۔ اوپر سے رضا اور بچوں کا ہنگامہ۔ کبھی کوئی چیز چاہیے ہوتی اور کبھی کوئی۔ کسی کو دودھ سوڈا چاہیے تھا۔ کسی کو کولڈ ڈرنک۔

فارحہ جانتی تھی کہ باپ، بیٹے اسے جان کر زچ کررہے ہیں۔ پر وہ چڑ نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے بچوں کی ماما، ماما کی پکار اور رضا کی فارحہ، فارحہ کی آوازیں کسی سریلے اور کیف آور گیت سے کم محسوس نہیں ہورہی تھیں۔

وہ ٹیبل پہ مطلوبہ چیزیں رکھ کر واپس کچن میں گئی اور ٹرے میں جلال صاحب کے لیے افطاری کا مزید کچھ سامان سجایا اور ان کے کمرے کا رخ کیا۔ جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے فرحت آپا، جلال صاحب کے لیے کھجوریں، چکن سوپ اور چاٹ کا باؤل لے کر گئی تھیں اور اب ان کے جلال صاحب سے الجھنے کی آوازیں دروازے سے باہر کھڑی فارحہ کو بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی دروزاہ کھول کر اندر چلی آئی، جہاں فرحت آپا، جلال صاحب کو سوپ پلانے کی کوشش میں تھیں۔ اور جلال صاحب فل نخرے کے موڈ میں۔

وہ چھڑی کے سہارے تھوڑا تھوڑا چلنے لگے تھے مگر پھر بھی فرحت آپا کے اصرار کے باوجود باہر ٹیبل پہ چل کر افطاری نہیں کرتے تھے۔

"دیکھ لو فارحہ! اپنے سسر کو۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ ٹرے رکھتی فارحہ کو مخاطب کیا۔ "اب اس عمر میں مجھے تو لگتا ہے جیسے میں نئے سرے سے بچہ پال رہی ہوں۔ نخرے ہی ختم نہیں ہوتے جناب کے۔"

فرحت آپا نے نرمی سے جلال صاحب کی داڑھی پہ لگے سوپ کو ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

"کوئی بات نہیں امی! آپ کے پلے پلائے بیٹے کو بھی مجھے نئے سرے سے پالنا پڑ رہا ہے۔ آوازیں سن رہی ہیں آپ؟ اتنا آپ کے پوتے شور نہیں کرتے، جتنا رضا۔" فارحہ کے جواب پر جلال صاحب اور فرحت آپا کھلکھلا کر ہنس دیے۔۔۔۔ ہنستی ہوئی فارحہ کی فرحت آپا نے دل ہی دل میں بلائیں لیں۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے فارحہ کی نظر کوریڈور سے دکھتے لان پر پڑی، جہاں درخت جھوم جھوم کر آسمانوں سے اترتی انمول خوشیوں اور رحمتوں کا استقبال کررہے تھے۔ فارحہ نے دل سے اپنے "مستقبل" کی ان خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کی اور آنکھوں سے تشکر کے آنسو چنتی سامنے ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے اپنے "حال" کی طرف چل دی۔



آمنہ ریاض

ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپتے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینہ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی' جولید اور ایلینا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں ایلینا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعتا" سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے، وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت، دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ، ماویٰ کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس، ماویٰ کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ، ماویٰ پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماویٰ کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، بس پروہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ، ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو، رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت، دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ، ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

ماویٰ بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیہہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انیبا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر اسراریت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی، جب ہی ایک صبح اسے شبیہہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماویٰ کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماویٰ کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماویٰ سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حریم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان، ماویٰ کی پر اسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماویٰ پاکستان میں ہی ہے لیکن انیبا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال، ماویٰ سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہہ نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔

شبیہہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماویٰ سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیہہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان، ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماوی نے حویلی کی خاص ملازمہ تسنیم کو آمادہ کرلیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہورہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تسنیم نے ماوی کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تسنیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی۔

وہ تسنیم کا باپ ہوتا ہے۔ تسنیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔ برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کردیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے لیے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا جھپٹی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہوجاتا ہے۔ رب نواز یہ الزام رجب علی پر لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے اقرار جرم کرلیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو بچالیتی ہے' تاہم رجب کے سر پر احسان ڈال دیتی ہے۔

انیبا دانیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کردیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت

قسط نمبر ۲۶

ماوی نے بری طرح ہڑبڑا کر دیکھا اور کچھ بول بھی نہ سکی۔ وہ جلال تھا اور اس نیم تاریک ویران راہ داری میں اس کے اتنا قریب تھا کہ ماوی کو اس کی سانسوں کا لمس تک اپنے چہرے پر محسوس ہوتا تھا۔

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ جلال اس کے انتہائی قریب تھا کہ ماوی ذرا سا ہلتی تو اس کے آویزے کے موتی تک جلال کے چہرے کو چھو جاتے۔ ماوی نے ہوش میں آتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا' لیکن جلال کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ماوی کا دل اور لرزا۔

"جلال!... مم... میں۔"

جلال نے سرعت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

"تنوی اسی طرف آرہی ہے۔ کوئی آواز مت نکالنا۔ ورنہ اسے پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں یہاں ہیں۔" جلال نے آواز دبا کر کہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں مستقل ماوی کے چہرے پر جمی تھیں۔

ماوی کی آنکھیں گویا پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کسی طرح جلال سے آزاد ہو کر بھاگ جائے' لیکن یہ بات سن کر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور جلال... اس کی سماعت گو کہ راہ داری کے دہانے سے آتی اٹھتے گرتے قدموں کی آوازوں کی طرف لگی تھی۔ لیکن آنکھیں... آنکھیں ماوی کے ایک ایک نقش کو جذب کرلینا چاہتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں' اسی پل ماوی تڑپ کر اس سے دور ہوگئی۔

"تت... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہی میں تم سے پوچھنے والا تھا کہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"مم... میں۔" وہ پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس بات پر اور گڑبڑا گئی۔

"میں اکچوئلی غلطی سے اس طرف آگئی تھی۔ مجھے ابھی حویلی کے راستوں کا ٹھیک سے علم نہیں ہے۔ تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جاؤں۔" اسے بروقت موثر بہانہ سوجھ گیا تھا۔

"جب تمہیں راستوں کا نہیں پتا تو اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم کسی کو ساتھ لے کر آتیں۔" جلال نے کہا۔

"کم آن جلال! میں کوئی بچی تھوڑا ہی ہوں کہ ہر وقت کسی نہ کسی کی انگلی تھام کر پھروں۔" اس نے بات ہنسی میں ٹالنا چاہی۔ "دیکھو' میں نے اس وقت بھی تو درست راستہ ڈھونڈ ہی لیا نا۔"

"ہاں۔ تمہاری بات بھی ٹھیک ہے... ویسے بھی حویلی سے جان پہچان ابھی سے نہیں بڑھاؤ گی تو بعد میں دقت ہوگی۔ کیونکہ آنا تو تم نے یہیں ہے۔"

جلال نے مسکراتے ہوئے لطیف سے انداز میں کہا تھا۔ ماوی نے مسکرانے کی کوشش کی' لیکن ایک ہونق سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گئی۔

یہ نہیں کہ وہ جلال کی بات سمجھ نہ پائی تھی۔ بات سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے ہونق بن گئی تھی۔

"میں... میں جاتی ہوں... کوئی آنہ جائے۔"

وہ ان سنی کرتے ہوئے ایک طرف سے نکل کر جانے لگی' لیکن ایک جھٹکے سے اسے رکنا پڑا' کیونکہ اس کا ہاتھ جلال کے ہاتھ میں تھا۔

جلال کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ بڑی چاہ سے ماوی کو دیکھ رہا تھا۔

اپنا اعتماد بحال رکھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود ماوی ہراساں نظر آئی۔

"کوئی کام ہے جلال؟"

جلال سے اس کی گھبراہٹ مخفی نہ رہی تھی' لیکن وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے جانے دو جلال! کوئی آجائے گا۔" ماوی نے بڑی دقت سے کہا تھا۔

"کیا میں نے تمہیں کبھی بتایا ہے کہ تم کتنی خوب صورت ہو؟" جلال نے غیر محسوس انداز میں چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے' میں نے تو کبھی یہ بھی نہیں بتایا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

ایک بار پھر وہ اس کے اتنا قریب آگیا تھا کہ فرار کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ ماوی نے اپنے دل کو بے ہنگم انداز میں دھڑکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے صدق دل سے دعا کی کہ تنوی یا کوئی اور اس طرف آہی جائے اور یقیناً" یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اسی پل کہیں کھٹکا سا ہوا تھا۔ جلال جو ایک ٹرانس کی کیفیت میں مبتلا اسے دیکھ رہا تھا' سٹپٹا کر اس سے دور ہوگیا۔

ایک مشکل صورت حال سے بچ نکلنے کا یہ واحد موقع ہاتھ لگا تھا سو ماوی فی الفور وہاں سے کھسک لی۔ جب تک جلال کو اسے روکنے کا خیال آیا' وہ بہت دور جاچکی تھی۔ جلال نے دیکھا۔ راہ داری کے آخری سرے پر گھبراہٹ کے مارے ماوی کے قدم الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ اس کے لبوں پر جان دار مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا تھا نا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ولید ایسا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا جو ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔"

ثروت سے انیبا کی بات اسی روز شام کو دوبارہ ہوئی تھی اور وہ خاصی مطمئن لگ رہی تھیں۔ انیبا تعجب میں مبتلا ہوئی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ ولید سے تصدیق کریں۔ ممی! وہ غلط ایکٹیویٹیز میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے خود سارا اسٹف اس کے کمرے میں دیکھا ہے۔"

"میری اس سے بات ہوگئی ہے انو! اس نے ایڈمٹ کیا ہے کہ وہ اسموکنگ کرتا رہا ہے۔ باقی سب چیزوں کے لیے وہ کہہ رہا تھا' اس کے دوستوں کی ہیں جو وہ جلد ہی انہیں واپس کردے گا۔ کہہ رہا تھا' انو بلاوجہ پریشان ہوگئی۔ اگر پہلے مجھ سے بات کرلیتی تو آپ سے بات کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"ممی! وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" انیبا نے رونکھی ہو کر کہا۔ "میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے میری بات نہیں سنی۔ الٹا مجھے دھمکانے لگا۔"

"انو! پلیز بیٹا! میرے لیے پہلے ہی بہت پرابلمز ہیں۔ انہیں بڑھاؤ مت۔" ثروت نے عاجزی سے کہا۔ "اگر تمہارا ولید سے کوئی جھگڑا ہوا ہے تو اسے آپس میں سلجھالو۔ بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ممی...!" اس نے کہنا چاہا۔

"ولید نے مجھے بتایا ہے کہ چند روز پہلے تمہارا اور اس کا کوئی جھگڑا ہوا تھا، جس کا بدلہ لینے کے لیے تم اس طرح کی باتیں کررہی ہو۔"

"اور آپ نے اس کی بات پر یقین کرلیا؟" اس نے صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ میں تم دونوں کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

ثروت نے بے چارگی سے کہا اور اسے بھائیوں کے ساتھ سلوک سے رہنے کی تاکید کر کے فون بند کردیا انیبا بہت دیر تک بے جان فون کو ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی تھی اور پھر تھک ہار کر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے خود کو حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔



دوسری جانب معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے شبیہہ نے تنوی کو پچھلی طرف جانے سے روکا تھا۔ وہ اسے جلال کا تعاقب کرتے تو دیکھ ہی چکا تھا اور اسے یقین تھا اگر تنوی جلال اور ماوی کو اکٹھے دیکھ لیتی تو اس نے حویلی میں شور مچانے سے ہرگز نہ چوکنا تھا۔ عورتوں کا ہاتھ یوں بھی عقل کی طرف سے تنگ ہوتا ہے اور تنوی کے پاس تو عقل نام کی کوئی چیز سرے سے تھی ہی نہیں۔

"کہاں بھاگتی پھررہی ہو تم؟"

تنوی کے تیز تیز اٹھتے، بڑھتے قدم شبیہہ کی آواز پر ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"وہ میں... میں تو..." حسب عادت وہ گڑبڑا گئی۔

"اب اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ تسنیم سے کچھ کام کہا تھا' میں نے اسے پچھلی طرف جاتے دیکھا تھا... اسی لیے اسے ڈھونڈنے جارہی تھی۔"

"تم میں عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟" شبیہہ نے حسب توقع ڈپٹ کر کہا۔

"دن کے وقت بھی بی جان تم لڑکیوں کو پچھلی طرف جانے نہیں دیتیں اور تم منہ اٹھا کر رات کو جارہی ہو۔"

تنوی کا سر جھک گیا۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ جب بھی اس کا سامنا شبیہہ سے ہوگا۔ اسے جھاڑ ہی پڑے گی۔

"مجھے تسنیم سے کچھ کام تھا۔" وہ منمنائی۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ جلال کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی ہے اور بے دھیانی میں بی جان کی تاکید بھی نظر انداز کردی ہے۔ اس صورت میں اور بھی باتیں سننا پڑتیں اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

"ایسا کیا ضروری کام تھا جو دن کی روشنی میں اس سے نہیں کہا جاسکتا۔" شبیہہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"وہ تھا نا کچھ کام۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔" وہ ذرا سا چڑ گئی۔ "اچھی مصیبت ہے بھئی۔ ہر وقت کی انکوائری جان ہی نہیں چھوڑتی۔"

شبیہہ یک دم چپ ہوگیا۔ اسے تنوی کا انداز دلچسپ لگا تھا... غصہ تو خیر بناوٹی ہی تھا کہ وہ خائف ہو کر وہاں سے کھسک جائے۔ اس نے غور سے اس کے تنے ہوئے خفا خفا سے چہرے کو دیکھا۔ پھر بے سبب ہنس دیا۔ تنوی ہمیشہ اسے چھوٹی سی بچی لگتی تھی۔ پتا نہیں بی جان نے کیا سوچ کر ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑ دیا تھا۔ ورنہ شبیہہ تو کبھی چاہ کر بھی اپنے اور اس کے مابین اس رشتے کی لطافت کو محسوس بھی نہیں کرسکا تھا۔

تنوی نے اس کے ہنسنے پر تعجب سے اسے دیکھا۔

"اچھا نکلو اب یہاں سے۔ اول تو مجھے یقین ہے اتنی رات گئے تسنیم نے اس طرف جانے کی حماقت نہیں کی ہوگی، لیکن میں دیکھتا ہوں اگر وہ پچھلی طرف ہوئی تو کہہ دوں گا' تمہارا بہت ضروری کام سن لے۔ دوسری بات یہ کہ اگلی بار تم مجھے اس طرف نظر نہ آؤ۔"

شبیہہ نے اسے ٹالتے ہوئے کہا اور تنوی جانتی تھی' وہ اسے ٹال ہی رہا ہے تب ہی اس کی خفگی میں اضافہ ہوا۔

"میں نے تسنیم کو اس طرف جاتے ہوئے خود دیکھا ہے۔" اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"بات مانا کرو تنوی! وہ اس طرف نہیں گئی۔"

"میں نے دیکھا ہے شبیہہ بھائی! آپ مانتے کیوں نہیں ہیں میری بات۔" وہ رو دینے کو تھی۔ "مجھے اس سے ذرا سا کام ہے' بات کرلینے دیں۔" شبیہہ کھٹک سا گیا۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اس راستے کی طرف دیکھا جو بل کھاتا ہوا حویلی کے پیچھے حصے کی طرف لے جاتا تھا اور جہاں حویلی کے کئی راز دفن تھے۔

"تمہیں یقین ہے' تم نے تسنیم کو اسی طرف جاتے دیکھا ہے؟"

تنوی نے زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ' میں تسنیم کو ابھی تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔"

"لیکن..." تنوی کی امیدوں پہ پانی پھر رہا تھا۔ اسے سخت مایوسی ہونے لگی جو اس کے چہرے سے بھی جھلکتی تھی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں... جاؤ یہاں سے۔" وہ اتنی زور سے بولا تھا کہ تنوی بری طرح خائف ہو کر وہاں سے بھاگی۔

شبیہہ نے حویلی کے پچھواڑے کی طرف رخ کیا تھا۔



ماوی' جیسے تیسے اپنے کمرے میں پہنچی' پھر فٹافٹ دروازہ بند کیا اور دروازے سے پشت لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی پیشانی پر اب تک نمی چمک رہی تھی۔ یقیناً" اپنی پوری زندگی میں وہ اس سے زیادہ کبھی نہیں گھبرائی ہوگی۔

رہ' رہ کر اسے جلال کے انداز یاد آرہے تھے اور اس کی سراسیمگی میں اضافہ کررہے تھے۔

"یہ آپ نے مجھے کہاں پھنسا دیا ممی!" اس نے روہانسی ہو کر بلند آواز میں شکوہ کیا تھا۔

"نکاح کرواتے ہوئے کم سے کم آپ کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ جلال لاکھ بے ضرر دکھائی دیتا ہو' لیکن اس کے بھی کچھ فطری تقاضے ہوں گے جنہیں پورا کروانے کی آرزو وہ اپنی بیوی سے کرے گا... ممی نے نہیں سوچا تو مجھے سوچنا چاہیے تھا... یا اللہ! مجھے ہی خیال کیوں نہیں آیا۔"

وہ سخت پریشانی کا شکار تھی۔ یکایک اس کی پریشانی جھنجلاہٹ اور غصے میں بدلنے لگی۔ اس نے کھڑے کھڑے

اپنے پیر ہائی ہیلز سے آزاد کروائے۔ الماری سے اپنا سیل فون نکالا اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے سیل پر کئی مسڈ کالز اور میسجز آئے ہوئے تھے۔ جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ثمینہ کا نمبر ملانا شروع کیا۔ لیکن کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی ثمینہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ ماوی نے چڑ کر سیل ایک طرف پھینک دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

صورت حال تھی پریشان کن۔ کہتی تو کس سے 'مدد مانگنے جاتی تو کس کے پاس۔

اسی پل اس کا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا۔ ماوی نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ یہ سوچ کر کہ ثمینہ نے ہی کال بیک کی ہو گی۔ لیکن کوئی غیر محفوظ شدہ نمبر تھا۔ پہلا دھیان فیضان کی طرف ہی گیا تھا۔ کیونکہ یہ نمبر تو صرف ثمینہ کے پاس تھا یا جلال کے پاس۔ اگر کسی تیسرے نمبر سے کال آ رہی تھی تو وہ فیضان ہی ہو سکتے تھے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ اب کیا کیا جائے آخر؟

پھر ایک نتیجے پر پہنچی اور کال ریسیو کیے بغیر فون واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اس مسئلے کا صرف یہی حل ہے کہ جلد از جلد ثبوت حاصل کروں اور حویلی سے نکلنے کی کروں۔ جلال نے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو میں تو اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔"

انتہائی پریشان کن حالت میں اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا جو یقیناً" عام حالات میں وہ کبھی بھی نہ کرتی۔ لیکن بہرحال تھی تو یہ بھی مایوس کن بات 'سو وہ اور بھی دل برداشتہ ہو کر بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی اور اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی اور حل تلاش کرنے لگی۔

✵ ✵ ✵

یہ محض اتفاق تھا کہ شبیہہ کا پہلا ٹکراؤ جلال سے ہوا تھا۔

"ہو گئی ملاقات؟ مل گیا سکون؟" اس نے حسب عادت طنز سے آغاز کیا تھا۔

"کہاں...؟" جلال نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے منہ لٹکا کر کہا۔ "ماوی تو میری شکل دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ میں تو ڈھنگ سے اسے دیکھ بھی نہیں پایا۔"

"شرم تو نہیں آ رہی ہو گی ایسی بات کرتے؟" شبیہہ دانت پیس کر بولا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ اپنی منکوحہ سے ملنے آیا تھا' کسی غیر سے نہیں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر کہا تھا۔

"منکوحہ سے کسی مہذب وقت میں اور مہذب جگہ پر بھی ملا جا سکتا تھا۔ ابھی تمہارے پیچھے پیچھے تنوی پہنچ جاتی تو ملاقاتوں کا سارا شوق پورا ہو جانا تھا۔"

"مجھے پتا تھا' وہ اسی طرف آ رہی ہے' اس لیے میں نے ماوی کو کچھ دیر روک لیا تھا۔"

"اگر میں اسے نہ روکتا تو آپ کی تو اچھی ورگت بن چکی ہوتی اب تک۔"

"یار! آ ہی جانے دیتے تنوی کو۔ کم سے کم وہ سب کو بتا تو دیتی۔ میں تو خود تنگ آ چکا ہوں اس بات کو چھپاتے چھپاتے۔ ایسا لگتا ہے' نکاح نہیں کوئی غلطی کر بیٹھا ہوں۔"

"اچھے بھلے سینس ایبل آدمی تھے تم۔ اس لڑکی کی محبت نے تمہیں کیسا چغد بنا دیا ہے کہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں رہے۔"

"چلو کم سے کم تم نے یہ تو مانا کہ میں سینس ایبل تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو تم یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھے۔" جلال نے پھر اس کی بات ہنسی میں اڑائی تھی۔ شبیہہ کو مزید پتنگے لگ گئے۔

"تیرا کچھ نہیں ہو سکتا جلال! اس لڑکی کے ہاتھوں منہ کی کھائے گا۔ تب تجھے عقل آئے گی۔"

"اور ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں جانتا ہوں۔"

عین اس وقت جب شبیہہ دوسری سمت میں جا رہا تھا۔ اس نے جلال کی متبسم آواز اور پریقین لہجہ سنا تھا۔ شبیہہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ ہاں لیکن اس نے دل ہی دل میں غیر ارادی طور پر جلال کی بات کے سچ ہونے کی دعا ضرور کی تھی۔ جیسا بھی تھا لیکن جلال کو وہ تکلیف میں بہرحال دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

تسنیم اسے سامنے پا کر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ وہ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ تسنیم اگلے حصے میں جانے کے لیے متبادل راستہ بھی اختیار نہیں کر سکتی تھی۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" شبیہہ نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

"وہ جی میں... کھانا پہنچانے آئی تھی۔" اس نے فوراً" بات بنائی۔

"ہوں..." شبیہہ نے بغور اسے دیکھا۔ گویا جھوٹ سچ کا اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔

"کھانا پہنچانے کے لیے ماوی بی بی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جی؟" وہ صاف گڑبڑا گئی۔ "نہیں جی... وہ تو..."

"یہ ٹکڑوں میں باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے۔" شبیہہ نے ڈپٹ کر کہا تھا۔ تب ہی ایک اور ملازمہ تسنیم کو تلاش کرتی اس طرف آ نکلی۔

"تمہیں بڑی چوہدرائن جی بلا رہی ہیں۔"

تسنیم نے دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے شبیہہ کو دیکھا۔ شبیہہ کو جھنجلاہٹ تو ہوئی' لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ انکوائری کو کسی اور وقت پر ٹال کر اسے جانے دیا جائے۔ سو اس نے یہی کیا۔

تسنیم خیر مناتی رخصت ہوئی' لیکن شبیہہ کے ذہن میں سوچ کی پرچھائیاں چھوڑ گئی تھی۔

✵ ✵ ✵

ماوی کی پچھلی رات بہت بے چینی میں کٹی تھی' کہیں فجر کے وقت جا کر آنکھ لگی تو بڑی گہری نیند آئی۔ صبح اسے جگانے کے لیے تنوی کو آنا پڑا تھا۔

"میں نے سوچا پوچھ لوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ ورنہ آپ اتنی دیر سوتی تو نہیں ہیں۔" تنوی نے جھینپتے ہوئے انداز میں کہا تھا' کیونکہ ماوی کی آنکھیں ادھوری نیند کی غمازی کر رہی تھیں۔

"ہاں! طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس رات تھکاوٹ بہت ہو گئی تھی۔ شاید اسی لیے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔" آنکھیں ملتے ہوئے اس نے بات سنبھالی تھی۔

"اچھا آپ فریش ہو کر آ جائیں' ہم لوگوں نے آپ کے انتظار میں اب تک ناشتا بھی نہیں کیا۔" تنوی نے جرح کا ارادہ کسی اور وقت پر ٹال کر کہا۔

"ٹھیک ہے... تم چلو... میں بس دس منٹ میں آ رہی ہوں۔"

اس نے مسکرا کر کہا تو تنوی جواباً" مسکراہٹ اچھال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماوی کچھ دیر ایسے ہی سستی سے لیٹی رہی۔ رات کے تمام واقعات اپنے تمام تر سیاق و سباق کے ساتھ یاد آنے لگے تھے۔ تب اٹھ بیٹھی۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے یا پریشان ہونے سے تو کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ سو بہتر تھا کہ اٹھ کر ذرا حویلی والوں کی خیر خبر

معلوم کرلی جاتی۔
چند منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے چہرہ تھپتھپاتی باہر نکلی تو اس کا سیل فون پورے حلق سے چیخ رہا تھا۔
"ہیلو......"
"شکر ہے، تمہیں فون ریسیو کرنے کی فرصت مل گئی۔" اس کی آواز سنتے ہی فیضان نے کہا تھا۔
"کیسے ہیں فیضان ماما؟" اس نے فیضان کے اندازو سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھا۔
"یہ کیا حماقت کی ہے تم نے؟" فیضان نے بھی اس کا سوال نظرانداز کیا۔
"ممی آپ کو ڈیٹیلز بتا چکی ہیں، اب مجھ سے کیا سننا چاہ رہے ہیں۔" اس نے تولیہ بیڈ پر اچھالتے ہوئے کہا۔
"مجھے صرف اتنا بتادو، اس وقت تمہاری عقل کہاں تھی جب تم آپا کی بات مان کر حویلی جارہی تھیں؟"
ماوی نے ایک گہری سانس بھری۔ ذہن میں ان جملوں کو، جو یہ پتا چلتے ہی کہ فیضان کو اس کے حویلی جانے کی خبر مل چکی ہے۔ اس نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بطور اسکرپٹ تیار کیے تھے، ترتیب دیا اور معتدل لہجے میں بولی۔
"آپ کے تمام اعتراضات درست۔ تمام خدشات بھی بجا۔ لیکن حقیقت یہی ہے ماما! کہ ممی نے مجھے اتنا ایموشنل بلیک میل کردیا تھا کہ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔"
"جانے دو ماوی! تم کو آج تک کوئی ایموشنل بلیک میل کرسکا ہے بھلا؟" فیضان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "یہ بات تم اس سے کہنا جو تمہیں جانتا نہ ہو...... اس سارے میں تمہاری سو فیصد مرضی شامل تھی۔ تب ہی تم نے حویلی جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ثمینہ آپا نے رجب بھائی سے متعلقہ حقائق کس انداز میں تمہیں سنائے ہوں گے، لیکن تمہیں عقل سے کام لینا چاہیے تھا ماوی! شیر کی کچھار میں جاکر بیٹھ جانا اور یہ توقع کرنا کہ شیر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ تمہیں تو میں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔"
ماوی نے ایک نظر گھور کر سیل فون کو دیکھا، جیسے وہاں فیضان کی تصویر آرہی ہو، لیکن ساتھ ہی اس نے دل میں اعتراف بھی کیا تھا کہ فیضان بہرحال اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے کوئی بلیک میل نہیں کرسکتا۔ لیکن ممی کی بات دوسری ہے۔ وہ "کوئی" نہیں ہیں، میری ماں ہیں۔ پھر بات بھی میرے بابا کی تھی، سو مجھے ماننا ہی پڑا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں ممی کی بات ٹال بھی دیتی۔ بشرطیکہ انہوں نے میرا انکار سن کر خودکشی کی کوشش نہ کی ہوتی۔"
"کیا......؟" فیضان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ "ثمینہ آپا نے خودکشی کی کوشش کی اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟"
"میں نے تو آپ کو باقی باتیں بھی پہلے نہیں بتائی تھیں، پھر اس اعتراض کا کیا جواز ہے۔" اس نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔
"پھر بھی ماوی! تمہیں ہم میں سے کسی کو تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں بتایا تو فیاض بھائی کو بتاتیں اور ان کو بھی نہیں تو شہروز سے ہی ڈسکس کیا ہوتا۔ پھر آپا کو ہینڈل کرنا ہماری ذمہ داری ہوتی۔"
"میں نے تو کوشش کی تھی ماما! لیکن اس وقت حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ ہر بات ممی کے حق میں اور میرے خلاف جاتی تھی۔"
"تم اپنی کمزوری کو اب حالات کے کھاتے میں مت ڈالو۔" فیضان نے سلگ کر کہا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں ماما! میں نے فیاض ماما سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن انہوں نے اس وقت یہ کہہ کر مجھے خاموش کروادیا کہ ممی نے زندگی میں بہت مشکلات دیکھی ہیں اور مجھے ان کی ہر بات ماننا چاہیے، جبکہ شہروز......" روانی سے بولتے ہوئے وہ یک لخت خاموش ہوگئی تھی۔
"ہاں اب کہہ دو کہ شہروز نے بھی ایسی ہی کوئی بات کہہ کر تمہیں خاموش کروادیا تھا۔" فیضان نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر کہا تھا۔
ماوی بری طرح چڑ گئی۔
"جی نہیں۔ اس نے کچھ کہہ کر مجھے خاموش نہیں کروایا تھا۔ بس جب میں نے اسے کال کی تو فون اس کی گرل فرینڈ نے ریسیو کیا تھا اور شہروز نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ وہ کچھ روز پہلے شادی کرچکا ہے۔ اب مجھے آپ صرف اتنا بتادیں کہ اس کے بعد میرے پاس کیا جواز رہ جاتا تھا کہ میں اپنا اتنا پرسنل معاملہ اس سے ڈسکس کرتی۔" وہ ہر لفظ چبا چبا کر ادا کررہی تھی۔
فیضان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کہتے بھی کیا؟ انکشاف پہ انکشاف کے اس سلسلے نے جیسے انہیں گم صم ہی کردیا تھا۔
"شہروز نے تم سے خود کہا کہ وہ شادی کرچکا ہے؟" انہوں نے جیسے دل کی تسلی کے لیے پوچھا تھا۔
"نہیں...... میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" ماوی بری طرح تاؤ کھا کر بولی۔ "اور پتا نہیں میں آپ کو اتنی وضاحتیں کیوں دے رہی ہوں، جبکہ آپ کو میری کسی بات کا یقین ہی نہیں آرہا۔"
"یہ بات نہیں ہے کہ مجھے یقین نہیں آرہا۔" فیضان نے کہا۔ "لیکن تمہاری ساری باتیں اتنی ناقابل یقین ہیں کہ میں چاہ کر بھی یقین نہیں کرپارہا۔"
"ٹھیک ہے، پھر میں فون بند کرتی ہوں، جب آپ کو یقین آجائے تب بات کرلیں گے، ویسے بھی مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور سب لوگ ناشتے پر میرا انتظار کررہے ہیں۔"
"میرا یہاں پریشانی سے برا حال ہے اور تمہیں اپنے ناشتے کی پڑی ہوئی ہے۔"
"تو اور کیا کروں؟ بھلا اس پریشانی کا کوئی فائدہ ہے؟" وہ جلد ہی اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی تھی۔
"تم صرف یہ کرو کہ اپنا سامان سمیٹو اور فورا" سے پیشتر لاہور پہنچ جاؤ۔" فیضان نے حکمیہ انداز میں کہا تھا۔
"ایم سوری ماما! آپ کی بات اب نہیں مان سکتی۔ شیر کی کچھار میں آہی گئی ہوں تو اس کے منہ کا نوالہ چھینے بغیر واپس نہیں آؤں گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"ڈائیلاگز ذرا کم بولو تو اچھا ہوگا۔" فیضان نے کہا۔ ماوی ہنس دی۔
"تو آپ کا کیا خیال تھا، ڈائیلاگز صرف آپ بول سکتے ہیں؟" اس کا انداز نیم سنجیدہ سا تھا۔ "مطلب صرف یہ تھا کہ اب یہاں آہی گئی ہوں تو ثبوت لیے بغیر واپس نہیں آؤں گی۔"
"ٹھیک ہے، تم نہیں آرہیں تو میں وہاں آتا ہوں۔" فیضان نے حتمی انداز میں کہا۔
"اور اس سے کیا ہوگا؟" ماوی نے پوچھا۔ "کیا یہ لوگ ہمیں ثبوت جلد فراہم کردیں گے؟ نہیں کبھی نہیں، الٹا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ آپ میرے لیے مشکلات کھڑی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے؟"
"ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں وہاں اکیلے رہنے نہیں دے سکتا۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچادیا تو......"
"میں جب یہاں آرہی تھی تو میں نے بھی ممی سے یہی کہا تھا۔ آپ کو جو خدشات اب لاحق ہیں، مجھے اس وقت بھی تھے۔ لیکن ہوا کیا؟ یہی کہ مجھے یہاں آنا ہی پڑا۔ اپنی مرضی سے یا ممی کے فورس کرنے پہ...... یا شاید یہ بات میری قسمت میں لکھی ہوئی تھی...... جو بھی ہو، مجھے آنا تو پڑا اور اب آہی گئی ہوں تو ہر بات سے بے پروا ہو کر وہ

کام کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے یہاں آئی ہوں۔ مجھے کوشش کر لینے دیں ماما! ہو سکتا ہے میں کامیاب رہوں۔"
"محض مفروضوں کی بنیاد پر وہاں بیٹھے رہنا اور بھی بڑی حماقت ہو گی مادی!" فیضان نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
"نہیں! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' میرا خیال ہے' مجھے کچھ ہی اور دن یہاں رکنا پڑے گا۔ جلد ہی مجھے ثبوت مل جائیں گے۔"
"میں آرہا ہوں اور تمہاری کوئی بات بھی نہیں سنوں گا۔" فیضان نے اس کی ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔
"پلیز ماما! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ..." وہ جھنجلا کر بولی۔
"زیادہ سے زیادہ بھی میں ایک یا دو دن میں حویلی میں ہوں گا۔ تم اپنا سامان پیک کر کے رکھو۔"
فیضان نے اس کی اگلی بات سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ مادی نے بے زاری سے سیل فون بیڈ پر اچھال دیا۔ رات بھر میں وہ اسی نتیجہ پر پہنچی تھی کہ اسے جلد از جلد حویلی سے نکلنا چاہیے۔ فیضان سے بات کر کے اس کے ارادے میں پختگی آئی تھی' کیونکہ وہ جانتی تھی' فیضان نے اگر کہا ہے تو وہ پہنچ ہی جائیں گے اور اس سے پہلے کہ صورت حال بگڑتی یا معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا اسے ثبوتوں تک رسائی حاصل کرنا تھی۔



فیضان نے ابھی فون بند کیا ہی تھا کہ ان کے آفیشل نمبر پر کال آنے لگی۔
"السلام علیکم توقیر بھائی! بڑے دن بعد مجھے یاد کیا۔" انہوں نے حتی المقدور اپنا لہجہ فریش رکھا تھا۔
"وعلیکم السلام... یار! میں نے تو پھر بھی تمہیں یاد کیا' تمہیں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔" انہوں نے جواباً "فوراً" جتا دیا تو فیضان قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔
"کیا کروں توقیر بھائی! اس کاروبار نے تو سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا' اتنی مصروفیت ہے کہ بس..."
"اچھا سنو... دانیال کے ساتھ آج کل تمہارے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟" اچانک توقیر صاحب نے پوچھا۔
فیضان الجھے۔ سوال کچھ عجیب سا تھا۔
"کیا مطلب توقیر بھائی! یہ کیسا سوال کیا ہے' میں کچھ سمجھا نہیں۔"
"مطلب یہ کہ تمہارا کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا' کاروباری معاملات میں سو طرح کے اتار چڑھاؤ آجاتے ہیں' اسی حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔"
"نہیں۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" فیضان نے سابقہ الجھن کے ساتھ جواب دیا تھا۔ "بلکہ میرا خیال ہے بطور بزنس پارٹنرز ہمارے تعلقات تو مثالی ہیں۔"
"اگر ایسی بات ہے تو دانیال پارٹنر شپ ختم کرنے کی بات کیوں کر رہا ہے؟" توقیر صاحب نے مزید الجھ کر جیسے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا' بلکہ درحقیقت فیضان کے سر پر بم دے مارا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
"ہاں فیضان! میں نے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے' ابھی تھوڑی دیر پہلے میری دانیال سے بات ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارے ساتھ مزید کام نہیں کرنا چاہتا' اس لیے پارٹنر شپ کو ختم سمجھا جائے۔ میں تمہیں انفارم کر دوں کہ جلد از جلد اس کی انیکسی خالی کر دو اور یہ کہ اس کا وکیل ایک دو روز میں تمہیں نوٹس بھی بھجوا دے

گا۔ میں تو خود بہت حیران ہوا اس کی باتیں سن کر۔ اسی لیے تمہیں فوراً" فون کیا کہ اصل معاملے کا پتا لگاؤں۔ کاروبار کون سا معمولی بات ہے کہ جب دل کیا شروع کرلیا' جب دل چاہا ختم کردیا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ مانتا ہوں' میرا سرمایہ دانیال بھائی سے کم ہے' لیکن میری تو ساری جمع پونجی اس کاروبار میں لگ چکی ہے۔ میں کیسے اچانک پارٹنر شپ ختم کرنے کا متحمل ہوسکتا ہوں۔" ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کہیں۔ "میں نہیں مانتا کہ دانیال بھائی نے ایسا کچھ کہا ہوگا۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے غلط فہمی ہرگز نہیں ہوئی۔" توقیر صاحب نے تحمل سے کہا تھا۔ "دانیال نے میرے سامنے اپنا ارادہ ہی ظاہر کیا ہے' ہاں لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ تم کو انیکسی خالی کرنے کا کہہ دوں۔"

"میں کل چھ بجے تک ان کے پاس بیٹھا ایک پروجیکٹ ڈسکس کرتا رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسا ارادہ تھا بھی تو انہوں نے مجھ سے اس وقت کیوں نہیں کہا؟"

"ہاں.... یہ ایک اور حیرانی کی بات ہے۔"

"ضرور کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہورہی ہے توقیر بھائی!"

"میں دانیال سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔"

"نہیں ! آپ فون پر بات نہ کریں۔ میں آپ کو پک کرلیتا ہوں' ہم دونوں دانیال بھائی کے آفس جاکر بات کرتے ہیں۔ اچھا ہے کہ کوئی کنفیوژن نہ رہے۔" فیضان نے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

کچھ دیر بعد وہ دونوں دانیال حسن کے آفس پہنچ گئے تھے اور دانیال حسن نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں سے ملنے سے انکار کردیا تھا۔

"واٹ دا ہیل.... آخر اس طرح کے رویے سے دانیال بھائی ثابت کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔" فیضان یک دم طیش میں آگئے تھے۔

"مانتا ہوں میرے شیئرز پچیس فیصد ہیں' لیکن ان کے پاس بھی ایسا کوئی اختیار نہیں ہے کہ پارٹنر شپ کو اس طرح اچانک ختم کریں۔" وہ پہلے ہی ماوی کی طرف سے پریشانی کا شکار تھے۔ اس افتاد پر بالکل ہی آؤٹ ہونے لگے۔

توقیر صاحب نے قدرے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ دانیال نے اگر کسی وجہ سے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے تو ان کا خیال تھا۔ فیضان ضرور تحمل کا ثبوت دیں گے۔

"تم اپنا ٹمپر لوز مت کرو۔ میں دانیال سے بات کرتا ہوں۔" توقیر صاحب نے جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ کچھ فاصلے پر جاکر انہوں نے بات کی۔ تب ہی دانیال حسن کا پیون ان کا بلاوا لیے چلا آیا۔

"تم ذرا یہاں انتظار کرو فیضان! میں دانیال سے بات کرتا ہوں۔"

فیضان نے جزبز ہوکر انہیں دیکھا۔ انتہائی سبکی محسوس ہورہی تھی' لیکن بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سو ناچار اثبات میں سر ہلادیا۔

☼ ☼ ☼

ماوی حویلی کے مختلف حصوں میں تسنیم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دو تین ملازمین سے بھی سرسری انداز میں پوچھ لیا مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہوچکی تھی کہ ملنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ پھر عین اس وقت جب ماوی مایوس ہوچکی تھی تو تسنیم پتا نہیں کہاں سے اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"اچھا ہوا بی بی! آپ مجھے یہاں مل گئیں۔" حسب معمول وہ جلدی میں تھی۔

"تم کہاں غائب ہوگئی تھیں تسنیم! میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔" ماوی نے کہا۔

"اس بات کو چھوڑدیں بی بی! کہ میں کہاں تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ چھوٹے چوہدری کو مجھ پر شک ہوگیا ہے کہ میں آپ کی مدد کررہی ہوں۔" اس کا محتاط لہجہ سراسیمگی کا غماز تھا۔

"کیا.... لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟" ماوی نے پریشانی سے پوچھا۔

"کل آپ کے جانے کے بعد' جب میں تالا لگا رہی تھی تو وہ پچھلی طرف آئے تھے اور آپ کا بھی پوچھ رہے تھے وہ تو شکر ہے کہ اسی وقت کوثر مجھے بلانے آگئی کہ بڑی چودھرائن نے بلوایا ہے' اسی لیے بچت ہوگئی ورنہ میں تو بری پھنستی۔" تسنیم نے بتایا۔

"بلکہ پھنستی کیا۔ مجھے تو لگتا ہے میں پھنس چکی ہوں۔ کسی بھی وقت چوہدری جی پوچھ گچھ کے لیے بلوا سکتے ہیں۔"

"پھر اب کیا کیا جاسکتا ہے؟" ماوی نے کسی قدر متفکر ہوکر پوچھا تھا۔

"دوبارہ تو شاید ہمیں بات کرنے کا بھی موقع نہ مل سکے' اس لیے میں آپ کے لیے یہ لے آئی ہوں۔" تسنیم نے دوپٹے کے پلو سے بندھا ایک بوسیدہ سا لفافہ اس کی طرف بڑھادیا۔

"یہ کیا ہے؟" ماوی نے پوچھا۔

"میں پڑھی لکھی نہیں ہوں کہ صحیح بتاسکوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ خط ہی ہوگا۔ اور مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ یہ کس نے کس کو لکھا ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ اس خط سے آپ کو اپنے بابا کے قاتل تک پہنچنے میں ضرور مدد ملے گی کیونکہ جب آپ کی امی اس حویلی سے جارہی تھیں۔ ان دنوں میرے بابا بیمار تھے اور انہوں نے مجھے یہ لفافہ دے کر کہا تھا کہ آپ کی امی کو دے دوں۔ میں نے ان تک پہنچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انہیں جلدی میں حویلی سے جانا پڑا اور وہ خط نہ لے جاسکیں تب میرے بابا کو بہت افسوس ہوا تھا اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ میں یہ لفافہ سنبھال کے رکھوں اور اگر کبھی رجب چاچا سے وابستہ کسی انسان سے ملاقات ہوسکے تو اسے دے دوں۔ جب تک بابا کی بولنے کی صلاحیت کام کرتی رہی۔ وہ مجھے یہی تاکید کرتے رہے تھے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ رات کو جب آپ پچھلی طرف آئی تھیں مجھے یہ اسی وقت آپ کو دے دینا چاہیے تھا۔ کم سے کم سر پر تلوار تو نہ لٹکتی رہتی۔"

"کون سی تلوار؟" وہ جو لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ حیرانی سے بولی۔

"یہی کہ آپ تک پہنچنے سے پہلے کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے تسنیم! تمہارا شکریہ کہ تم نے میری اتنی مدد کی۔ خدا کرے مجھے اسی خط سے کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تاکہ مزید کسی کی مدد نہ لینا پڑے۔" ماوی نے قدرے بیزاری سے کہا تھا۔

"آمین۔" تسنیم نے صدق دل سے کہا تھا پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ "بی بی! اگر آپ کو ثبوت مل گئے تو کیا آپ فوراً" واپس چلی جائیں گی؟"

"ہاں.... بلکہ فوراً سے بھی پیشتر۔" ماوی نے سرعت سے کہا۔ اس کا انداز صاف ظاہر کرتا تھا کہ وہ خود بھی حد

سے زیادہ بیزار ہے۔

"میں چلتی ہوں بی بی! ایسا نہ ہو کوئی مجھے آپ سے بات کرتا دیکھ لے اور کھٹک جائے۔"

مادی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ دونوں مخالف سمت میں مڑ گئیں۔ مادی کی ساری توجہ اپنے ہاتھ میں دبے لفافے کی طرف تھی۔ کیسا اسرار پوشیدہ تھا اس لفافے میں کہ وہ چاہ کر بھی اس کی طرف سے دھیان ہٹا نہیں پا رہی تھی۔

وہ اپنی جھونک میں تھی کہ سامنے سے آتے جلال سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

مرد چاہے کتنا بھی سیدھا یا معصوم کیوں نہ ہو۔ اسے ایسے ٹکراؤ بہت پسند آتے ہیں خصوصاً تب جب صنف مخالف سے شرعی رشتہ بھی ہو تو ایسے ٹکراؤ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

"کہاں بھاگتی پھر رہی ہیں آپ محترمہ!" جلال نے خوشگواری سے پوچھا۔

"کہیں بھی تو نہیں۔" مادی نے نادانستہ لفافے والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"میں بس نمل کو ڈھونڈ رہی تھی اس نے کہا تھا وہ مجھے سب کی پرانی تصویریں دکھائے گی۔" اسے بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

"ہوں..." جلال نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "نمل وغیرہ سے اچھی دوستی ہو گئی ہے تمہاری۔"

"آ... ہاں۔" مادی نے ہونقوں کی طرح مسکرا کر کہا تھا اور کہتی بھی کیا۔

جلال بے سبب ہنس دیا پھر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں حویلی میں کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتانا۔"

"ہاں ضرور..." مادی بھی دانستہ مسکرا کر بولی تھی اور ان دونوں نے ہی بیک وقت محسوس کیا تھا کہ بظاہر ان دونوں کے درمیان کل ایک نازک سا لمحہ آکر گزر گیا تھا جس کی کوئی حیثیت بھی نہ تھی لیکن اس ایک لمحے کے نقوش ان دونوں کے ذہنوں میں نہ صرف باقی تھے بلکہ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ شرمندہ بھی تھے اسی شرمندگی کے مارے بے سبب گفتگو کیے جا رہے تھے۔

"وہ نمل آرہی ہے۔ میں چلتا ہوں۔" معاً جلال نے کہا تھا۔ مادی بری طرح کھٹک گئی تھی۔ اس پر جیسے کسی سوچ کا در وا ہوا تھا۔

"کل تم نے تنوی کے ڈر سے مجھے چھپا دیا۔ آج نمل کے ڈر سے بھاگ رہے ہو اس کے باوجود کہتے ہو کہ کوئی پریشانی ہو تو تمہیں بتاؤں۔ تم تو مجھے بیچ راستے میں چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہو جلال!" اس کا لہجہ اچھا خاصا طنزیہ تھا۔ جلال پر ڈھیروں پانی آگرا ہو جیسے۔ وہ تیزی سے چلا گیا تھا۔

مادی نے اسی طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔

"اور ممی اس سے امید لگائے بیٹھی ہیں کہ مجھے مسئلہ درپیش ہوا تو یہ میری مدد کرے گا... اونہہ... بزدل۔"

☆ ☆ ☆

"تمہارا ولید سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟" واپس جاتے ہوئے توقیر صاحب نے فیضان سے پوچھا تھا۔ دانیال حسن نے ان کے سمجھانے کے باوجود فیضان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے پتا ہے فیضان کو دیکھتے ہی میں اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر پاؤں گا اور آفس میں میں کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا چاہتا اس لیے بہتر ہو گا تم فیضان سے کہو فی الحال یہاں سے چلا جائے۔ اسے جو بھی کہنا ہے وہ میں گھر میں سن لوں

گا لیکن انیکسی اسے فارغ کرنا ہی ہو گی۔ اب اسے اپنے گھر میں میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

بہت سمجھانے کے بعد دانیال حسن کے انداز میں بس اتنی سی لچک آئی تھی البتہ لہجہ ابھی بھی دوٹوک اور غیر مبہم رہا تھا۔

فیضان اس پذیرائی پر الگ غصے میں تھے لیکن چونکہ توقیر صاحب کو انہوں نے ہمیشہ بڑے بھائیوں والا درجہ دیا تھا سو ان کی بات مانتے ہوئے چپ چاپ واپس آگئے تھے۔

وہ دونوں لفٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ توقیر صاحب نے پوچھ لیا۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے فیضان بری طرح چونکے۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ میرا ولید سے جھگڑا ہوا ہے؟ بلکہ میری تو اس سے آخری ملاقات بھی بہت دن پہلے ہوئی تھی۔" فیضان سوچ سوچ کر بول رہے تھے جیسے اس کی اور اپنی آخری ملاقات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"اچھا..." توقیر صاحب نے محض اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ فیضان نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے نکالی پھر سیدھی سڑک پر ڈال دی۔ اس دوران وہ منتظر رہے کہ توقیر صاحب کچھ کہیں گے لیکن ان کی خاموشی کچھ زیادہ ہی طوالت پکڑ گئی تھی جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہوں۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا توقیر بھائی!" فیضان نے ہی خاموشی کو توڑا تھا۔

"یار فیضان! میں سمجھ نہیں پا رہا کہ کس طرح بات کو ایکسپلین کروں۔" توقیر صاحب نے معذوری ظاہر کی فیضان اور بھی الجھ گئے۔

"آپ مجھے کانشس کر رہے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے...؟"

"دراصل..." توقیر صاحب نے تمہید باندھنے کے ارادے سے گہری سانس لے کر بات کا آغاز کیا تھا۔

"ولید نے دانیال سے کہا ہے کہ تم... اس کے سارے کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے... انیبا کو ٹریپ کر رہے ہو۔"

"کیا..." گاڑی ایک جھٹکا کھا کر رک گئی کیونکہ فیضان کا پاؤں بے ساختہ بریک پر جا پڑا تھا ورنہ سامنے والی گاڑی سے ٹکراؤ یقینی تھا۔

"سنبھل کر۔" توقیر صاحب نے تیزی سے کہا۔ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا دونوں کو اس ٹرانس سے نکلنے میں چند منٹ لگے اس دوران پیچھے ٹریفک کی ایک لائن لگ چکی تھی۔

"پارٹنر شپ ختم کرنے کے لیے اس سے زیادہ گھٹیا بہانہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔" گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے فیضان نے دانت پیس کر کہا تھا۔

"تم ہانپو مت ہو فیضان! گو کہ میں جانتا ہوں یہ کہنا بھی فضول ہے۔ بات ہی ایسی ہے کہ کسی بھی شریف انسان کی برداشت جواب دے سکتی ہے۔" توقیر صاحب نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر دانیال حسن نے یا ولید نے کیا سوچ کر یہ بات کہی ہے.... ایسی کون سی کجی نظر آگئی ان لوگوں کو میرے کردار میں....؟"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں اسی لیے میں نے دانیال سے کہا کہ ولید کی بات سراسر جھوٹ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے تشویش ہوئی کہ آخر ولید نے ایسی فضول بات کی کیوں ہے۔ آخر اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"اب یہ تو وہ ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے دماغ میں کیا آیا.... مجھے تو یہ سارا خاندان ہی پاگل لگتا ہے۔" فیضان نے غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔ توقیر صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے دانیال کو بھی سمجھایا ہے۔ وہ رات میں تم سے بات کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔"

"مہربانی ان کی.... بڑا احسان کیا میرے سر پر۔"

"تمہیں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنا برا لگے گا لیکن بعض اوقات انسان کو ناپسندیدہ کام کرنے پڑ جاتے ہیں سو...." توقیر صاحب نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔ فیضان کے خون میں جیسے شرارے دوڑ رہے تھے۔ بھلے ہی انہوں نے توقیر صاحب سے کچھ نہ کہا تھا لیکن بہرحال سارا معاملہ تو ان کی سمجھ میں آ ہی چکا تھا کہ انیبا کی مہربانی نے کسی نہ کسی کو ان کی نیک نامی پر انگلی اٹھانے کا موقع فراہم کر ہی دیا تھا اور ان کا بس نہ چلتا تھا کہ انیبا کی گردن ہی دبا دیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سے کہا تھا اپنے کپڑے استری کرنے کے لیے سلیمہ کو دے دو۔" نمل نے کچھ خیال آنے پر ماوی سے کہا تھا۔ وہ اسے پرانی تصویروں کا البم دکھا رہی تھی اور تصویریں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ ماوی کی جان اس لفافے میں اٹکی تھی جو اس کی الماری کے نچلے خانے میں حفاظت سے رکھا تھا اور جسے کھولنے کا موقع اسے اب تک نہ مل سکا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح کچھ دیر کمرے میں جا کر بیٹھنے کا موقع مل جائے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی اسے واپس بٹھا لیتا تھا۔ ناچار ماوی کو فرصت ملنے کا انتظار کرنا تھا اور اب وہ بڑے تحمل سے بیٹھی اس وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

تنوی نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح اسے ماوی سے اس کے جلال کے متعلق پوچھنے کا موقع مل جائے۔ ایک آدھ بار جب موقع ہاتھ آیا بھی تو سارے تجسس کے باوجود اسے مناسب لفظ نہ مل سکے تھے۔

"ماوی! تم آج جو سوٹ پہننے والی ہو وہ میں نے اب تک نہیں دیکھا۔" "معاً" تنوی کو ماوی کو سب کے درمیان سے اٹھانے کا ایک بہانہ سوجھ ہی گیا تھا۔

"آؤ.... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" ماوی نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"تمہیں یہاں سے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوثر! جاؤ بی بی کے کمرے سے اس کا سوٹ لے آؤ" تحریمہ بھابھی نے کہا تھا۔

"نہیں بھابھی! اسے پتا نہیں چلے گا کہ سوٹ کہاں ہے۔ میں خود نکال لاتی ہوں۔" اس نے بعجلت اٹھتے ہوئے کہا تھا مبادا موقع ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے۔

"میں بھی ساتھ آتی ہوں۔" تنوی بھی اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے ماوی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"تم بیٹھو.... میں اپنا ڈریس لے کر آتی ہوں۔"

"رہنے دو ماوی! تمہارا ڈریس تو میں نے دیکھ رکھا ہے۔"

"ایں...." ماوی بری طرح حیران ہوئی۔ "لیکن تم نے تو کہا تھا کہ...." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ تنوی نے اس کی بات قطع کی تھی۔

"وہ تو میں نے اس لیے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کا موقع مل سکے۔ دراصل میں تم سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"نہیں! پہلے تم وعدہ کرو کہ میری کسی بات پر خفا نہیں ہوگی۔"

ماوی ہنس دی۔ "ہاں بھئی۔ میں خفا نہیں ہوں گی۔ تم پوچھو جو پوچھنا ہے۔"

"وہ دراصل...." تنوی کو اس کا لہجہ خاصا حوصلہ افزا لگا تھا۔ "میں نے شبیہہ بھائی اور جلال بھائی کو بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ تم جلال بھائی کی منکوحہ ہو۔"

"من.... کو.... حہ....؟" ماوی نے نا سمجھی سے دہرایا۔

"یعنی تم ان کی بیوی ہو۔ نکاح کیا ہے تم نے ان سے۔ میں یہی جاننا چاہ رہی ہوں کہ کیا یہ درست ہے یا مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟" اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"جب خود سن ہی لیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟ اپنے بھائیوں کی بات پر یقین نہیں ہے کیا؟"

"یہ بات نہیں ہے نمل اور حرم آپا میری بات پر یقین ہی نہیں کر رہیں وہ اتنے وثوق سے میری بات کو رد کرتی ہیں کہ میں خود کنفیوژ ہو جاتی ہوں کہ جو سنا وہ درست بھی تھا یا میری غلط فہمی تھی۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

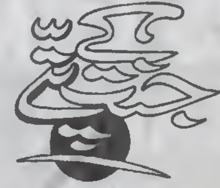
ماوی ہولے سے مسکرادی۔
"ہاں تنوی جو تم نے سنا وہ درست ہے۔ لیکن وعدہ کرو اس بارے میں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔"
"لیکن کیوں؟" وہ جو پر جوش ہو کر پوچھنا چاہتی تھی اچنبھے میں پڑ گئی۔
"دراصل میرے حویلی آنے سے پہلے ہی میں اور جلال نکاح کر چکے تھے اور ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہے یہ تو ہمیں تب پتا چلا جب یہاں حویلی میں ہمارا آمنا سامنا ہوا تب ہی میں نے اور جلال نے ڈیسائیڈ کیا تھا کہ جب تک جلال کو مناسب نہیں لگے گا اور حویلی کے تمام افراد مجھے یہاں کا ایک فرد نہیں سمجھ لیتے نکاح کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اب اگر تم نے یہ بات ڈس کلوز کردی تو ہم دونوں کے لیے بہت ٹینشن کری ایٹ ہو جائے گی۔ شاید دادی جان اس بات پر بری طرح ری ایکٹ کریں۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"
"تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔" تنوی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے جیسے دمک رہا تھا۔

"لیکن میں بہت خوش ہوں۔ جلال بھائی بہت اچھے ہیں تم بہت لکی ہو ماوی!"
وہ چہکنے لگی تھی۔ اس کی باتیں زیادہ تر جلال کے گرد ہی گھوم رہی تھیں اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ماوی کو اس کی خوش قسمتی کا یقین دلا دے۔ ماوی بھی پوری توجہ سے اور کبھی بے توجہی سے اس کی باتوں کے جواب دیتی رہی یہاں تک کہ بارات کے آنے کا وقت ہو گیا اور ملازمہ کو ان دونوں کو بلانے کے لیے آنا پڑا۔
ماوی بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چل دی تھی کیونکہ اس لفافے کو کھولنے کا موقع اسے تا حال نہ مل سکا تھا۔



سب لڑکیاں زور و شور سے تیار ہونے میں مصروف تھیں جب اسے اپنے کمرے میں آنے کا موقع میسر آہی گیا۔ خود وہ وقت سے بہت پہلے تیار ہو چکی تھی آج اس نے سرخ رنگ کی سیدھی لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا۔ سرخ دوپٹہ گردن سے لگا تھا۔ دوپٹے اور قمیص پر بہت باریک سلور کام ہوا تھا۔ میک اپ میں تو اسے مہارت حاصل تھی جبکہ سلکی بالوں کو اس نے ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ دیا تھا جو اس کی لمبی گردن پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا کچھ لٹیں دانستہ چہرے کے اطراف میں پڑی رہنے دی تھیں۔ اپنے بدیسی حسن کے ساتھ اس خالصتاً "دیسی حلیے" میں وہ بہت سوبر اور اسٹائلش لگ رہی تھی۔
کمرے میں آتے ہی اس نے بعجلت الماری کھولی اور احتیاط سے لفافہ نکال کر اسے چاک کیا۔ حسب توقع اندر بوسیدہ کاغذ پر خط ہی تحریر کیا گیا تھا۔
وہ خط لیے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔
بلاشبہ اس کے بابا کی لکھائی شان دار تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ متن سمجھ پاتی عقب سے کسی نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا وہ بوسیدہ ٹکڑا اچک لیا تھا۔ ماوی سرعت سے پلٹی۔ وہ جنت بیگم تھیں اور کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
ماوی کو اپنے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی ثبوت تک پہنچنے کا یہ موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد



سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے' وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی' حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے' تاہم سبین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ

مکمل ناول



اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست معتصم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچاتا ہے تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوتا ہے۔ حیا' جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پاشا لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے' جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے' جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا کلچ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا' پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آجاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مہری سے ملتے ہیں' تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پنکی' حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا دیتا ہے' جو ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی' ڈولی اس دنیا میں نہیں ہو گا۔ وہ چھ حرفی کوڈ کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے' جہان سے بھی کہتی ہے' پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا' معتصم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر who لکھ دیتا ہے۔ حیا' عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پہ رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنکی ہے اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی منگنی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا' پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

قسط نمبر 7

"مرمرا... سمندر... نمکین پانی۔"

عائشے نے مسکرا کر ان کو دیکھتے ہوئے چھرا اپنے سیپ کے ایک طرف رکھا۔

"ہاں تو بہارے! وہ کیا چیز ہے جو پانی کے اندر ایک صندوق میں ریت کے ذرے سے بنتی ہے؟"

"حیا... حیا... وہ مٹی کے ذرے سے بنتا ہے... اور... اور اس کا صندوق جب قتل کیا جاتا ہے تو... چھرا گھونپ کر قتل..." وہ جوش سے بے ربط جملے بولتی عائشے کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک چاندی سے چمکتے سیپ میں چھرا چلا رہی تھی۔ سیپ کا خول چٹخا۔ عائشے نے کتاب کی طرح سے اسے کھولا۔ اندر دم توڑتے جانور پہ ایک سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

"موتی... پرل... پورے پانچ حروف..." بہارے خوشی سے چلائی اور پھر جلدی جلدی ڈبے کے کوڈ بار کی

سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ وہ اب اس پہ Pearl لکھ رہی تھی۔

حیا اور عائشے بے اختیار اپنا کام چھوڑ کر آگے ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی بہارے آخری حرف "ایل" سامنے لائی' کلک کی آواز کے ساتھ باکس کے سائیڈ سے دراز باہر کو کھلی۔ حیا کی توقع کے برعکس وہ باکس اوپری ڈھکن کے بجائے سائیڈ کی دراز سے کھلتا تھا۔

دراز میں سیاہ مخملیں کپڑا بچھا تھا اور اس پہ ایک نازک سا نیکلس رکھا تھا۔ نیکلس دراصل پلیٹنم کی زنجیر تھی۔ جس پر ہر دو کڑیاں چھوڑ کر ننھے ننھے ہیرے لٹک رہے تھے۔ زنجیر کے بالکل وسط میں ہیرے کے بجائے تین کڑیاں لٹکتی تھیں۔ جن کے آخر سرے پہ ایک سفید موتی پرویا ہوا تھا۔

وہ تینوں مبہوت سی اس بیش قیمت' جگمگاتے ہوئے نیکلس کو دیکھ رہی تھیں۔

"بہارے! یہ تو وہی موتی ہے جو تمہاری سیپ سے نکلا تھا۔ جو تم نے عبدالرحمٰن کو دے دیا تھا۔" عائشے ششدر سی اس موتی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں یہ تو وہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے وہ مجھے گفٹ کر دیا۔"

"اور وہ بھی اتنے خوب صورت انداز میں۔" حیا بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اسے اس تحفے اور اس تحفے کو دینے کے انداز نے بہت متاثر کیا تھا۔

بہارے نے اپنی ننھی انگلیوں سے نیکلس اٹھایا اور گردن سے لگایا۔ پھر چہرہ اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔

"یہ کیسا لگ رہا ہے؟" اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"بہت پیارا۔"

"عبدالرحمٰن نے مجھے کتنا پیارا گفٹ دیا ہے۔ اللہ' اللہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا۔" وہ اپنے پرس سے آئینہ نکال کر اب ہر زاویے سے اس کو اپنی گردن سے لگا کر دیکھ رہی تھی۔

"تم عبدالرحمٰن کو ضرور تھینک یو کرنا۔"

"اللہ... اللہ!" بہارے کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ "حیا! میں تم سے بھی خوب صورت لگ رہی ہوں' ہے نا۔"

"ہاں! تم مجھ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ مسکرا کر اسے تسلی دیتی سیپ کے خول اٹھانے لگی۔ ابھی اسے پوری مالا بنانی تھی۔

"حیا! تم میری تصویر کھینچو۔ میں اسے سر پہ کراؤن کی طرح پہنتی ہوں۔ کیونکہ میں پرنسس ہوں۔" وہ نیکلس اپنے سر پہ تاج کی طرح پہنے اٹھ کر ساحل پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس نے وہ تحفہ دو' ڈھائی ماہ بعد کھولا تھا۔ سو آج اس کا دن تھا۔

"دھیان سے بہارے! ہوا تیز ہے۔" سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی بہارے نے عائشے کی بات نہیں سنی تھی۔ حیا نے موبائل نکال کر کیمرا آن کیا۔ پھر موبائل چہرے کے سامنے لا کر بہارے کو فوکس کیا۔

"پرنسس! اب تم ذرا مسکراؤ۔"

بہارے بڑے معصوم انداز میں مسکرا دی۔ اسے بے اختیار بیوک ادا کے بازار میں سڑک کے وسط میں کھڑی بہارے یاد آگئی۔ جس کے گرد سیاحوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ ریڈ کارپٹ شو پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساتھ پانی بھی۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کی کچھ بھی سمجھ میں آتا' بہارے کے سر سے نیکلس اڑتا ہوا پانی میں جا گرا۔ وہ بوکھلا کر پلٹی اور پھر اس کی چیخیں ہر سو بلند ہوئیں۔

حیا تیزی سے اٹھی۔ گود میں رکھی لڑی گر گئی۔ سیپوں کے خول بکھر گئے۔ وہ بھاگ کر پانی میں آئی۔ بہارے چیختی ہوئی پانی میں ہاتھ مارتی اپنا نیکلس تلاش کر رہی تھی۔ جو لہر اس کا نیکلس چھین کر لے گئی تھی۔ وہ واپس جا رہی تھی۔ حیا ننگے پیر بھاگتی ہوئی لہر

کے پیچھے گئی۔ مگر پانی جیت گیا' لہر پلٹ گئی۔ ہار پانی میں گم ہو گیا۔ بہارے زور زور سے روتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

"میرا نیکلس... حیا... میرا نیکلس..." عائشے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ کسی بے آب مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے خود کو چھڑا رہی تھی۔

"حیا... آگے مت جاؤ... پانی گہرا ہے... وہ گم جائے گا۔" عائشے اسے آوازیں دے رہی تھی۔ مگر وہ سب کچھ بھلائے یوں کہ ادا کی شہزادی کا تاج ڈھونڈ رہی تھی۔ ساحل کی گیلی ریت' پانی' سمندر' وہ پانی میں ہاتھ مارتی پوری طرح بھیگ چکی تھی' مگر نیکلس کہیں نہیں تھا۔ اس نے تھک کر اپنے عقب میں دیکھا' جہاں عائشے بمشکل آنسو روکے' تڑپتی' بلکتی بہارے کو پکڑے کھڑی تھی۔

"عائشے! میرا نیکلس... عائشے! مجھے نیکلس واپس لادو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی عائشے کے بازو خود سے ہٹانے کی سعی کر رہی تھی۔

نیکلس وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے نمکین گہرائی واپس اپنے اندر لے گئی تھی۔ بہارے کی زندگی کا پہلا اور واحد موتی اس سے کھو گیا تھا۔

"بہارے! میں نے بہت ڈھونڈا مگر دیکھو' جو اللہ کی مرضی۔" وہ واپس آئی اور اپنے گیلے ہاتھوں میں بہارے کے ہاتھ تھام کر کہا۔ بہارے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ گردن ادھر ادھر مارتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے نیکلس واپس لادو۔ کوئی مجھے نیکلس واپس لادو۔" وہ انگریزی اور پھر ترکی میں ایک ہی بات دہراتی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

حیا کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ اسے لگا وہ خود بھی ابھی رو دے گی۔ وہ بمشکل لب بھینچ کر ضبط کیے ہوئے تھی۔ پا کر کھو دینے کا دکھ وہ پہچانتی تھی۔ جب اس کا جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا۔ جب استقلال اسٹریٹ کی اس شاپ میں ڈی جے سر پکڑ کر گر گئی تھی' پا کر کھو دینے سے بڑا کرب کوئی نہیں ہوتا۔

اس شام وہ دونوں بمشکل بہارے کو سنبھالتی گھر واپس لائی تھیں اور اب لونگ روم میں بڑے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ یوں کہ بہارے درمیان میں تھی اور اسے حیا نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اور کھڑکیوں کے پار اندھیرا اتر آیا تھا۔ آتش دان میں مصنوعی لکڑیاں بھڑک رہی تھیں۔ بہارے اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس آنسوؤں کا مرا تھا جو ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

"بہارے! میں تمہیں اور نیکلس لادوں گی۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگائے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر وہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔

"بالکل اس جیسا لادوں گی... پرامس!"

"مگر وہ عبدالرحمٰن کا گفٹ نہیں ہوگا۔"

"عبدالرحمٰن تمہیں خود ویسا ہی نیکلس گفٹ کرے گا۔ میں اسے کہوں گی۔"

"مگر اس میں میرا موتی نہیں ہوگا۔ عائشے... ممی..." وہ روتے روتے اپنی ماں کو یاد کرتی' تو کبھی عائشے کو پکارتی۔ عائشے سر گھٹنوں پہ رکھے مغموم سی بیٹھی تھی۔

"تمہارا جب دوبارہ موتی نکلے گا تو میں اسے نیکلس میں پرو دوں گی۔" مگر بہارے اس کی کوئی بات نہیں مان رہی تھی۔ اس کے لیے اس نیکلس کا متبادل کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر شے کا متبادل نہیں ہوا کرتا۔

"بہارے! اب بس کرو۔" جب وہ سر پٹخ پٹخ کر مزید بلند آواز میں رونے لگی تو عائشے نے برہمی سے ڈانٹا۔ "وہ کب سے تمہیں منا رہی ہے اور تم ہو کہ بدتمیزی کیے جا رہی ہو؟"

جواباً بہارے نے غصے اور پانی سے بھری آنکھوں سے عائشے کو دیکھا۔

"تم مین ہو عائشے... تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ عبدالرحمٰن مجھے گفٹ دے۔"

"ہاں؟" عائشے ہکا بکا رہ گئی۔ "میں... میں ایسی ہوں؟ تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں تم مین ہو۔" وہ آگے بڑھ کر اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے عائشے کے گھٹنے پہ مکے مارنے لگی۔ حیا نے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے ہٹایا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" عائشے روہانسی ہو گئی۔

"تم... تم لڑ رہی تھیں عبدالرحمٰن سے۔ وہ اسی لیے انڈیا چلا گیا ہے' کیونکہ تم اس سے لڑ رہی تھیں۔ تم نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا اور تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہارے گل سے بے تکلف نہ ہوا کرے۔ وہ تمہاری وجہ سے یہاں سے گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا سوراخ سے۔"

عائشے کا چہرہ یک دم سرخ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سے زخم ابھرے۔

"سنو بہارے!" وہ آگے بڑھی اور ایک دم بے حد جارحانہ انداز سے بہارے کے کندھے دبوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔

"عبدالرحمٰن ہمارا نہیں ہے اور وہ جلد یا بدیر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

"تم گندی ہو' تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتی' میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اب میری بات غور سے سنو۔" اس نے غصے سے بہارے کو جھٹکا دیا۔ "عبدالرحمٰن مر گیا ہے ہمارے لیے۔" ایک جھٹکے سے اس نے بہارے کے کندھے چھوڑے اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چلی گئی۔

بہارے کے آنسو ایک دم سے رک گئے۔ وہ بالکل ساکت و جامد ہو چکی تھی۔ لب آپس میں پیوست کیے' وہ گویا سانس روکے بیٹھی تھی۔

"بہارے!" اس نے تاسف سے اسے پکارا۔

وہ ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان کے مشترکہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور بہارے بیڈ پہ چت لیٹی نظر آ رہی تھی۔ ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ سو وہ عائشے کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

عائشے چھت پہ تھی۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے کھلا سیاہ آسمان تھا اور نیچے جدیسی کے اونچے پولز کی مدھم بتیاں۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے سیاہ اسکارف میں دمکتے چہرے پہ لڑھکتے آنسو دیکھ سکتی تھی۔ اسے بے اختیار ڈی جے یاد آئی' جب وہ ان سے ناراض ہو کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی۔

"عائشے!" وہ دکھی دل سے کہتی اس کے ساتھ آ بیٹھی اور ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ عائشے نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ بس اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بے آواز روئے گئی۔

"عائشے! یوں مت روؤ۔ وہ بچی ہے۔ اس نے یوں ہی کہہ دی وہ بات۔ مجھے پتا ہے تم کسی سے نہیں لڑ سکتیں۔"

"بہارے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں واقعی عبدالرحمٰن سے لڑی تھی۔ مگر صرف اس وقت جب میں بہت پریشان تھی۔ لیکن وہ میری وجہ سے واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری وجہ سے کچھ نہیں کرتا۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کرتی؟ مجھ سے آنے کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"کیا ہوا آنے کو؟" عائشے نے بھیگی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں عبدالرحمٰن نے بتایا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے؟"

"نہیں!" وہ بری طرح سے چونکی۔

"میں اور بہارے اپنے والدین کے ساتھ اناطولیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک سال پہلے ہمارے والدین کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو ہماری سب سے قریبی عزیزہ' یعنی ہماری دادی (آنے) ہمیں

ادھر لے آئیں۔ یہ گھر آنے کا اپنا نہیں تھا۔ یہ گھر آنے کے شوہر کے بھائی کی ملکیت تھا۔ بعد میں یہ نسل در نسل چلتا میرے باپ اور پھر مجھ تک آیا۔ آنے کے دونوں بیٹوں نے اس سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ سو آنے نے قانونی کارروائی کے بعد اسے میرے نام کردیا۔ جب ہم یہاں آئے تھے۔ تب یہاں صرف آنے اور عبدالرحمٰن رہتے تھے۔ مگر مجھے یاد تھا کہ آنے کا ایک اور بیٹا بھی تھا۔ تب آنے نے بہت دکھ سے بتایا کہ ان کا دوسرا بیٹا ہمارے آنے سے چند ماہ قبل گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیوں' کیسے' عبدالرحمٰن لاعلم تھا۔ مگر آج سے تین ماہ قبل مجھے کسی نے بتایا کہ وہ عبدالرحمٰن کے آفس میں جاتے دیکھا گیا ہے اور یہ کہ وہاں سے کسی جھگڑے کی آواز آرہی تھی۔ تب میں عبدالرحمٰن سے بہت لڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی کدھر ہے۔ مگر اس نے ہم سب سے جھوٹ بولا۔ آنے کو تو ابھی تک نہیں معلوم کہ عبدالرحمٰن اس کے بارے میں جانتا ہے۔"

"مگر اس کا بھائی کہاں گیا؟"

"یہی تو میں نے عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا۔ مگر وہ کسی بات کا ٹھیک جواب دے تب نا۔ وہ کہتا ہے اس نے اپنے بھائی کو نہیں نکالا' وہ خود سب کچھ چھوڑ کر گیا ہے۔ پہلے تو ان دونوں کی بہت دوستی تھی۔ عبدالرحمٰن پانی کی طرح اس پہ پیسہ بہایا کرتا تھا۔ پھر ایک دم سے وہ کیوں سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آنے اس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے ان کے لیے کچھ کروں۔"

"تم نے دیکھا ہوا ہے ان کے دوسرے بیٹے کو؟"

"جب میں گیارہ سال کی تھی تب آخری بار اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ استنبول میں ہی ہے۔ مگر ہوٹل گرینڈ میں عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ یونان چلا گیا اور وہاں پہ ہوٹل گرینڈ کی چین میں کام کررہا ہے۔ مگر یقین مانو' یونان میں ہمارے ہوٹل کی کوئی شاخ نہیں ہے۔" وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ مگر اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

"عائشے! تم اور بہارے عبدالرحمٰن کی اتنی تعریفیں کرتے ہو' میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا۔ مگر آج مجھے یہ کہنے دو کہ وہ استنبول میں خاصا بدنام ہے۔ لوگ اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔"

"میرا دل ان باتوں کو نہیں مانتا۔ لوگ مجھے بھی آکر یہ باتیں کہہ دیتے ہیں' مگر میں جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ بس اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔" وہ عائشے کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دماغ اسی ایک نکتے پہ مرکوز ہوگیا تھا۔ عبدالرحمٰن پاشا کا ایک گمشدہ بھائی۔ کوئی بھی شخص یوں ہی اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر نہیں جاتا' کوئی تو بات تھی۔ بالآخر اسے عبدالرحمٰن کی ایک کمزوری مل گئی تھی۔

"اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔"



"حیا... حیا۔" صبح وہ عائشے کے زور' زور سے چلانے پہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے پریشانی سے عائشے کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"بہارے گھر پہ نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ ساری میری غلطی ہے۔ میں نے کل اسے ڈانٹا تھا۔" عائشے بس رو دینے کو تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے نکلی تھی۔

باہر کھڑے گارڈ نے بتایا کہ اس نے بہارے کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔

"وہ پچھلے دروازے سے نکلی ہوگی۔ اس گھر میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ عبدالرحمٰن کی عنایات۔ وہ ہر شے میں بیک ڈور رکھتا ہے۔" عائشے تلخی سے

بڑبڑاتی اس کے ساتھ باہر نکلی۔

"عائشے! مجھے پتا ہے' وہ کدھر ہوگی۔" اسے یقین تھا کہ وہ سمندر پہ گئی ہوگی۔

جب وہ اس ویران ساحل پہ پہنچیں تو وہ انہیں دور سے ہی نظر آگئی۔ وہ وہیں اس پتھر پہ بیٹھی تھی جہاں وہ تینوں کل چٹائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے سامنے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیپ اور دوسرے میں چھرا تھا۔

"بہارے!" عائشے بمشکل آنسو روکتی بھاگتی ہوئی بہارے کے گلے لگ گئی۔ "تم ایسے کیوں آگئیں؟ میں اتنی پریشان ہوگئی تھی۔"

بہارے نے ویران سی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑی سیپ عائشے کے سامنے کی۔

"عائشے! میرا سیپ پھر خالی نکلا۔" اس نے بہت دکھ سے سیپ کھول کر دکھائی۔

"تم میرے سارے موتی لے لینا' میں انہیں اب بازار میں نہیں بیچوں گی' تم حیا کے تینوں موتی بھی لے لینا جو اس کے کزن کے نکلے تھے۔ مگر اب تم روؤ گی نہیں۔"

"نہیں عائشے!" بہارے نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا موتی کھو گیا ہے' وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

حیا' بہارے کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھی اور اس کے گیلے ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگی۔

"چیزیں وقتی ہوتی ہیں' ٹوٹ جاتی ہیں' بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی۔ جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور آج تم نے ایک کھوئے ہوئے موتی سے ہار مان لی؟"

بہارے نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

"اپنے دکھ میں دوسرے کا دل نہیں دکھاتے بہارے! میں تمہیں بالکل ویسا ہی نیکلس لادوں گی' پرامس!"

اور پھر شام میں اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے اس نے عائشے سے کہا کہ جب عبدالرحمٰن کا فون آئے' وہ اسے بتائے' سو جب اس کا فون آیا تو عائشے نے کارڈلیس اسے تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"السلام علیکم!" وہ بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"وعلیکم السلام... خیریت؟" وہ جیسے بہت حیران ہوا تھا۔

"جی... وہ... مجھے کچھ کام تھا۔" اسے یاد تھا کہ آخری دفعہ اس نے جب عبدالرحمٰن کو کام کہا تھا تو اس کا نتیجہ بہت بھیانک نکلا تھا۔ مگر اب وہ اسے ایک اور موقع دے رہی تھی۔

"کہیے... آپ کو ہم سے بات کرنے کا خیال صرف کام کے وقت ہی آتا ہے' مگر کہیے۔"

دل تو اس کا چاہا کہ فون دیوار پہ دے مارے' مگر برداشت کر گئی اور ساری بات کہہ سنائی۔ آخر میں بولی۔ "آپ مجھے اس شاپ کا نام بتا سکتے ہیں جہاں سے آپ نے وہ نیکلس لیا تھا؟"

"وہ میرا گفٹ تھا۔ سو مجھے ہی دوبارہ لینا چاہیے' لیکن چونکہ میں ابھی ملک سے باہر ہوں تو میرا بندہ اس شاپ کے واؤچرز آپ کو دے جائے گا۔ آپ جواہر کی اس شاپ سے وہ نیکلس خرید کر بہارے کو دے دیجیے گا۔ السلام علیکم۔"

بے لچک اور خشک انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ حیا نے ایک متنفر نگاہ کارڈلیس پہ ڈالی اور تہیہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی اس شخص سے دوبارہ بات کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔

اس کا خیال بہت جلد غلط ثابت ہونے والا تھا۔



ہوٹل گرینڈ کا ملازم واؤچرلے کر آیا۔ مگر تب جب وہ تینوں استنبول جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عائشے کو بینک میں کوئی کام تھا۔ سو وہ اور بہارے اس کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ حیا نے واؤچرز لے کر کمرے میں رکھے۔ مگر فیری کے لیے روانہ ہوتے وقت وہ انہیں اٹھانا بھول گئی۔ سو استنبول آکر وہ جواہر نہیں گئی۔ نیکلس پھر کبھی خرید لے گی' کیونکہ اس میں پرونا تو بہارے کا موتی ہی تھا جو جانے کب نکلے' مگر سبانجی کے ڈورم میں جا کر وہ اپنا پزل باکس ضرور اٹھا لائی تھی۔ وہ صبح کی کلاسز کا ٹائم تھا اور ڈورم خالی پڑا تھا۔ سو نہ وہ کسی سے خود ملی' نہ ہی کسی سے سامنا ہوا۔

پزل باکس اور چند ضروری چیزیں لے کر جب وہ باہر آئی تو عائشے کے کاموں میں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ استقلال اسٹریٹ جا سکتی۔ وہ دوپہر تک ہی واپس آگئے۔ اپنا پزل باکس اس نے احتیاط سے الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھا۔ اب اس نے جلد از جلد اسے کھولنا تھا۔

رات وہ عائشے اور بہارے کے سونے کے بعد پزل باکس نکال کر دبے قدموں میں چلتی باہر آئی۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑے اس نے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنا شروع کیں۔ پہلے اس نے Ayeshe لکھا' مگر باکس جامد رہا۔ اسے یہی توقع تھی۔ یقیناً" باکس لیتے ہی خریدار نے پاس ورڈ بدل دیا ہوگا۔ پھر اس نے yangin لکھا جو "آگ" کو ترکی میں کہتے ہیں۔ باکس جوں کا توں رہا۔ اسے یہی امید تھی۔ اب اسے وہ کرنا تھا جس کی طرف ہراقلیطس کا قول اشارہ کر رہا تھا۔ آگ' اصلی والی آگ۔

اس نے ماچس اٹھائی' اور تیلی سلگا کر باکس کے قریب لائی' مگر آنچ لکڑی کو سیاہ کرنے لگی اور شعلہ تیلی کو کھا کر اس کی انگلی تک پہنچنے لگا تو اس نے جھنجلا کر تیلی پھینکی۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی' پھر باکس لیے باہر آئی۔

لونگ روم کا آتش دان سرد پڑا تھا۔ اس نے ناب پھیر کر آگ لگائی تو مصنوعی لکڑیوں والا ہیٹر جل اٹھا۔ وہ باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس جگہ کے قریب لائی جہاں صرف دہکتے انگارے تھے۔ شعلے نہ تھے۔

ہیٹر کی تپش اس کی انگلیوں کو چھونے لگی۔ وہ ضبط کرکے باکس پکڑے بیٹھی رہی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے وہ تکلیف دہ رات ابھرتی۔ الاؤ' کھولتا مائع' دہکتی سلاخیں... اس نے سر جھٹک کر توجہ پزل باکس کی طرز مرکوز کی۔ اس نے اسے ذرا ترچھا پکڑ رکھا تھا۔ یوں کہ اس کی دو اطراف انگاروں کے سامنے تھیں۔ جو طرف ذرا زیادہ سامنے تھی۔ اس پہ حروف ابھرنے شروع ہوگئے تھے۔

حروف... بلکہ الفاظ... فقرے۔

اس نے حیرت سے باکس کی اس سائیڈ کو دیکھا جس کا رنگ تپش کے ساتھ سیاہ ہو رہا تھا اور اوپر سنہری سے الفاظ ابھر رہے تھے۔ وہ شاید لاشعوری طور پر کسی چھ حرفی لفظ کی توقع کر رہی تھی' مگر یہاں تو... حیا نے باکس آگ سے ہٹا کر دیکھا۔ اس پہ لکھے دو فقرے واضح تھے۔ وہ کوئی نظمیہ شعر تھا۔

Marked on Homers doubts
A Stick with twin sprouts

(ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ ایک چھڑی جس کی دو نوکیں ہوتی ہیں۔)

وہ ابھی ان الفاظ پہ ٹھیک سے الجھ بھی نہ سکی کہ اس کی نگاہ اس سیاہ ہوتی طرف سے متصل طرف پہ پڑی۔ جو ذرا سی تپش اس جگہ کو ملی تھی' اس نے وہاں چند ادھورے حروف ظاہر کیے تھے۔ حیا نے وہ طرف آگ کے سامنے کی۔ ادھورے الفاظ مکمل ہو کر ایک شعر میں ڈھل گئے۔

Around the emerald crusified
And the Freedom Petrified

(مصلوب زدہ زمرد اور ٹھہری ہوئی آزادی کے گرد۔)

کسی احساس کے تحت اس نے تیسری متصل دیوار

کو آنچ دکھائی۔ باکس کی تیسری طرف بھی کسی جادوئی اثر کی طرح سیاہ پڑنے لگی اور اوپر جیسے کوئی ان دیکھا قلم سنہری روشنائی سے لکھنے لگا۔

Snapped there a bloody pine
Split there some tears divine

(ادھر خون میں ڈوبا صنوبر چٹختا تھا اور آفاقی آنسو بکھرتے تھے۔)

اب کوڈ بار سے متصل دو دیواریں اور تیسری جو کوڈ بار کے بالکل متوازی تھی' حروف سے بھری جا چکی تھیں۔ باقی اوپر ڈھکن کی سطح جہاں ہراقلیطس کا قول لکھا تھا' رہ گئی تھی' یا پھر نچلی طرف۔ اس نے دونوں کو آنچ دکھائی' مگر کچھ نہ ہوا۔ اب صرف کوڈ بار والی طرف بچی تھی۔ حیا نے احتیاط سے اس کو انگاروں کے قریب کیا۔ جیسے جیسے تپش لکڑی کو چھوتی گئی کوڈ بار کے چھ چوکھٹوں کے اوپر ایک شعر ابھر آگیا۔

A Love lost in symbolic smell
Under which the lines dwell

(علامتی خوشبو میں ایک پیار کھو گیا' جس کے نیچے سطریں رہتی ہیں۔)

پزل باکس کا آخری شعر۔

آٹھ مصرعوں کی نظم مکمل ہوگئی تھی۔ اب یہ نظم کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ یہ اس کو ابھی سوچنا تھا۔

پہلی بار اسے بری طرح سے معتصم کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہارے پھول چننے کے لیے گئی تھی اور اب نیچے درختوں میں ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ نیکلس کا غم اب تک اسے بھول بھال چکا تھا۔ وہ عائشے کے ساتھ ایک درخت تلے چٹائی پہ بیٹھی اس کی ہدایت کے مطابق ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ٹکڑے کو تراش رہی تھی' سہ پہر کی نرم سی دھوپ' سرخ صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر ان پہ گر رہی تھی۔

ایک پزل باکس بنانے کے لیے پانچ سو سات (507) لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے درکار ہوتے تھے۔ خاصا محنت طلب کام تھا۔ عائشے نے اناطولیہ کے ایک گاؤں میں کسی معمر چینی کاری گر سے یہ فن سیکھا تھا۔

"تمہیں واؤچرز منگوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبدالرحمٰن کی تو قیمتی تحائف دینے کی عادت ہے۔ یوں ہی بہارے کی عادتیں بگڑتی جائیں گی۔"

اس کی بات پہ حیا نے سر اٹھایا۔ اس نے ڈھیلی چوٹی باندھ کر آگے کو ڈال رکھی تھی اور چند لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔

"میں تو اپنی طرف سے دینا چاہتی تھی۔ مگر اس نے میری پوری بات ہی نہیں سنی۔ اب لے ہی آیا ہے تو واپس کیا کرنا۔" وہ سر جھکا کر رندا لکڑی کے ٹکڑے پہ آگے پیچھے رگڑنے لگی۔ لکڑی کے باریک رول شدہ چپس سے نیچے گر رہے تھے۔

"اور ہاں' بہارے نے تمہارے لیے کچھ خریدا تھا۔ اسے لگا اس نے تم سے اس دن بہت بدتمیزی کردی تھی۔"

"اچھا؟ کیا خریدا ہے؟" وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

"ایک ریشمی اسکارف ہے۔"

"مگر میں تو سر پہ اسکارف نہیں لیتی۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر پچھتائی' کسی کے تحفے کے لیے ایسے تو نہیں کہنا چاہیے۔

"کوئی بات نہیں تم گردن میں لے لینا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا کر دوبارہ رندا لکڑی پہ رگڑنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے عائشے! جب میں چھوٹی تھی نا دس گیارہ سال کی' تب مجھے اسکارف پہننے کا بہت شوق تھا۔ میرے ابا اور تایا فرقان دونوں مجھے اکثر سر ڈھانپنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں ایسے بہت اچھا لگتا تھا۔ میری اماں بھی چاہتی تھیں کہ میں سر ڈھکا کروں' تاکہ میرے چہرے پہ نور آجائے اور میں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب

ہو جاؤں' انہوں نے مجھے قرآن حفظ کرنے کے لیے ایک اسلامک اسکول میں بھی داخل کرایا' مگر میں وہاں سے تیسرے روز ہی بھاگ آئی۔ تب میرا اسکارف پہننے کا بہت دل چاہتا تھا۔"

"تو کیوں نہیں لیا؟"

جواباً" حیا نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

"مجھے آہستہ آہستہ سمجھ آگئی کہ میرا فیس کٹ ایسا ہے کہ میں اسکارف میں اچھی نہیں لگوں گی۔" وہ کہہ کر سر جھکائے کام کرنے لگی۔ عائشے اسی طرح ہاتھ روکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"کس کو؟"

"ہاں؟" اس نے نا سمجھی سے سر اٹھا کر عائشے کو دیکھا۔

"تم کس کو اسکارف میں اچھی نہیں لگو گی؟"

"لوگوں کو۔"

"اور...؟"

"اور کیمرے کو۔ مثلاً" تصویروں میں۔"

"اور؟"

"اور خود کو۔"

"اور اللہ تعالیٰ کو؟" عائشے دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی سبز آنکھیں نرم دھوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ "ہو سکتا ہے تم اللہ تعالیٰ کو اسکارف میں بہت اچھی لگتی ہو۔" وہ ایک دم' بالکل سن ہوئی عائشے کو دیکھے گئی۔

"تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا حیا! کہ میں ہر وقت اسکارف کیوں پہنتی ہوں۔" عائشے سر جھکائے لکڑی کے ٹکڑے کا کنارہ تراشتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تمہیں بتاؤں' میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں وہ خوب صورت ملبوسات پہنوں جو بیوک ادا میں استنبول یا اٹلی اور اسپین کی لڑکیاں پہن کر آتی ہیں۔ بالکل جیسے ماڈلز پہنتی ہیں اور جب وہ اونچی ہیل کے ساتھ ریمپ پہ چلتی آ رہی ہوتی ہیں تو ایک دنیا ان کو مسحور ہو کر دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں بھی ایسے اسمارٹ اور ٹرینڈی ڈیزائنر لباس پہن کر جب سڑک پہ چلوں تو لوگ مسحور و متاثر ہو کر مجھے دیکھیں... لیکن...." وہ سانس لینے کو رکی' حیا بنا پلک جھپکے' سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن.... پھر مجھے ایک خیال آتا ہے۔ یہ خیال کہ ایک دن میں مر جاؤں گی' جیسے تمہاری دوست مر گئی تھی اور میں اس مٹی میں چلی جاؤں گی' جس کے اوپر میں چلتی ہوں۔ پھر ایک دن سورج مغرب سے نکلے گا اور زمین کا جانور زمین سے نکل کر لوگوں سے باتیں کرے گا اور لال آندھی ہر سو چلے گی۔ اس دن مجھے بھی سب کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ تم نے کبھی اولمپکس کے وہ اسٹیڈیمز دیکھے ہیں جن میں بڑی بڑی اسکرینز نصب ہوتی ہیں؟ میں خود کو ایک ایسے ہی اسٹیڈیم میں دیکھتی ہوں۔ میدان کے عین وسط میں کھڑے۔ اسکرین پہ میرا چہرہ ہوتا ہے اور پورا میدان لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ سب مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور میں اکیلی وہاں کھڑی ہوتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں حیا' اگر اس وقت میرے رب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ اناطولیہ کی عائشے گل' اب بتاؤ تم نے کیا' کیا؟ یہ بال' یہ چہرہ' یہ جسم' یہ سب تو میں نے تمہیں دیا تھا۔ یہ نہ تم نے مجھ سے مانگ کر حاصل کیا تھا اور نہ ہی اس کی قیمت ادا کی تھی۔ یہ تو میری امانت تھی۔ پھر تم نے اسے میری مرضی کے مطابق استعمال کیوں نہیں کیا؟ تم نے اس سے وہ کام کیوں کیے جن کو میں ناپسند کرتا ہوں؟ تم نے ان عورتوں کا رستہ کیوں چن لیا جن سے میں ناراض تھا؟"

میں نے ان سوالوں کے بہت جواب سوچے ہیں' مگر مجھے کوئی جواب مطمئن نہیں کرتا۔ روز صبح اسکارف لینے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے ان تمام حسین عورتوں کے دلکش سراپے گردش کرتے ہیں جو ٹی وی پہ میں نے کبھی دیکھی ہوتی ہیں اور میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی ان کا راستہ چن لوں' مگر پھر مجھے وہ آخری عدالت یاد آجاتی ہے' تب میں سوچتی ہوں کہ اس دن میں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟ میں ترازو کے ایک پلڑے میں اپنا وہ سراپا ڈالتی ہوں جس میں' میں خود کو

اچھی لگتی ہوں اور دوسرے میں وہ جس میں' میں اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہوں۔ میری پسند کا پلڑا کبھی نہیں جھکتا۔ اللہ کی پسند کا پلڑا کبھی نہیں اٹھتا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں اسکارف کیوں لیتی ہوں؟ سو میں یہ اس لیے کرتی ہوں کیونکہ میں اللہ کو ایسے اچھی لگتی ہوں۔"

وہ اب چھرے کی نوک سے لکڑی کے کنارے میں خم ڈال رہی تھی۔

"لڑکیاں سمندر کی ریت کی مانند ہوتی ہیں حیا! عیاں پڑی ریت' اگر ساحل پہ ہو تو قدموں تلے روندی جاتی ہے اور اگر سمندر کی تہ میں ہو تو کیچڑ بن جاتی ہے۔ لیکن اسی ریت کا وہ ذرہ جو خود کو ایک مضبوط سیپ میں ڈھک لے' وہ موتی بن جاتا ہے۔ جوہری اس ایک موتی کے لیے کتنے ہی سیپ چنتا ہے اور پھر اس موتی کو مخملیں ڈبوں میں بند کر کے محفوظ تجوریوں میں رکھ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی جوہری اپنی دکان کے شوکیس میں اصلی جیولری نہیں رکھتا۔ مگر ریت کے ذرے کے لیے موتی بننا آسان نہیں ہوتا' وہ ڈوبے بغیر سیپ کو کبھی نہیں پا سکتا۔"

حیا اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ریگ مال لکڑی کے ٹکڑے پہ رگڑ رہی تھی۔ لکڑی کی گنگھریالی پتریاں اتر اتر کر نیچے گر رہی تھیں۔ اس کے اندر بھی کچھ ایسا ہی چٹخ رہا تھا۔ کیا؟ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اور کبھی کبھی اسے لگتا وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی۔

کبریٰ' بہلول کے گھر اور ان کے کھیت میں کام کرتے' اواچائے کے پتے چنتے' ان کی مرغابیوں کو دانہ ڈالتے وہ اب ان سے چھوٹے چھوٹے بظاہر بے ضرر سے سوال کثرت سے پوچھنے لگی تھی۔ وہ عائشے کے بتائے گئے دو کو کبریٰ بہلول کے دو سے جمع کر کے دیکھتی تو جواب چار کے بجائے چار سو نکلتا۔ اب اسے پھر سے عبدالرحمٰن پاشا کے فون کا انتظار تھا۔ کب وہ فون کرے اور وہ اپنے پتے پھینکے۔ کھیل پاشا نے شروع کیا تھا۔ اسے ختم اب وہ کرے گی۔

چند ہی روز میں اسے یہ موقع مل گیا۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کارڈلیس اٹھالیا اور اوپر اسٹڈی میں آگئی۔

"ہیلو؟" اس نے بظاہر سادگی سے کہا۔

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموش چھائی رہی' پھر اس کی بھاری' کھردری آواز سنائی دی۔

"حیا بی بی... کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیے۔"

"جی الحمد اللہ.... آپ... کیا کر رہی تھیں؟" وہ محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا فون اٹھانے کا مقصد نہ سمجھا ہو۔

"میں ایک کہانی لکھ رہی تھی' کہیں تو سناؤں؟"

اب کی بار دوسری جانب متذبذب خاموشی چھائی رہی' پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "جی' سنا دیجیے۔"

"تین سال پہلے کی بات ہے' انڈیا کا ایک عام سا اسمگلر اپنی ماں اور بھائی کے پاس بیوک ادا آتا ہے۔ اس کا بھائی ادا میں ایک بہت کامیاب ہوٹل چلا رہا ہوتا ہے۔ نووارد بھائی اس کے ساتھ ہوٹل کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ بظاہر اسے اپنے بھائی کا بہت خیال ہے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ ہوٹل پہ قبضہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے تعلقات استعمال کر کے اپنے تعلقات وسیع کرتا ہے۔ مافیا کے ساتھ روابط بڑھاتا ہے اور تو اور' اس کی ایک عالمی دہشت گرد تنظیم سے بھی روابط ہیں۔ پھر آج سے ٹھیک دو سال پہلے وہ اپنے بھائی کو کچھ یوں ہراساں کرتا ہے کہ ایک روز بے چارا بھائی چپ چاپ ہوٹل چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ یونان میں ہے' مگر وہ درحقیقت کہاں ہے' یہ اس بڑے بھائی سے بہتر کوئی نہیں جانتا اور اس سے بازپرس کرنے والا کوئی ہے بھی نہیں سوائے ایک بوڑھی عورت اور دو معصوم لڑکیوں کے' یوں وہ عام سا اسمگلر استنبول کے بارسوخ ترین افراد میں شامل ہو جاتا ہے' اب بتائیے کیسی لگی کہانی؟ کہتے ہیں تو پبلشنگ کے لیے دے دوں؟"

اس نے بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

"میں اس ساری بکواس سے کیا مطلب لوں؟؟"

"یہی کہ میرے بارے میں ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا' ورنہ پیر کے نیچے دباؤ تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔"

"بہت احسان فراموش لڑکی ہو۔ تمہیں بھول گیا ہے کہ اس رات تمہیں اس بحری جہاز سے نیم مردہ حالت میں کون ادھر لایا تھا؟"

لمحے بھر کو وہ بالکل چپ رہ گئی۔

"میں پرسوں بیوک ادا واپس آرہا ہوں۔ تم نے جب تک ادھر رہنا ہے' تم رہو' میں ادھر نہیں آؤں گا' اور نہ ہی تمہارے راستے میں آؤں گا' سو تم بھی میرے راستے آنے کی کوشش مت کرنا۔" دھمکی آمیز لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اس نے وہیں ہاتھ رکھا ہے' جہاں سب سے زیادہ درد ہوتا تھا۔

"میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں' اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا میں نے۔" اس نے محظوظ سے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

اس نے میجر احمد کا شکریہ ادا کیا' جس نے اسے ایک دوسرے نہج پہ سوچنا سکھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اور کیا قربان کر سکتی ہو تم اپنا فاصلہ گھٹانے کے لیے؟" رات سونے سے قبل یہ آخری بات تھی جو عائشے نے اس سے پوچھی تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی آنکھیں کھول کر سوالیہ نگاہوں سے عائشے کو دیکھا' بولی کچھ نہیں۔

"میں بتاؤں؟ تم اپنی نیند قربان کرنا سیکھ لو۔" وہ کہہ کر لیٹ گئی تو حیا نے بوجھل ہوتی آنکھیں بند کرلیں۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی بہارے اس کا کندھا جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے اٹھا رہی تھی۔

"اٹھ جاؤ! عائشے نے کہا ہے آج سے تم بھی ہمارے ساتھ قرآن پڑھنے جاؤ گی۔"

"میں؟" اس نے کسل مندی سے آنکھیں ذرا کھولیں۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔"

"نہیں' نہیں' اب تو تمہیں بھی جانا پڑے گا۔ یہ ٹارچر تم بھی سہو ناں۔ میں اکیلے کیوں برداشت کروں؟ اب اٹھ جاؤ۔" دم کٹی لومڑی دوسری کی دم پھندے میں پھنستے دیکھ کر بہت خوشی خوشی اچھلتی کودتی تیار ہو رہی تھی۔

حیا بدقت تمام کمبل پھینک کر اٹھی۔ اسے اور ڈی جے کو صبح خیزی کی عادت تو تھی' مگر ان کی صبح فجر قضا ہونے کے بعد ہوتی تھی اور پھر بھاگم بھاگ کیمپس کی تیاری۔

اس نے اپنا لیموں کے رنگ کا زرد فراک پہنا' جو ایک دفعہ جہان کے گھر پہن کر گئی تھی اور گیلے بال کھلے چھوڑ کر سنگھار میز کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ابھی اس نے پرفیوم کی شیشی اٹھائی ہی تھی' بہارے عقب میں زور سے چیخی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"کیا؟" وہ اس کے اچانک چلانے پہ ڈر کر پلٹی۔

"تم باہر جانے سے پہلے پرفیوم لگا رہی ہو؟" بہارے نے بے یقینی سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"آ... ہاں۔ کیا ہوا؟"

"عائشے گل کہتی ہے' اچھی لڑکیاں باہر جانے سے پہلے اتنا تیز پرفیوم نہیں لگاتیں۔ تم یہ باڈی اسپرے لگا لو' مگر پرفیوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔" وہ بہت خفگی سے ڈانٹتی حیا کے ساتھ آکھڑی ہوئی اور پھر ایڑیاں اونچی اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتی سر پہ اسکارف لپیٹنے لگی۔

حیا نے ایک ہاتھ میں پکڑے پرفیوم کو دیکھا' اور پھر ذرا سا خفت سے اسے واپس رکھ کر باڈی مسٹ اٹھا لیا۔

حلیمہ آنٹی کے لان میں چاندنی بچھی تھی۔ وہ مرکزی جگہ پہ بیٹھی تھیں اور سارے چھوٹے بڑے بچے ان کے گرد نیم دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ وہ تینوں جس وقت داخل ہوئیں' ایک جگہ سے بچوں نے فوراً جگہ چھوڑ کر دائرہ بڑا کر دیا' حلیمہ آنٹی نے ایک نرم مسکراہٹ ان کی طرف اچھال کر سر کو جنبش دی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان' اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔"

قرأت کرنے والا بچہ سنہرے بالوں والا ترک تھا' جس نے سر پہ جالی دار ٹوپی لے رکھی تھی۔ باقی بچے خاموش تھے۔ وہ اپنی باریک' مدھر آواز میں پڑھ رہا تھا۔

"آپ ایمان لانے والی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھا کریں' اور اپنے قابل ستر اعضا کی حفاظت کیا کریں۔"

وہ جو جماہی روکتی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی' ایک دم گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"اور وہ اپنی زینت ظاہر نہ کیا کریں' سوا اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔"

کم سن بچے کی آواز نے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر سو ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ حیا نے بے اختیار سر پر اوڑھے دوپٹے سے کان ڈھکے' جن میں اس نے موتی والی بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہی موتی جو جہان کے سیپ سے نکلے تھے۔ بہارے نے اسے ایک ایک موتی دونوں بالیوں میں پرو دیا تھا۔ تیسرا موتی حیا نے سنبھال رکھا تھا۔

"اور انہیں چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پہ ڈالے رکھا کریں۔"

کسی معمول کی سی کیفیت میں اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ اس کا شیفون کا دوپٹا سر پہ تو تھا مگر گردن پہ اس نے مفلر کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ قدرے خفت سے اس نے دوپٹا کھول کر شانوں پہ ٹھیک سے پھیلا کر لپیٹا اس وقت سوائے حکم ماننے کے اسے کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ عائشے گل کی باتیں نہیں تھیں' جن پہ الجھ کر ان کو ذہن سے جھٹکا جا سکتا تھا۔ یہ حکم بہت اوپر آسمانوں سے آیا تھا۔ وہاں سے' جہاں انکار نہیں سنا جاتا تھا۔ جہاں صرف سر جھکایا جاتا تھا۔

ترک بچہ اپنا سبق ختم کر چکا تھا۔ حلیمہ آنٹی نے بہارے کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا قرآن سامنے کیے' تعوذ پڑھ کر اپنا سبق پڑھنے لگی۔

"اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے' جس میں چراغ ہیں۔

چراغ فانوس میں ہے۔

فانوس گویا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔

وہ ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن کیا جاتا ہے۔

نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی۔

قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔

اور اگرچہ اسے آگ بھی نہ چھوئی ہو۔

نور ہے اوپر نور کے۔

اللہ اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے' جسے وہ چاہتا ہے....."

لان میں ایک دم بہت سی روشنی اتر آئی تھی۔ جیسے چمکتا چاند پورے افق پہ چھا گیا ہو۔ جیسے سونے کے پتنگے ہر سو آہستہ آہستہ نیچے گر رہے ہوں۔ جیسے نیلا آسمان سنہری قندیلوں سے جگمگا اٹھا ہو۔ وہ اس طلسم میں گھری سحرزدہ سی ہوئی سنے جا رہی تھی۔

بہارے پڑھ رہی تھی۔

"اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا.....

ان کے اعمال ایک چٹیل میدان میں سراب کی مانند ہیں۔

پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔

حتیٰ کہ جب وہ اس کے قریب آتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں پاتا۔

اور وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے۔

پھر اللہ اس کو اس کا پورا پورا حساب دیتا ہے۔

اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

نیلا آسمان ان دیکھی مشعلوں سے روشن تھا۔ چاندی کی مشعلیں وہاں روشن نہیں تھیں' مگر وہاں روشنی تھی۔ نور تھا اوپر نور کے۔

"یا ان کی مثال سمندر کے گہرے اندھیروں کی مانند ہے۔

پھر اسے ایک لہر ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے اوپر

ایک اور لہر۔ اس کے اوپر بادل۔ ان میں سے بعض کے اوپر بعض اندھیرے ہیں۔ اتنا اندھیرا کہ جب وہ شخص اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔
اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور۔
تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!"

بہارے اپنا سبق ختم کر چکی تھی۔ دور مرمرا کی لہریں کناروں پر سر پٹخ پٹخ کر پلٹ رہی تھیں واپس اپنے اندھیروں میں۔ کلاس کا وقت ختم ہوا تو سحر ٹوٹا۔ قندیلیں غائب ہو گئیں۔ صبح کی روشنی میں آسمان کے چراغ چھپ گئے۔

بچے اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ حلیمہ آنٹی ان کی طرف ہی آ رہی تھیں۔ مگر وہ اپنی جگہ سن سی بیٹھی کہیں بہت اندر گم تھی۔ اپنی ذات کے اندھیروں میں۔

اندھیری لہر کے اوپر ایک اور لہر اور اس کے اوپر غم کے بادل۔ اتنا اندھیرا کہ مشکلوں کا سرا سجھائی نہ دیتا تھا اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور' تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!

وہ بالکل چپ سی اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہوٹل گرینڈ بیوک ادا کے ایک نسبتاً" ویران ساحل کے قریب واقع تھا۔ جزیرے کے بازار کے رش اور سیاحوں کے شور و ہنگامے سے دور وہ ایک بہت پرسکون سی جگہ تھی۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی کھڑکیوں سے مرمرا کا سمندر بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ وہ ادا کا سب سے بڑا' سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔

"دیمت فردوس" پچھلے ساڑھے تین سال سے ہوٹل کے مالک کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ اس کا عہدہ ساڑھے تین برس میں وہی رہا تھا' البتہ اس کا باس ایک دفعہ ضرور بدلا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ ازمیر (ترکی کا ایک شہر) چھوڑ کر استنبول آئی تھی اور کئی جگہ نوکری کے لیے دھکے کھانے کے بعد اسے استنبول سے دور اس جزیرے پہ یہ جاب ملی تھی' تب دیمت کا باس عبدالرحمٰن پاشا نہیں تھا۔ اس وقت وہ اس کے چھوٹے بھائی کی سیکریٹری تھی' مگر ان پچھلے تین برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس نرم سی صبح میں اپنے ڈیسک کی کرسی سنبھالتے' پرس اتار کر میز پہ رکھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ہوٹل گرینڈ اب بہت بدل گیا تھا۔ اس کا پچھلا باس بہت خوش خلق اور سادہ لوح سا آدمی تھا۔ ایسا آدمی جس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ وہ ہوٹل کا مالک ہونے کے باوجود اکثر نیچے ریسٹورنٹ کے کچن میں کام کرتا پایا جاتا تھا۔ اس کے عام سے چلنے کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص بیوک ادا کے رئیسوں میں سے ہے۔ پھر وقت بدلتا گیا۔ دیمت عبدالرحمٰن پاشا کو پہلے کبھی کبھار اور پھر اکثر ہوٹل میں اپنے بھائی کے ساتھ آتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کا آہستہ آہستہ ہوٹل کا کنٹرول اور وہ آفس عبدالرحمٰن کی دسترس میں چلا گیا۔ عبدالرحمٰن نے کیسے سب کچھ اپنے قابو میں کیا کہ کوئی چوں بھی نہ کر سکا' اور اس کا بھائی کہاں چلا گیا' وہ کبھی نہیں جان سکی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری ہو کر بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کو نہیں پاٹ سکی تھی۔ اسے عبدالرحمٰن کے سوائے چھوٹے موٹے دفتری کاموں کے علاوہ کچھ بھی کرنے کو نہیں دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی دیمت کو شک گزرتا کہ اے آر پی نے اپنی کوئی اور سیکریٹری رکھی ہوئی ہو گی' جو اس کے معمولات سے باخبر ہو گی' ورنہ اس کے پاور آفس میں کیا ہوتا ہے' وہ اس سے قطعاً" بے خبر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پچھلے چند ماہ میں اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہوٹل گرینڈ میں کچھ اور بھی ہو رہا ہے' کچھ ایسا' جو غلط تھا۔ کچھ ایسا جو ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناتے اسے کبھی ہونے نہیں دینا چاہیے تھا' مگر کیا... وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور کھوج لگانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

اپنی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے اس نے یونہی ایک سرسری سی نگاہ سامنے... اس بند دروازے پہ ڈالی' جس پہ اے آر پاشا کی تختی لگی تھی' اور ٹھٹک کر رک گئی۔

دروازے کی نچلی درز سے روشنی جھانک رہی تھی۔ کیا عبدالرحمٰن واپس آگیا ہے؟ کب؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

وہ خوش گوار حیرت میں گھری جلدی جلدی اپنی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ دنیا چاہے جو بھی کہے' وہ عبدالرحمٰن پاشا کی سب سے بڑی پرستار تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا سحر انگیز اور شان دار آدمی نہیں دیکھا تھا۔ بات ہینڈسم ہونے یا نہ ہونے کی نہیں تھی۔ بات اس وقار اور مقناطیسیت کی تھی' جو اس آدمی کی شخصیت کا خاصا تھی۔

اسی لمحے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

"یس سر؟"

"دیمت! برنگ می اے کافی!" اپنے بھاری بارعب انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر نہایت مستعدی سے کافی تیار کرنے لگی۔ اس کا باس تین ماہ بعد انڈیا سے لوٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

کافی کی ٹرے اٹھائے' اس نے دروازہ ذرا سا بجا کر کھولا۔

عبدالرحمٰن پاشا کا آفس نہایت شان دار اور پرتعیش انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ اپنی شیشے کی چمکتی سطح والی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ ٹیک لگا کر بیٹھا' وہ کھڑکی سے باہر پرسوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سگریٹ لبوں میں دبائے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی شیو میں وہ پہلے سے زیادہ باوقار لگ رہا تھا۔ دنیا کو وہ اچھا لگے یا برا' دیمت کو اس جیسا کوئی نہیں لگتا تھا۔

اس نے کافی میز پہ رکھی۔ "السلام علیکم سر اینڈ ویلکم بیک۔" وہ مسکرا کر اپنے باس کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

"ہوں تھینکس!" عبدالرحمٰن نے ایک سرسری نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر آگے ہوتے ہوئے سگریٹ انگلیوں میں پکڑ کر ایش ٹرے میں جھٹکا۔ وہاں راکھ کے بہت سے ٹکڑوں کے اوپر ایک اور ٹکڑا آن گرا۔ پاشا کے متعلق ایک بات وہ جانتی تھی' وہ اتنی بے تحاشا اسموکنگ شدید پریشانی و تفکر کے عالم میں کیا کرتا تھا۔

"سر! آپ کچھ اور لیں گے؟" وہ مؤدب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"میرے کوٹ پہ داغ لگ گیا ہے' اسے صاف کرلاؤ۔" اس نے میز کے دوسری جانب رکھی کرسی کے کندھوں پہ ڈلے کوٹ کی جانب اشارہ کیا۔ خود وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے' گرے شرٹ کے کف کھولے بیٹھا تھا۔ اس کا لباس بھی اس کی شخصیت کی طرح ہوتا تھا۔ نفیس اور شان دار۔

"جی سر!" دیمت نے احتیاط سے کوٹ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد جب وہ سیاہی کا دھبہ صاف کر کے لائی تو پاشا کا آفس سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ اس کی کافی جوں کی توں رکھی تھی' البتہ ایش ٹرے میں راکھ کے ٹکڑے بڑھ چکے تھے۔

"سر! سب ٹھیک تو ہے نا؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے صرف پیشہ ورانہ تکلف میں نہیں بلکہ دلی تفکر کے باعث پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ جواباً" وہ اسے نو تھینکس کہہ کر واپس جانے کو کہے گا۔ وہ اپنے معاملات کسی سے شیئر نہیں کرتا تھا۔

"ہوں۔ بیٹھو!" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اس ہاتھ میں دو سونے کی قیمتی انگوٹھیاں تھیں جو وہ ہمیشہ پہنے رکھتا تھا۔ دیمت حیرت چھپاتی بیٹھ گئی۔

"دیمت!" وہ سگریٹ کے کش لیتے' کھڑکی کے باہر ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا تو اس کا لہجہ بے لچک اور سرد تھا۔

"کسی غیر ملکی کو ترکی سے واپس بھیجنا ہو تو کیا کیا جائے؟"

(اتنی سی بات؟)

"سر! کوئی غیر ملکی اگر ترکی میں رہ رہا ہو تو وہ یقیناً" کسی وجہ سے رہ رہا ہوتا ہے۔ اسے جس چیز کی کشش ترکی میں نظر آ رہی ہو' اس چیز کو ختم کر دینا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کشش کسی انسان کی ہو' مثلاً" ہزبینڈ کی تو...؟"

"تب اس کشش کو ختم کرنا چاہیے۔"

"اور وہ کیسے؟" عبدالرحمٰن نے ذرا مسکرا کر اسے محظوظ انداز میں دیکھا۔

"سر! کوئی عورت اپنے شوہر کو صرف تب چھوڑتی ہے۔ جب اسے یہ لگتا ہے کہ اس کے شوہر نے اسے دھوکا دیا ہے۔ شدید بدگمان ہوئے بغیر عورت اپنے شوہر کو کبھی نہیں چھوڑتی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کوئی اس عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بہکائے؟ اونہوں!" اس نے ناگواری سے سر ذرا سا جھٹکا۔ "وہ کیوں کسی کی بات پہ یقین کرے گی؟"

"جی سر! وہ کسی دوسرے کی بات پہ یقین نہیں کرے گی، وہ صرف اپنے شوہر کی بات یقین کرے گی۔"

"اور کوئی شوہر اپنے دھوکے یا اپنی بداعمالیوں کی داستان اپنے منہ سے اپنی بیوی کو کیوں سنائے گا؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہ سب اپنی بیوی کو کہے۔" اب کے ویمت ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ "وہ یہ سب کسی اور سے کہے گا، اور اگر ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو اس کی بیوی اس کے علم میں لائے بغیر اس کی باتیں سن لے گی۔ ایک معصوم سا اتفاق۔" بات ختم کر کے ویمت نے ذرا سے شانے اچکائے۔

عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں ایک چمک در آئی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینکا اور ذرا آگے ہو کر بیٹھا۔

"مگر ویمت! کوئی آدمی کسی دوسرے کے بھی سامنے اپنے کسی بدعمل کا ذکر کیوں کرے گا؟"

"میں نے کہا نا سر! ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو سب ٹھیک رہے گا۔ وہ آدمی اپنے بدعمل کی داستان نہیں سنائے گا۔ وہ عمل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں، جو کسی کو ہیرو بنا دیتے ہیں لیکن اگر سیاق و سباق کے بغیر پیش کیے جائیں تو وہ ہیرو کو ولن بھی بنا دیتے ہیں۔"

عبدالرحمٰن پاشا کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پہ چھائی فکر غائب ہو رہی تھی۔

"ویمت! جو کام میں پچھلے پانچ مہینوں میں نہیں کر سکا، وہ تم نے پانچ منٹ میں کر دکھایا ہے۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ واقعتاً اس کا بہت ممنون تھا۔

ویمت کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ بہت مسرت سے اٹھی تھی۔ گو کہ اندر سے وہ جانتی تھی کہ عبدالرحمٰن کسی بیوی کو اس کے شوہر سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ غلط کام تھا، مگر عبدالرحمٰن کا تشکر ہر شے پہ چھانے لگا۔

"تمہارا شوہر کیسا ہے؟ ابھی تک وینٹی لیٹر پہ ہے؟"

"جی سر!" کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے مغموم انداز میں بتایا۔ ایک حادثے کے بعد اس کا شوہر کچھ عرصے سے وینٹی لیٹر پہ تھا، اور یہ پورا ہوٹل گرینڈ جانتا تھا۔

"ایڈوانس سیلری چاہیے ہو تو بتا دینا۔"

"تھینک یو سر!" وہ پورے دل سے مسکرائی۔ عبدالرحمٰن اسے "لالچ" دے رہا تھا۔ یہ اس کے مشورے کا انعام تھا۔ وہ بہت فرحت سے واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔

"تمہارا ہیئر اسٹائل اچھا ہے ویمت!"

عبدالرحمٰن نے اس کے عقب میں پکارا تھا۔ اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ بہت الجھن سے واپس پلٹی۔ عبدالرحمٰن اب ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ بظاہر اس کی طرف متوجہ نہ تھا، مگر اس نے یہ بات کیوں کہی؟ پچھلے تین برسوں میں تو اسے کبھی ویمت کے بالوں کا خیال نہیں آیا تھا، نہ ہی وہ عورتوں سے شغف رکھنے والا بندہ تھا۔ پھر اس نے یہ کیوں کہا؟

"تھینک... تھینک یو سر!" وہ ذرا تذبذب سے بولی۔

"ویسے تمہارا پچھلا ہیئر اسٹائل بھی اچھا تھا۔"

"پچھلا؟" اس نے بہت الجھ کر اپنے باس کو دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ ویمت نے تو پچھلے تین برسوں میں سوائے اس کٹنگ کے، دوسری کوئی کٹنگ نہیں کرائی تھی۔

"ہاں، جو انتالیہ کے ساحل پہ تھا۔ تم پہ گھنگھریالے سرخ بال اچھے لگتے ہیں۔" وہ فائل کی طرف متوجہ بہت سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔

ویمت کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ وہ پتھر کا بت بنی رہ گئی۔ ایک دم کمرے میں گھٹن بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدقت تمام باہر نکلی اور اپنی کرسی پہ ڈھے سی گئی۔

انتالیہ کا ساحل، سرخ گھنگھریالے بال... چھ سال پہلے اس نے ایک ایکس ریٹ میگزین کے لیے ماڈلنگ کی تھی۔ وہ بدنام زمانہ میگزین صرف انتالیہ میں چھپتا تھا اور وہاں سے باہر نہیں جایا کرتا تھا مگر... مگر تب اسے پیسے چاہیے تھے، اور وہ نشے میں تھی۔ بعد میں وہ شرمندہ تھی۔ اس نے وہ شہر، وہ جگہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خاندان، اس کے دوستوں، کبھی کسی کو اس میگزین کی ان چند کلپس کا علم تک نہیں ہوا تھا۔ وہ میگزین تو شاید اب ردی کا ڈھیر بن کر اس دنیا سے ہی غائب ہو گیا ہو۔ تو پھر عبدالرحمٰن پاشا کو کیسے پتا چلا؟

وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ اس کی بے لچک آواز کی دھمکی وہ سمجھتی تھی۔ اگر اس نے یہ گفتگو کسی کے سامنے دہرائی تو وہ میگزین منظر عام پہ آ جائے گا اور... اور اس کا گھر، بچے، زندگی سب تباہ ہو جائے گا۔

اس نے چہرہ اٹھا کر بے بس متنفر نگاہوں سے اے آر پی کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

"بلیک میلر!" اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے تھے۔ اسے آج علم ہوا تھا کہ عبدالرحمٰن پاشا نے کیسے ہر شے کو اپنے قابو میں کیا تھا۔

بند دروازے کے اس پار وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا قیمتی موبائل تھا، جس میں وہ کوئی نمبر ڈھونڈ رہا تھا، ایک نمبر پہ آ کر اس کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ نمبر اس نے انگریزی میں "Dearest Brother" کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اب اس نمبر پہ رابطہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اگر ہر چیز ویسے ہی ہوتی جائے جیسے وہ سوچ رہا تھا تو... اس نے مسکرا کر اس نمبر کو دیکھا اور پھر اس کے نام پیغام لکھنے لگا۔

"میں انڈیا سے واپس بیوک ادا آ چکا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟"

پیغام جانے کے پورے ڈیڑھ منٹ بعد اسی نمبر سے جواب آیا تھا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ پیغام پڑھتے ہوئے محظوظ سے انداز میں ہنس پڑا۔ پھر مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے جوابی پیغام لکھنے لگا۔

"میں جہنم میں بعد میں جاؤں گا، پہلے تم سے تو مل لوں۔ تم ہوٹل گرینڈ آؤ گے یا میں استقلال اسٹریٹ میں برگر کنگ پہ آ جاؤں؟"

سینڈ کا بٹن دباتے وقت وہ جانتا تھا کہ اس کے برادر ڈیرسٹ کا جواب ان دونوں جگہوں میں سے ہی کوئی ہو گا۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس نے آج تک عبدالرحمٰن کو "نہ" نہیں کی تھی۔ وہ اسے "نہ" کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

حیا اس صبح جب حلیمہ آنٹی کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو اس کے موبائل پہ جہان کا پیغام آیا تھا۔ بگھی سے اترتے ہوئے اس نے پیغام کھول کر پڑھا۔

"سنو! میں ابھی ذرا کام سے بیوک ادا آ رہا ہوں۔ دوپہر میں ملتے ہیں۔ لنچ ساتھ کریں گے ٹھیک!"

حیا نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ صبح کے سات بجے تھے۔ اگر وہ ابھی چلا ہو تو آٹھ، ساڑھے آٹھ تک پہنچ جائے گا، پھر وہ دوپہر تک بیوک ادا میں کیا کرے گا؟ اس کا کب سے اس جزیرے میں کوئی کام ہونے لگا؟

وہ الجھتی اندر آئی تھی۔

بیگ بیڈ پہ رکھتے ہوئے اس نے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ نمبر بزی جا رہا تھا۔ اس نے فون رکھا اور چوکھٹ میں آکھڑی ہوئی۔ سامنے عائشے اور بہارے اپنی چیزیں اکٹھی کرتی نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے اب جنگل جانا تھا۔

"آج میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گی عائشے! جہان آرہا ہے۔" وہ ذرا الجھی الجھی سی بتارہی تھی۔

"شیور!" عائشے نے سمجھ کر سرہلادیا اور تھیلا لیے باہر چلی گئی۔ پھر آٹھ بجے کے قریب وہ سنگھار میز کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جہان آرہا تھا' اسے ڈھنگ سے تیار ہوجانا چاہیے۔ اس نے ہلکے ہلکے نم بالوں میں برش پھیرا' پھر ایک دراز سے وہ تھیلی نکالی جس میں اس کا تیسرا موتی رکھا تھا۔ بہارے کی سلور چین میں اس نے وہ موتی ویسے ہی پرو دیا جیسے وہ دونوں بہنیں پروتی تھیں اور چین گردن سے لگا کر دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ہک بند کیا۔ تنگ زنجیر گردن سے چپک گئی تھی اور درمیان میں اٹکا موتی مزید چمکنے لگا تھا۔

اب اس نے پھر سے جہان کا نمبر ملایا' گھنٹی جا رہی تھی۔

"ہیلو؟" جہان بولا تو پیچھے بازار کا مخصوص شور تھا۔

"جہان تم پہنچ گئے؟"

"ہاں' میں تم سے دوپہر میں ملتا ہوں۔"

"تو تم دوپہر تک کیا کرو گے ادھر؟"

"میں وہ....." وہ ذرا رکا۔ "میں ایک دوست سے ملنے آیا تھا' ابھی اس کے پاس جارہا ہوں۔"

"کون سا دوست؟" الجھنے سے پوچھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جہان نے سوائے علی کرامت اور اس کی ماں کے' کبھی اپنے دوستوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی دوست نہیں تھا یا وہ اپنے دوستوں کا ذکر مستور رکھتا تھا؟

"ہے کوئی' تم نہیں جانتیں۔ اچھا۔ میں فارغ ہوکر کال کرتا ہوں۔" وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

"اوکے!" اس نے فون کان سے ہٹایا' پھر سوچا کہ لنچ پر ـــ ہی پوچھ لے گی کیونکہ وہ جہان کو ـــ اس سفید محل میں نہیں بلانا چاہتی تھی۔ سو جلدی سے فون کان سے لگا کر "ہیلو جہان؟" کہا کہ مبادا اس نے فون بند نہ کردیا ہو۔

جہان بھی فون بند کرنے کے بجائے کان سے ہٹا کر دوسری طرف کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے یقیناً" حیا کا ہیلو نہیں سنا تھا۔ وہ ترکی میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"کوئی مبہم سا فقرہ جس میں حیا کو صرف "اوتل گریند" سمجھ میں آیا تھا۔ ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

"اوتل گریند؟ یعنی ہوٹل گرینڈ؟ جہان نے ہوٹل گرینڈ کا ذکر کیا؟ یعنی وہ ہوٹل گرینڈ جارہا تھا؟" وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوگئی۔ کیا جہان کو علم نہیں کہ وہ عبدالرحمن پاشا کا ہوٹل ہے اور پاشا تو اب بیوک ادا واپس آگیا ہے۔" لوگ عموماً" ریسٹورانٹس میں ہی ملتے ہیں' اس لیے اس نے یقیناً" اپنے دوست کو وہی مقام بتادیا ہوگا۔ اور جہان تو سرے سے کسی عبدالرحمن پاشا کو نہیں مانتا تھا۔ پھر؟

"اچھا چھوڑو سب۔ دوپہر میں اس سے ملنا تو پوچھ لینا۔"

سارے خیالات ذہن سے جھٹکتی' وہ پزل باکس لے کر اٹھی اور اسٹڈی میں آبیٹھی۔ کچھ دیر تو وہ باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی' پھر ایک دم ایک نہج پہ پہنچ کر وہ باکس میز پہ رکھ کر اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ زرد لمبے فراک پہ اس نے بھورا اسٹول شانوں کے گرد سختی سے لپیٹ لیا' بال یونہی کھلے رہنے دیے اور پرس میں کالی مرچ کا اسپرے رکھ کر وہ باہر نکل آئی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اب جب تک جہان کو اور ہوٹل گرینڈ کو دیکھ نہیں لے گی' اسے بے چینی رہے گی' اب چاہے اس کے لیے اسے تنہا کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ ویسے بھی جزیرہ چھوٹا سا تھا۔ ہوٹل گرینڈ اور اس کی عقبی پھولوں کی مارکیٹ اس محل سے قریباً" پندرہ منٹ کی ہارس رائیڈ پہ تھی۔ مگر بندرگاہ سے اس

جگہ کا فاصلہ پانچ دس منٹ اوپر تھا۔

"کیا تم مجھے دس منٹ میں پھولوں کی مارکیٹ پہنچا سکتے ہو؟" اس نے پانچ لیرا کے دو کڑکڑاتے نوٹ بگھی بان کے سامنے کرکے سنجیدگی سے پوچھا۔ بگھی بان نے ایک نظر نوٹوں کو دیکھا اور دوسری نظر اس پہ ڈالی۔

"شیور!" اگلے ہی لمحے اس کی بگھی کے دونوں گھوڑے پتھریلی سڑک پہ دوڑ رہے تھے۔

وہ ایک لمبی' سیدھی سڑک تھی جو دو رویہ درختوں سے گھری تھی اور اس کے آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی بلندوبالا عمارت کھڑی تھی۔ عمارت کے پیچھے ساحل تھا گو وہ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ عمارت پوری کالونی میں ممتاز دکھتی کیونکہ آس پاس چھوٹے موٹے کیفے تھے یا پھر پھولوں کی دکانیں۔ پھولوں کی مارکیٹ یہاں سے شروع ہوکر ہوٹل کے عقب میں پچھلی گلی تک پھیلی تھی۔

وہ پھولوں کے ایک اسٹال پہ جا کھڑی ہوئی اور یونہی بے توجہی سے پھول اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ بے چین نگاہیں بار بار اٹھ کر ہوٹل کے دروازے کا طواف کرتیں۔ پتا نہیں جہان نے آنا بھی تھا یا اس نے یونہی اس ہوٹل کا تذکرہ کیا تھا؟

تب ہی گلی کے سرے پہ ایک بگھی رکتی دکھائی دی۔ اس میں سے نیچے اترنے والا بلاشبہ جہان ہی تھا۔ اس نے سر پہ سرخ پی کیپ لے رکھی تھی اور اب وہ والٹ سے پیسے نکال کر بگھی بان کو دے رہا تھا۔

حیا جلدی سے ایک اونچے شیلف کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جس پہ گملے رکھے تھے۔ گملوں اور پھولوں کی جھکی ٹہنیوں کی درمیانی درزوں سے اسے وہ منظر نظر آرہا تھا۔

پیسے دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ اب ہوٹل کی مخالف سمت میں سر جھکائے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جارہا تھا۔ اس کا رخ ہوٹل کی عقبی گلی کی جانب تھا۔

"بے چارا آیا ہوگا کسی دوست سے ملنے' وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے؟ وہ کیوں اس کا تعاقب کررہی ہے؟" اس نے جھنجلا کر خود کو کوسا۔ جہان کے آس پاس سڑک پہ بہت سے لوگ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔ وہ بھی اس ریلے کے پیچھے چل دی۔ اب جہان کو پکارنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بس وہ کہیں کسی کیفے میں چلا جائے' تو وہ واپس چلی جائے گی۔

گلی کے دوراہے پہ پھولوں کا ایک بڑا سا اسٹال لگا تھا۔ وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ایک فلورل میگزین اٹھا کر چہرے کے سامنے کرلیا۔ میگزین کے اطراف سے اسے گلی کا عقبی حصہ نظر آرہا تھا' جہاں دور آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی پشت تھی۔ وہاں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ پارکنگ لاٹ بنا تھا اور مستعد گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ یقیناً" وہ ہوٹل کے مالکان کے لیے تھا اور یقیناً" وہاں پر کوئی پرائیویٹ لفٹ بھی ہوگی جو ہوٹل کے اعلیٰ عہدیداران کو ڈائریکٹ اپنے فلور تک پہنچادیتی ہوگی۔

اس نے میگزین کے کور کا کنارہ ذرا سا موڑ کر دیکھا۔ جہان اسی طرح سر جھکائے چلتا ہوا سامنے جارہا تھا۔ ہوٹل گرینڈ کی عقبی طرف۔

سیلز مین اب اس سے "کیا چاہیے؟" پوچھ رہا تھا۔

"ٹیولپس..... سبز رنگ کا ٹیولپ مل سکتا ہے؟" اس نے اردگرد ٹیولپ کے پھولوں کو دیکھتے ہوئے وہ رنگ پوچھا جو استنبول کیا کرہ ارض پہ بھی شاید ہی ملتا۔ اس کے خیال میں!

"سبز رنگ کا ٹیولپ؟" دکان دار ذرا حیران ہوا پھر بولا "مل جائے گا۔"

"اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں ٹیولپس استنبول میں؟ جہاں دیکھو' ٹیولپس ہی نظر آتے ہیں۔" اس نے جلدی سے دوسرا سوال جھاڑا۔ کن انکھیوں سے اسے جہان اب پارکنگ لاٹ تک پہنچتا نظر آرہا تھا۔ وہاں رک کر اس نے والٹ نکال کر گارڈ کو کچھ دکھایا' شاید اپنا آئی ڈی کارڈ۔ نفی میں سر ہلا کر جواباً" کچھ کہہ رہا تھا۔

"ٹیولپس تو استنبول کا سمبل ہیں۔ کیا آپ نے ٹیولپ فیسٹیول کے بارے میں....."

دکان دار جوش و خروش سے اسے فیسٹول کے بارے میں بتانے لگا۔ جس میں اسے قطعاً" کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بظاہر سر ہلا کر سنتی، گاہے بگاہے ایک نگاہ ہوٹل کے عقبی پارکنگ لاٹ پہ ڈال لیتی، جہاں وہ ابھی تک کھڑا گارڈ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ واپس پلٹا، حیا اسٹول پہ بیٹھ کر میگزین چہرے کے سامنے کیے پھولوں میں کیموفلاج ہوئی بیٹھی تھی۔ اب بس جہان چلا جائے تو وہ بھی خاموشی سے نکل جائے گی۔

کسی نے نرمی سے میگزین اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین اس کے سامنے کرتے ہیں تو اس کو الٹا نہیں پکڑتے۔"

عین اس کے سر پہ کھڑے جہان سکندر نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میگزین سیدھا کر کے اسے تھمایا۔

اگر زمین میں گڑ جانے سے زیادہ مبالغہ آمیز محاورہ ہوتا تو وہ اس وقت حیا سلیمان پہ صادق اترتا۔

وہ قدرے بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

"اوہ..... تم، تم ادھر کیا کر رہے ہو؟"

جواباً" جہان نے مسکراہٹ دبائے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"نہیں، بلکہ، میں..... میں ادھر کیا کر رہی ہوں۔" وہ ذرا خفت سے مسکرائی۔

"میں ایک کام سے آیا تھا اور تم شاید میرے پیچھے۔" وہ مسکرا کر بولا، مگر اس کا چہرہ ذرا ستا ہوا لگ رہا تھا۔

"نہیں، تمہارے پیچھے کیوں، میں بھی ایک کام سے آئی تھی۔" وہ سنبھل کر مسکرا کر بولی، البتہ دل ابھی تک یونہی دھک دھک کر رہا تھا۔

"واقعی؟"

"ہاں، میں اس علاقے پہ ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں۔ ہالے کی ایک جرنلسٹ دوست کے لیے۔ بہت دلچسپ ہے۔"

جہان نے جواباً" نگاہیں جھکا کر اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

"اور تم کاغذ کے بغیر ہی رپورٹ لکھتی ہو؟"

"یہ نوٹ بک کہاں گئی؟ اوہ یہ رکھی ہے۔ اس نے اب بہت اطمینان سے اسٹال کے اس طرف دکان کے کاؤنٹر پہ رکھی نوٹ بک اٹھائی اور اسے سینے سے لگا کر بازو لپیٹتے ہوئے مسکرا کر جہان کو دیکھا۔ جہان نے گردن موڑ کر دکان دار کو دیکھا۔ دکاندار نے ایک قلم میز سے اٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کا قلم! کیا میرے انٹرویو کے ساتھ میری تصویر بھی چھپے گی؟" ترک دکان دار نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

"کوشش کروں گی!" اس نے مسکراہٹ دبائے سر ہلا دیا۔ جہان شانے اچکا کر پلٹ گیا تو اس نے ایک ممنون نگاہ دکان دار پہ ڈالی جو جواباً" مسکرا دیا تھا۔ وہ جلدی سے جہان کے پیچھے لپکی۔

"مل لیے دوست سے؟"

"نہیں۔ بعد میں ملوں گا۔ سلیمان ماموں پرسوں استنبول آ رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے؟" وہ دونوں ساتھ ساتھ جزیرے کی ایک گلی میں چل رہے تھے جب جہان نے بتایا۔

"ہوں، معلوم ہے۔ اس لیے آج میں تمہارے ساتھ واپس چلی جاؤں گی۔" اس نے ابھی ابھی کا ترتیب دیا ہوا پروگرام بتایا۔ ابا نے جب اپنے کاروباری ٹرپ کا ذکر کیا تھا تو اس نے استنبول واپس جانے کا تہیہ کر لیا تھا، اب جہان کے آنے سے آسانی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ چھٹیاں وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

"عیسیٰ کی پہاڑی کس طرف تھی؟"

جب سڑک ختم ہو گئی اور وہ پہاڑی راستے پر چڑھنے لگے تو جہان ایک جگہ رک گیا اور ذرا متذبذب انداز میں دو مخالف سمتوں میں جانے والے پہاڑی راستوں کو دیکھا۔

"یہ کیسے ہو گیا کہ جہان سکندر کو اپنے ترکی کے راستے بھول گئے؟" وہ ذرا جتا کر مسکراتی ایک سمت

اوپر چڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا سے اڑتی شال کو اس نے سختی سے شانوں کے گرد لپیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔

"جہان سکندر جب بیوک ادا تمہارے اور ڈی جے کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت وہ دو سال بعد ادھر آیا تھا۔"

"اور مجھے یاد ہے، تب بھی ڈی جے کے فون کرنے پہ تم بمشکل راضی ہوئے تھے۔"

"اوہ تم اس وقت ڈی جے کے ساتھ بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں؟ مجھے تو ڈی جے نے بتایا تھا کہ تم مصروف ہو۔" وہ اس کے پیچھے پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

"اس نے بعد میں بتایا تھا۔"

وہ مڑی نہیں، مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ جہان کو اتنی پرانی بات اتنی جزئیات سے یاد تھی۔

عیسیٰ تیپی (عیسیٰ کی پہاڑی) کی چوٹی پہ وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے پہنچ ہی گئے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی کسی سرسبز لان کی طرح چپٹی اور گھاس سے ڈھکی تھی۔ وہاں فاصلے فاصلے پہ بہت اونچے درخت لگے تھے یوں جیسے کسی یونیورسٹی کیمپس کا لان ہو۔ دور دور ٹولیوں میں لوگ بیٹھے تھے۔

ایک طرف ایک چوکور بلاک کی مانند لکڑی کی عظیم الشان قدیم عمارت تھی۔ وہ ایک خستہ حال، قدیم یونانی یتیم خانہ تھا جس کو دیکھنے لوگ دور دور سے Hill Jesus (عیسیٰ کی پہاڑی) پہ آتے تھے۔

وہ دونوں ایک درخت تلے آ بیٹھے۔ حیا نے تنے سے ٹیک لگا لی، جبکہ جہان اس کے قریب ہی کہنی کے بل گھاس پہ نیم دراز ہو گیا۔ اسے بے اختیار توپ کپی کے عقبی برآمدے کا منظر یاد آیا جب وہ دونوں اسی طرح بیٹھے تھے۔ لمحے جزیرے کی ہواؤں سے پھسلتے، لکڑی کی قدیم عمارت پہ گر رہے تھے گویا بارش کے ان دیکھے قطرے ہوں۔

عمارت کے قریب چند لڑکے گھاس سے ہٹ کر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ الاؤ سے آگ کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

"جہان..... کبھی تم نے اپنی جلد پہ جلنے کا زخم محسوس کیا ہے؟" وہ دور اس الاؤ کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

"غریب شیف دن میں کئی بار ہاتھ جلاتا ہے مادام!"

اس نے ایک نگاہ جہان پہ ڈالی۔ اس نے سوال ضائع کیا تھا۔ یہ بات اسے میجر احمد سے پوچھنی چاہیے تھی۔ اس نے سوال غلط بندے سے کیا تھا۔

"تم ہر وقت اپنے آپ کو اتنا غریب کیوں کہتے ہو؟" لمحے بھر کو اسے جہان پہ بے طرح غصہ آیا تھا۔ استقلال اسٹریٹ میں تمہارا ریسٹورنٹ ہے؟ جہانگیر میں تمہارا گھر ہے، اور جس روز ہم پاکستان سے آئے تھے، میں نے دیکھا تھا ——— ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی gadget تمہارے کمرے میں رکھا تھا۔ اب وہ سب تو تمہیں گفٹ نہیں ملے تھے نا۔"

"تم زخم کی بات کر رہی تھیں۔ تمہاری گردن کا زخم ٹھیک ہوا؟" وہ بغیر شرمندہ ہوئے بہت ڈھٹائی سے موضوع بدل گیا۔

"میرے زخم بہت سے ہیں، میں نے ان کا شمار چھوڑ دیا ہے۔" وہ ذرا تلخی سے کہتی رخ موڑ کر قدیم خستہ حال عمارت کو دیکھنے لگی۔ حرکت کرنے سے اس کے کان کی بالی میں موجود موتی ہلنے لگا تھا۔ مگر جہاں کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ یہ موتی اس نے حیا کو دیا تھا۔

"تمہاری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟" وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا جیسے اسے ابھی تک یقین نہیں ہو کہ حیا "اتفاق" سے پھولوں کی مارکیٹ میں تھی۔

"بہت دور تک..... سننا چاہو گے؟"

"ہاں تم نے اس بے چارے دکان دار سے پھولوں کے متعلق کون سا راز اگلوایا ذرا میں بھی تو سنوں۔" وہ کہنی کے بل ذرا اوپر کو ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں پھولوں کے متعلق نہیں عبدالرحمٰن پاشا، اس کے گمشدہ بھائی اور ہوٹل گرینڈ کے متعلق رپورٹ لکھ رہی ہوں!"

اور زندگی میں پہلی بار اس نے جہان کے چہرے سے رنگ اڑتا دیکھا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"تم مذاق کر رہی ہو؟"

"نہیں، مگر اب تم یہ مت کہنا کہ استنبول میں عبدالرحمٰن پاشا نامی کوئی بندہ نہیں ہے۔ وہ ہے اور وہ ہوٹل گرینڈ کا مالک ہے۔ لیکن تم جانتے ہو اس ہوٹل کا اصل مالک کون تھا؟"

جہان نے جواباً "سوال نہیں کیا، وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس کا چھوٹا بھائی۔ عبدالرحمٰن کا ایک چھوٹا بھائی تھا، جو اچانک ڈیڑھ دو سال قبل منظرِ عام سے غائب ہو گیا۔ اگر آج وہ ادھر ہوتا تو عبدالرحمٰن پاشا اتنا مضبوط اور ناقابل شکست نہ بنا بیٹھا ہوتا۔ میں وہ وجہ تلاش کر رہی ہوں، جس کے باعث اس کا بھائی یوں روپوش ہوا ہے۔"

"تم یہ سب جان کر کیا کرو گی؟" وہ بہت الجھن سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں یہ اسٹوری ہالے کو دوں گی، اور وہ اپنی صحافی دوست کو۔ یوں معصوم سی یہ کہانی اخبار میں چھپے گی اور اگر یہ چیز ایک دفعہ میڈیا کے ہاتھ لگ جائے تو پریشر کے باعث یا تو عبدالرحمٰن اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالے گا یا میڈیا۔" وہ بہت جوش سے بولتی جا رہی تھی۔

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو کوئی پہلے ہی کر چکا ہوتا اور تم..... تم اس کے بھائی کو منظرِ عام پہ لا کر کیا کرو گی؟"

"میں چاہتی ہوں کہ لوگ اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ عبدالرحمٰن پاشا کسی Voldemort Lord کا نام ہے۔ تم یقین کرو جہان! میں نے جتنی اس معاملے پہ تحقیق کی ہے، اتنا ہی مجھے اندازہ ہوا ہے کہ پاشا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک جعلی پروپیگنڈا مہم ہے۔ بعض لوگ خود کو طاقت ور کہلا کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ میں قانون پڑھ رہی ہوں، مجھے ان باریکیوں کا پتا ہے۔"

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ تم قانون پڑھ رہی ہو، ورنہ میں تو اب تک بھول ہی چکا تھا۔"

"بات مت بدلو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میڈیا میں یہ بات آئے گی کہ ہوٹل گرینڈ کا اصل مالک یونان نہیں، بلکہ کہیں کسی چھوٹی سی جگہ پہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس بات کو کتنا اچھالا جائے گا۔"

"اسٹاپ دس حیا!" وہ ایک دم جھنجلایا تھا۔ "تم ہتم ... کیا ضرورت ہے تمہیں پرائے مسئلے میں پڑنے کی؟ ضروری تو نہیں ہے کہ پاشا نے اپنے بھائی کو نکالا ہو، ہو سکتا ہے وہ خود گیا ہو، ہو سکتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی سیٹل منٹ ہو۔ ہزار ممکنات ہو سکتی ہیں۔"

"اور ہو سکتا ہے اس نے خود اپنے بھائی کو واپس آنے سے روک رکھا ہو۔ اگر اخبارات اس خبر کو اچھالیں گے تو عبدالرحمٰن پاشا کی اس خود ساختہ شہرت کے غبارے سے ساری ہوا نکل جائے گی۔" وہ بہت مزے سے بولی تھی، پھر جہان کے تاثرات دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور کوفت زدہ سا لگ رہا تھا۔

"عبدالرحمٰن پاشا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، فرق پڑے گا تو اس کے بھائی کو حیا! بہت سے لوگ نئی زندگیاں شروع کر لیتے ہیں وہ خود ہی اپنی پرانی زندگی میں نہیں لوٹنا چاہتے۔ اس طرح اس کو ایکسپوز کر کے تم اس کی زندگی مشکل میں ڈال دو گی۔ خوامخواہ مت پڑو ان لوگوں کے مسئلوں میں۔ چلو چلتے ہیں، مجھے واپس کام پہ بھی پہنچنا ہے۔"

وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں واضح اضطراب تھا۔

"تم کو اپنے دوست سے نہیں ملنا؟"

جہان نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، پھر کبھی مل لوں گا۔"

"مجھے سامان پیک کرنے میں ذرا وقت لگے گا، تم پورٹ پہ میرا انتظار کر سکتے ہو؟ میں تب سامان لے کر سیدھی وہیں آ جاؤں گی۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، تمہاری دوست کے گھر۔"

"نہیں، تم بور ہو جاؤ گے، مجھے ساتھ والی آنٹی سے کچھ چیزیں لینی ہیں، وقت لگ جائے گا۔ میں تمہیں پورٹ پہ ملوں گی۔" وہ جہان کو عائشے گل کے گھر کے باہر گلی اے آر پاشا کی تختی دکھانے کی متحمل ہرگز نہیں تھی۔

"اوکے!" اس نے زور نہیں دیا۔ وہ شانے اچکا کر سر جھکائے نیچے اترنے لگا۔ وہ کسی اور بات پہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر آکر اس نے جلدی جلدی سامان پیک کیا، فون کر کے عائشے سے معذرت کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے، ابا کی آمد کا بتا کر جب وہ اپنا بیگ لیے نہایت عجلت میں بندرگاہ جانے کے لیے نکلی تو اسے بھول چکا تھا کہ اس کا پزل باکس اوپر اسٹڈی کی میز پہ پڑا رہ گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

دوپہر کی سرخی بیوک ادا کی ان سرسبز درختوں سے گھری گلی پہ چھا رہی تھی۔ بلند و بالا عثمانی محل کے سفید ستون سنہری روشنی میں چمک رہے تھے۔

عبدالرحمٰن ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا گول چکردار زینے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک پہ کچن میں کام کرتی عائشے کے سبزی کاٹتے ہاتھ رک گئے۔ گھر میں جوتوں سمیت صرف عبدالرحمٰن ہی گھوما کرتا تھا۔ وہ مڈل کلاس ترکوں کی طرح گھر سے باہر کبھی جوتے نہیں اتارتا تھا بلکہ استنبول کی ہائی ایلیٹ کی طرح قالین پہ بھی جوتے پہن کر بہت تفاخر سے چلا کرتا تھا۔

عائشے نے صبح ہی اسے ایم ایس ایم کر دیا تھا کہ حیا کل چلی گئی ہے اور رات میں آنے بھی آگئی تھیں، وہ چاہے تو گھر آسکتا ہے۔ سو وہ آگیا تھا۔

اس نے جلدی سے سنک کی ٹونٹی کھولی، ہاتھ دھوئے اور انہیں خشک کیے بنا باہر نکلی تو اسے عبدالرحمٰن بالائی منزل کی راہداری کے پہلے دروازے میں داخل ہوتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں جا رہا تھا۔ عائشے تیز قدموں سے اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگی۔

اسٹڈی روم کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک بک شیلف کے سامنے کھڑا کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے چوکھٹ میں رک کر سلام کیا۔

"ہوں وعلیکم!" وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنے دن بعد گھر واپس آیا تھا، مگر اس کا انداز ویسا ہی تھا۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی۔" وہ کتاب رکھ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا اور دراز کھول کر اندر رکھی اشیا ادھر ادھر کرنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" عائشے کو بے چینی ہوئی۔

"کچھ پیپرز تھے، اور ایک کتاب بھی۔" وہ اب گھٹنے کے بل زمین پہ بیٹھا نچلی دراز کھول رہا تھا۔

"تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟" وہ اداسی سے بولی۔

"نہیں!" وہ بنا پلٹے بولا تھا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کہا تھا، آنے کے لیے کہا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے مگر تم نے اس دن کے بعد مجھ سے کبھی ٹھیک سے بات نہیں کی۔"

"عائشے! میرے معاملات میں مت بولا کرو!" اس نے مڑ کر ایک سخت نگاہ عائشے پہ ڈال کر کہا اور واپس پلٹ گیا۔ "تم نے اپنی دوست کو میرے سو کالڈ بھائی کے بارے میں بتایا ہے نا، اس نے مجھے خصوصاً یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں تمہارے حکم کی پابند تو نہیں ہوں عبدالرحمٰن!" عائشے نے نرمی سے مگر خفا لہجے میں کہا۔ "بہارے نے ہماری لڑائی کا ذکر کیا تو میں نے پوری بات بتا دی۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"آنے کدھر ہیں؟" وہ اب ٹیبل پہ رکھی کتابیں

اٹھا اٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"وہ سو رہی ہیں۔" وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے اس کا چہرہ بہت خفا اور اداس تھا۔ وہ چلی گئی تو عبدالرحمٰن نے پلٹ کر دیکھا پھر برہمی سے سر جھٹکا۔ "یہ لڑکی مروائے گی اسے کسی دن۔"

سرخ جلد والی کتاب ایک فائل تلے رکھی تھی، اس نے گہری سانس لے کر کتاب اٹھائی۔ اس کے اندر وہ کاغذات پڑے تھے جو اس نے پہلے وہاں رکھے تھے۔ کتاب اٹھا کر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ ایک شے پہ رک گئی۔

وہ ایک سیاہی مائل پزل باکس تھا جس کی چاروں اطراف جلی ہوئی لگتی تھیں اور ان پہ سنہری حروف ابھرے ہوئے تھے۔

عبدالرحمٰن نے کتاب واپس رکھی اور آہستہ سے وہ باکس اٹھایا، پھر اس کو الٹ پلٹ کر کے وہ سطور دیکھنے لگا۔ ایک شعر تلے کو ڈبار کے چھ چوکھٹے بنے تھے اور ان میں متفرق حروف ابھرے ہوئے تھے۔

وہ باکس پکڑے باہر آیا۔ عائشے کچن سے اسی وقت نکلی جب وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ عبدالرحمٰن نے نامحسوس انداز میں باکس والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ عائشے نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ راہداری سے گزر کر پچھلے دروازے سے ہوتا ہوا عقبی باغیچے میں آگیا۔ وہاں کونے میں عائشے کی ورک ٹیبل رکھی تھی، جس پہ بہارے کوئی کلرنگ بک رکھے رنگ بھر رہی تھی۔ بہارے سے وہ آتے ہوئے مل چکا تھا، سو اب اسے آتے دیکھ کر وہ سادگی سے مسکرا دی۔

"بہارے!" وہ مدھم مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کے قریب آیا اور پزل باکس اس کے سامنے کیا۔ "یہ کس کا ہے؟"

"اوہ یہ تو حیا کا ہے، وہ یہیں بھول گئی؟" وہ حیرت سے بولی۔ "کل اس کا کزن آیا تھا تو اسے جلدی میں جانا پڑا۔ تمہیں پتا ہے اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔"

"یہ حیا کا ہے؟" عبدالرحمٰن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں یہ اسے کسی نے دیا تھا۔"

"کس نے؟" وہ بنا پلک جھپکے بہارے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔" بہارے نے شانے اچکا دیے۔

"کیا یہ عائشے نے بنایا ہے؟"

"ہاں، مگر تم اس سے پوچھنا نہیں۔ اس کے خریدار نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔" بہارے کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ وہ مسکرا دیا۔

"اسی لیے تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اس کو کھول سکتی ہو؟"

"نہیں، اس کی پہیلی ابھی حیا نہیں حل کر سکی تھی۔ تم کر سکتے ہو؟" بہارے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"شاید، مگر بہارے گل!" وہ ذرا سا جھکا اور دھیرے سے بولا۔ "یہ باکس میرے پاس ہے، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک!" بہارے نے الجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ "مگر تم اس کو توڑنا نہیں۔ توڑ کر کھولنے سے اس کے اندر کی موجود شے تمہارے کام کی نہیں رہے گی۔"

وہ سر ہلا کر واپس پلٹ گیا۔ بہارے اپنی کلرنگ بک چھوڑ کر اس کے پیچھے آئی۔ وہ جب تک اندر آئی، عبدالرحمٰن اوپر جا چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔

تیسری منزل پہ عبدالرحمٰن کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ بہارے نے چوکھٹ کے قریب سر نکال کر جھانکا۔

عبدالرحمٰن پزل باکس الماری میں رکھ رہا تھا۔ الماری کا پٹ بند کر کے اس نے لاک لگایا اور چابی اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دی۔ بہارے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور بلی کی چال چلتی واپس اتر گئی۔

عبدالرحمٰن نے وہ باکس کیوں رکھ لیا‘ اس کا ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا آج صبح پہنچے تھے اور اب وہ ”مرمرا ہوٹل“ میں تھے‘ مرمرا ہوٹل تاقسم میں واقع تھا۔ حیا اور ڈی جے نے غریب عوام کی طرح وہ شان دار ہوٹل باہر سے ہی دیکھا تھا۔ اگر ڈی جے ہوتی تو وہ دونوں اس بات کو بہت انجوائے کرتیں کہ ابا اب اسی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔

اس کا ڈورم ڈی جے کے بغیر بہت ادھورا سا تھا۔ ڈی جے ابھی تک وہیں تھی‘ وہ تو جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ ہالے نے کل ڈورم بدل لیا تھا‘ اب وہ ڈی جے کے بنک پہ منتقل ہو گئی تھی۔ البتہ ان دونوں نے اس بنک سے ملحقہ میز پہ ڈی جے کی ٹوٹی عینک ٹیپ سے جوڑ کر رکھ دی تھی۔

رات انجم باجی اور ہالے اسی کے پاس رک گئی تھیں۔ وہ تینوں گھنٹوں ڈی جے کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

”جب ہم پہلی دفعہ آپ سے ملے تھے تو اسے آپ کے انڈین ہونے پہ بہت اعتراض تھا۔ اسے پاکستان کا ٹی ٹوئنٹی فائنل میں آخری بال پہ مصباح کے آؤٹ ہونے کا بہت دکھ تھا۔ اس نے اس کے بعد کرکٹ دیکھنی ہی چھوڑ دی تھی۔ بعض دکھ اصل واقعات سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈی جے کی محبت سے ڈی جے کا دکھ بڑھ گیا ہے۔“

”اور استقلال اسٹریٹ میں جب......“

اس کے اور ہالے کے پاس بہت سے واقعات تھے۔ وہ یادوں سے نکل کر جب سوئیں تو صبح دیر سے اٹھیں۔ آج چھٹی تھی‘ اور اب اسے ابا سے ملنے جانا تھا۔ سو اب وہ اسی لیے تیار ہو رہی تھی۔

جو گہرا سبز فراک اس نے پہنا تھا۔ یہ وہی تھا جو وہ ڈی جے کے ساتھ آخری دفعہ پھپھو کے گھر پہن کر گئی تھی۔

”بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو۔“

کچھ یاد کر کے وہ اداسی سے مسکرائی اور پرفیوم اٹھایا۔ ابھی اس نے اسپرے نوزل پہ انگوٹھا رکھا ہی تھا کہ بہارے کہیں آس پاس سے چیخی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟ اچھی لڑکیاں اتنا تیز پرفیوم لگا کر باہر نہیں جاتیں۔“

وہ ایک دم رک گئی۔ اف‘ عائشے گل اور اس کی ”اچھی لڑکی!“ اسے ان باتوں کو اپنے ذہن پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے دوبارہ نوزل دبانا چاہا مگر پتا نہیں کیوں اس نے پرفیوم واپس رکھ دیا۔

اپنے بازو کے اوپری حصے پہ داغے گئے الفاظ پہ وہ پہلے ہی اسکن کلر کا بینڈیج لگا چکی تھی۔ فراک کی شیفون کی آستینوں سے بازو جھلکتے تھے۔ کلر بینڈیج نے ان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے سبز دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پہ پھیلایا اور کھلے بالوں کو کندھے کے ایک طرف ڈالتی باہر نکل آئی۔

”اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں۔“

وہ اپنے ذہن میں گونجتی آوازوں کو نظرانداز کرتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

”اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔“

وہ سر جھٹکتی آخری زینہ پھلانگ آئی۔

”اچھی لڑکیاں...... اچھی لڑکیاں۔“

اس نے اپنا سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اندھیرے پہ اندھیرے۔ لہر پہ لہر صبح کے وقت بھی اسے ہر طرف اندھیرا لگنے لگا تھا۔ اس کی روشنی کہاں تھی؟

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی انجم باجی کے اپارٹمنٹ کی طرف آ گئی۔ انجم باجی اپنا چارجر اس کے کمرے میں بھول گئی تھیں۔ ان کا چارجر لوٹا کر اس نے اب چلے جانا تھا‘ مگر پتا نہیں کیوں رک گئی۔

”انجم باجی! میرے بالوں کی فرنچ بریڈ بنا دیں گی؟“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”ہاں شیور۔ ادھر بیٹھو!“ انجم باجی برش لے کر اس کے بال سنوارنے لگیں۔

”حیا! تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے؟“ فرانسیسی طرز کی چوٹی کے باریک بل باندھتے ہوئے وہ حیرت سے

کہہ اٹھیں۔ وہ ذرا سی چونکی۔

”کیا ہوا؟“

”تمہاری scalp کی جلد کا رنگ ایسا سرخ بھورا سا ہو رہا ہے‘ چھالے ہوئے تھے بالوں میں؟“

”نہیں‘ ایک کیمسٹری ایکٹ کر گیا تھا۔ بس چند دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

چوٹی بناتے ہوئے بال کھنچ رہے تھے اور سر کی جلد درد کر رہی تھی‘ مگر وہ برداشت کر کے بیٹھی رہی۔ عائشے نے جب وہ ویکس اتاری تھی تو اس کے بالوں کو کتنا نقصان ہوا‘ کتنا نہیں‘ عائشے نے تفصیل اسے کبھی نہیں بتائی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کبھی وہ اس سارے واقعے کی تفصیل دوبارہ سے سنے گی۔

اس نے انجم باجی کے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے قبل خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ اسے پتا تھا‘ وہ فرنچ بریڈ میں بہت اچھی نہیں لگ رہی ہو گی۔

حسین اور مومن گورسل شٹل سے اتر رہے تھے جب وہ اسٹاپ پہ پہنچی۔

”معتصم سے کہنا‘ مجھے اس کو کچھ دکھانا ہے۔“ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ حسین سے کہہ کر بس میں چڑھ گئی۔ وہ واپس آ جائے پھر معتصم کے ساتھ مل کر پزل باکس کی پہیلی حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

مرمرا ہوٹل‘ تاقسم ڈسٹرکٹ میں واقع تھا۔ شیشوں سے ڈھکی بلند و بالا عمارت گویا کوئی اونچا سا ٹاور ہو۔ اندر سے بھی وہی چمکتا‘ آنکھوں کو خیرہ کرتا منظر۔

وہ پتلی ہیل سے پراعتماد انداز میں چلتی لابی میں آئی تھی۔ ابا نے بتایا تھا کہ وہ لابی میں ہی ہوں گے اور وہ اسے دور سے ہی نظر آ گئے تھے۔ ان کا اس کی طرف نیم رخ تھا۔ وہ کھڑے کسی سے محو گفتگو تھے۔

وہ ان کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ ابا کے ساتھ کھڑے دونوں افراد پہ پڑی۔ ایک دم سے اس کے پاؤں برف کی سل بن گئے۔

ابا کے ساتھ کوئی اور نہیں‘ ان کے کاروباری شراکت دار لغاری انکل اور ولید لغاری تھے۔

گویا کرنٹ کھا کر حیا مڑی اور تیزی سے ایک دوسری راہداری میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ صد شکر کہ ان میں سے کسی کی نظر ابھی اس پہ نہیں پڑی تھی۔

یہ قابل نفرت شخص کہاں سے آ گیا؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے؟ وہ کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بنا دیکھے لیڈیز ریسٹ روم کی طرف آ گئی۔

وہاں آئینے سے ڈھکی دیوار کے آگے قطار میں بیسن لگے تھے۔ ایک طرف باتھ رومز کے دروازے تھے۔ ایک ترک لڑکی ایک بیسن کے سامنے کھڑی آئینے میں دیکھتی لپ اسٹک درست کر رہی تھی۔

حیا اس سے فاصلے پہ آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گردن پہ ہاتھ رکھا۔ جب ولید نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا تو اس کی گردن پہ رگڑ آئی تھی۔ ڈولی کا کھردرا ہاتھ‘ اس کا فرائنگ پین مگر یہاں کوئی ڈولی نہیں تھا۔ جو اس کے لیے آ جاتا۔ وہ اکیلی تھی۔ کس سے مدد مانگے‘ اس سے جو کسی مشکل میں اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔؟ مگر شاید اب کی بار......

اس نے جلدی سے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔

”اٹھا بھی چکو!“ وہ فون کان سے لگائے کوفت زدہ سی کھڑی تھی۔ آئینے میں جھلکتے اس کے چہرے پہ اب تک زخموں کے نشان مندمل ہو چکے تھے۔

پانچویں گھنٹی پہ جہان کی خمار آلود آواز گونجی۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے۔ براہ مہربانی‘ کافی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ۔“

”جہان! اٹھو اور میری بات سنو!“ وہ جھلا سی گئی تھی۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں‘ مجھے سونے دو‘ میں نے ریسٹورنٹ......“

”جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔ تم ابھی اسی وقت مرمرا ہوٹل پہنچو۔ ابا آئے ہوئے ہیں اور ساتھ ان کے دوست وغیرہ بھی ہیں‘ مجھے اکیلے ان سے ملنا

اچھا نہیں لگ رہا۔" اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی۔

ساتھ کھڑی لڑکی اب بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھ رہی تھی۔

"میں نہیں آرہا' مجھے آرام کرنے دو۔"

"ٹھیک ہے۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا ریسٹورنٹ۔ وہ جن لوگوں نے تمہارے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی تھی نا' انہوں نے بہت اچھا کیا تھا' تم ہو ہی اسی قابل۔" اس نے زور سے بٹن دبا کر کال کاٹی۔

ترک لڑکی اب بیسن کی سلیب پہ رکھا اسکارف اٹھا کر چہرے کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ حیا چند لمحے اسے بے خیالی میں تکتی رہی' پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے شانوں پہ پھیلا دوپٹہ اتارا اور سر پہ رکھ کر چہرے کے گرد تنگ ہالہ بنا کر پلو بائیں کندھے پہ ڈال لیا۔ سبز دوپٹہ کرنکل جارجٹ کا تھا اور چاروں اطراف سفید موتی پائپن ہوئی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا۔ کندھے' آستین' کلائیاں تک دوپٹے میں چھپ گئی تھیں۔ مگر کیا وہ اچھی بھی لگ رہی تھی؟ شاید نہیں۔

لیکن کس کو؟ کسی نے اس سے پوچھا اور ایک دم سے اس کا دل پرسکون ہو گیا۔ اس وقت وہ لوگوں کو اچھی لگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب اللہ کو راضی کرنے کے لیے نہیں کر رہی تھی' وہ تو شاید صرف اپنا دفاع کر رہی تھی۔ نیکی' اللہ کا خوف' اسے اب بھی ان میں سے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"ابا!" ان کے عقب میں جا کر اس نے ان کو پکارا تو وہ تینوں ایک ساتھ پلٹے۔

"اوہ مائی چائلڈ!" ابا خوشی سے آگے بڑھے۔ وہ ایک رسمی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے ابا سے ملی اور لغاری انکل کو فاصلے سے سلام کر لیا۔

"بیٹا! یہ لغاری ہیں' میرے دوست' اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ولید۔"

"مجھے تو آپ جانتی ہوں گی' ہم پہلے مل چکے ہیں۔"

ولید ایک محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"مجھے یاد نہیں' میں ہر کسی کو یاد نہیں رکھتی۔" ذرا رکھائی سے کہہ کر وہ ابا کی طرف مڑی اور اپنی بات کا رد عمل آنے سے قبل ہی بولی۔

"آپ کو کدھر لے کر جاؤں ابا! استنبول کی سیر آپ کہاں سے شروع کرنا چاہیں گے؟"

"میرا خیال ہے انکل! استقلال اسٹریٹ چلتے ہیں' اس کی رونق کے بارے میں بہت سنا ہے۔" ولید کی مسکراہٹ ذرا سمٹی تو تھی مگر وہ ابھی بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ استقلال اسٹریٹ کی رونق سے اس کا اشارہ اس جگہ کے بارز اور نائٹ کلبز کی طرف ہی تھا۔

"جہاں تم کہو' تم زیادہ جانتی ہو گی استنبول کو۔" ابا مسکرا کر بولے تھے۔

"میرا خیال ہے ابا' ہم بلیو موسق (نیلی مسجد) چلتے ہیں۔ میں جہان کو بھی بتا دوں۔" وہ سارا پروگرام بنا کر موبائل پہ جہان کو میسج کرنے لگی۔ جان بوجھ کر بھی جہان کا نام لینے کے باوجود ان باپ بیٹے نے نہیں پوچھا کہ کون جہان؟" اسے مزید کوفت ہوئی۔ اسی کوفت زدہ انداز میں اس نے میسج لکھا۔

"ہم بلیو موسق' آیا صوفیہ اور توپ کپی جا رہے ہیں تم اسی جگہ آجاؤ' اور اگر تم نہ آئے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔"

"یہی بات اسٹامپ پیپر پہ لکھ کر دو!" فوراً" جواب آیا تھا۔

"فائن۔ اب میں تم سے واقعی کبھی بات نہیں کروں گی۔"

"تو کیا ٹیکسٹ کرو گی؟" ساتھ ایک معصوم سا مسکراتا چہرہ بھی تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا' اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی گردن دبوچ لیتی۔

آیا صوفیہ اور توپ کپی پیلس ساتھ ساتھ ہی واقع تھے اور ان کے سامنے سڑک کی دوسری جانب استنبول

کی مشہور زمانہ نیلی مسجد تھی پچھلی دفعہ اگر ڈی جے اور پھر جہان کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی تو وہ لوگ نیلی مسجد ضرور جاتے مگر اب سب بدل چکا تھا۔

نیلی مسجد (سلطان احمت مسجد) کا رنگ نیلا نہیں تھا مگر اس کی اندرونی ازنک ٹائلز نیلی تھیں۔ باہر سے اس کے گنبد یوں تھے گویا چھوٹے چھوٹے پیالے الٹے رکھے ہوں۔ مسجد کے احاطے کے آگے گیٹ تھا اور اس کے باہر قطار میں بنچ لگے تھے۔ یوں کہ ہر دو بنچز کے درمیان ایک میز تھی۔

بنچ پر وہ اور ابا میز کے ایک طرف جبکہ ولید اور لغاری صاحب دوسری طرف بیٹھ گئے تھے۔ موبائل حیا نے گود میں رکھا ہوا تھا گو کہ اب وہ جہان کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔

وہاں ہر سو کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ ہوا سے اس کا دوپٹا بھی پھسلنے لگتا' وہ بار بار اسے دو انگلیوں سے پیشانی پہ آگے کو کھینچتی۔ آج اسے اپنے سر سے دوپٹا نہیں گرنے دینا تھا۔ آج نہیں۔

رات کے سیمینار کے بعد یوں کرتے ہیں کہ عمیر خان سے مل لیں گے۔" ابا اور لغاری انکل آپس میں محو گفتگو تھے۔ ولید اسے نظروں کے حصار میں لیے اس کے مقابل بیٹھا تھا۔ وہ گردن موڑ کر لاتعلق سی اڑتے کبوتر دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً" اس نے ابا اور لغاری انکل کو اٹھتے دیکھا۔ چونک کر اس نے گردن موڑی۔

"تم لوگ بیٹھو' ہم ابھی آتے ہیں۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

انہیں کچھ دیکھنا تھا یا کوئی مل گیا تھا یا پھر شاید ولید نے اپنے باپ کو کلیو — دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھی رہی۔ دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ابا کو بھی ترکی آ کر اتاترک کا اثر ہو گیا تھا۔ پاکستان ہوتا تو وہ کبھی یوں اپنی بیٹی کو دوست کے بیٹے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔

"تو میں آپ کو واقعی یاد نہیں؟" وہ محظوظ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے گردن پھیر کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"میرے ابا کے دوستوں کے پاس بہت سے کتے ہیں' مجھے کبھی کسی ایک کتے کا بھی نام یاد نہیں رہا۔"

وہ جواباً" اسی طرح مسکرائے گیا۔

"بہت نیک ہو گئی ہیں آپ مگر اس سرخ رنگ میں آپ بہت اچھی لگتی تھیں۔"

وہ لب بھینچے رخ موڑے بیٹھی رہی۔

"کچھ کھائیں گی آپ؟ کیا پسند ہے آپ کو کھانے میں؟"

"آپ کو کیا پسند ہے کھانے میں؟ فرائنگ پین؟" اب کے وہ بھی تمسخرانہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

"گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس ادھر؟ آپ کے ساتھ ڈرائیو پہ جانا مجھے اچھا لگتا۔" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔ ایک سنگین غلطی جس کا پردہ وہ کبھی بھی کھول سکتا تھا۔ لمحے بھر کو وہ اندر تک کانپ گئی تھی۔

"اپنی حد میں رہیں ولید صاحب! جو رات کے اندھیرے میں آپ کو فرائنگ پین کی ایک ضرب سے زمین بوس کر سکتا ہے' وہ دن کی روشنی میں تو اس سے بھی بدتر کر سکتا ہے۔" کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ موڑا تھا۔

دور سے جہان نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ ان ہی کی طرف آرہا تھا۔ نیلی جینز پہ سفید ٹی شرٹ میں ملبوس' اس کے چہرے سے لگ رہا تھا' وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔

حیا کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ اسے زندگی میں کبھی جہان سکندر کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی' جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

وہ بے اختیار اٹھی گود میں رکھا موبائل زمین پہ جا گرا۔ وہ چونکی اور جلدی سے جھک کر فون اٹھایا۔ اس کی اسکرین پہ بڑی سی خراش پڑ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے

ہوئے ولید بھی ساتھ ہی اٹھا تھا۔
"جی میڈم! آپ اپنی بات پہ قائم ہیں؟" وہ مسکرا کر کہتا اس کے قریب آیا۔" پھر نگاہ ولید پہ پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔
"جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے ہیں' ابا ان کے والد کے ساتھ ابھی..... وہ آگئے۔" ابا اور لغاری انکل سامنے سے چلتے آرہے تھے۔ جہان کو دیکھ کر ابا کے چہرے پہ خوشگوار حیرت ابھری۔
"سوری ماموں! میں ایرپورٹ نہیں آسکا۔ ممی نے بتایا تھا کہ آپ نے خود منع کردیا تھا۔" ابا سے مل کر وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہا تھا۔ لغاری انکل اور ولید سے بھی وہ اسی خوش دلی سے ملا تھا' البتہ وہ دونوں استفہامیہ نظروں سے سلیمان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔
"اٹس او کے' آفیشلی پک کرلیا گیا تھا ہمیں' اسی لیے میں نے سین کو منع کردیا تھا۔" جہان نے مسکرا کر سر کو جنبش دی' پھر نگاہ لغاری انکل کے سوالیہ تاثرات پہ پڑی تو جیسے جلدی سے وضاحت دی۔
"میں جہان سکندر ہوں' سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد۔ حیا کا ہزبینڈ!"
مرمرا کا سمندر ایک دم آسمان تک اٹھا اور کسی تھال کی طرح اس پہ انڈیل دیا گیا تھا۔ وہ اس بوچھاڑ میں بالکل سن سی ہوئی جہان کو دیکھ رہی تھی۔ جس رشتے کے متعلق نہ پوچھنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی' اس رشتے کا اقرار یوں اس منظرنامے میں ہوگا' اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
"داماد؟ اوہ آئی سی!" لغاری انکل نے بمشکل مسکرا کر سر ہلایا' پھر ایک نظر ابا پہ ڈالی' جو لمحے بھر کو گنگ رہ گئے تھے' مگر جلدی ہی سنبھل گئے تھے۔
"مجھے خوشی ہے جہان! کہ تم آئے۔" حالانکہ وہ اس کے آنے کے بجائے کسی اور بات پہ خوش تھے۔
"سوری ماموں! مجھے پہلے آنا چاہیے تھا اور اگر اب بھی نہ آتا تو حیا نے مجھ سے ساری زندگی بات نہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔" اس نے مسکرا کر کہتے حیا کو دیکھا' وہ جواباً دھیرے سے مسکرائی۔ جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے ہی ایسے ہی آئیڈیل کپل کی طرح بات کرتے رہے ہوں۔ جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی تلخ کلامی ہوئی ہی نہ ہو۔
ولید لغاری کے چہرے کی مسکراہٹ پھر یوں غائب ہوئی کہ وہ دوبارہ مسکرا نہ سکا۔ بعد میں سارا وقت وہ محتاط انداز میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ اپنے سامنے' اپنے شوہر اور باپ کے درمیان بیٹھی لڑکی پہ اب نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہیں کررہا تھا۔
اس سہ پہر جہان نے ان تینوں مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے تواضع کی۔ توپ کپی اور آیا صوفیہ (میوزیم) کی راہداریوں میں ان کو ساتھ لیے وہ ایک اچھے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آج استنبول میں حیا کا پہلا دن تھا جب وہ بہت اعتماد سے جہان کے پہلو میں چل رہی تھی۔
"تم ان دونوں کو ہوٹل ڈراپ کرکے ابا کو گھر لے جانا' میں خود ہی گھر آجاؤں گی۔ ابھی مجھے یہاں کچھ کام ہے۔" واپسی کے وقت اس نے جہان سے دھیرے سے کہا تھا۔ وہ شانے اچکا کر بنا اعتراض کے ساتھ چلا گیا۔
ان کے جانے کے بعد وہ نیلی مسجد کے گیٹ کے اندر چلی آئی۔ اسے یہاں کوئی کام نہیں تھا' اسے بس کچھ وقت کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔
مسجد کے احاطے میں سبزہ زار پہ پانی کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اونچے گنبدوں پر چھاؤں سی چھائی تھی۔ وہ سر جھکائے روش پہ چلتی اندر جارہی تھی۔
"اندھیروں پہ اندھیرے' اس کے اوپر لہر۔ اس کے اوپر بادل۔"
اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی۔ اس شخص کی سی تھکاوٹ۔ جس کا سراب اسے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ زندگی کے بائیس برس ایک دھوکے میں گزار دینے کے بعد اس کو آج پہلی بار لگا تھا کہ وہ سب صرف ایک سراب تھا۔ چمکتی ریت جسے وہ آب حیات سمجھی تھی۔
"اور نہیں بنایا جس کے لیے اللہ نے نور' تو نہیں

"ہے اس کے لیے کوئی نور۔"

اندر اس عظیم الشان ہال میں وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے، ٹھوڑی ان پہ جمائے ساری دنیا سے لاتعلق بیٹھی تھی۔

"تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور......"

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کر کے غلط کیا تھا۔ اس نے بہت دفعہ اللہ کو "ناں" کی تھی۔ اسے کبھی اس بات سے فرق نہیں پڑا تھا کہ اللہ اسے کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ وہی بنی رہی جیسے وہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی۔

"وہ سمجھتا ہے اسے پانی، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا اور وہ اس کے قریب اللہ کو پاتا ہے۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

جن دنوں اس کا تازہ تازہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا اس نے دوپٹا بالکل گردن میں لینا شروع کر دیا تھا۔ کتنا ڈانٹتے تھے تایا فرقان اور ابا بھی شروع شروع میں کچھ کہہ دیتے، مگر جب وہ خاموشی سے ان کی بات سنی ان سنی کر کے آگے نکل جاتی تو رفتہ رفتہ سب نے کہنا چھوڑ دیا اور پھر اس سفر کی نوبت کہاں آ پہنچی؟ اس کی ویڈیو کو مجرے کا نام دیا گیا، ایک بدنام زمانہ آدمی اس کے پیچھے پڑا تھا، صائمہ تائی اس کے بارے میں آگے پیچھے ہر جگہ نازیبا باتیں کہتی پھرتی تھیں، اور ایک اغوا کار شخص نے اس کے بازو پہ وہ نام داغ دیا تھا جو شرفاء اپنے منہ سے نہیں نکالا کرتے تھے۔

اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

"اللہ نور ہے، آسمانوں اور زمین کا......"

لوگ کہتے ہیں مسجدوں میں سکون ہوتا ہے، کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتی مسجدوں میں نور ہوتا ہے۔ نور، اوپر نور کے۔

اس نے آہستگی سے گردن موڑی۔ اس کے بائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا ترک لڑکا آ بیٹھا تھا جس کے ایک بازو پہ پلستر چڑھا تھا۔ وہ گم صم سی نگاہوں سے اوپر مسجد کی منقش چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"نور کیا ہوتا ہے؟ تم جانتے ہو؟" وہ اتنے ہولے سے بولی تھی کہ اپنی آواز بھی سنائی نہ دی۔

"نور وہ ہوتا ہے، جو اندھیری سرنگ کے دوسرے سرے پہ نظر آتا ہے، گویا کسی پہاڑ سے گرتا پگھلے سونے کا چشمہ ہو۔" وہ اسی طرح چھت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور کیسے ملتا ہے نور؟"

"جو اللہ کی جتنی مانتا ہے اسے اتنا ہی نور ملتا ہے۔ کسی کا نور پہاڑ جتنا ہوتا ہے، کسی کا درخت جتنا، کسی کا شعلے جتنا اور کسی کا پاؤں کے انگوٹھے جتنا......"

لڑکے نے سر جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

"انگوٹھے جتنا نور، جو جلتا، بجھتا، بجھتا جلتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کچھ دن، بہت دل لگا کر نیک عمل کرتے ہیں اور پھر کچھ دن سب چھوڑ چھاڑ کر ڈپریشن میں گھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"اور انسان کیا کرے کہ اسے آسمانوں اور زمین جتنا نور مل جائے؟"

"وہ اللہ کو نہ کہنا چھوڑ دے۔ اسے اتنا نور ملے گا کہ اس کی ساری دنیا روشن ہو جائے گی۔" وہ پھر سے گردن اٹھائے مسجد کی اونچی چھت کو دیکھنے لگا تھا۔

اسے محسوس ہوا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔ وہ دھیرے سے اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔

"سنو!" وہ پیچھے سے بولا تھا۔ حیا لمحے بھر کو رکی۔

"دل کو مارے بغیر نور نہیں ملا کرتا۔"

وہ پلٹے بغیر آگے بڑھ گئی۔ دل تو مارنا پڑتا ہے، مگر ضروری تو نہیں ہے کہ ٹھوکر بھی کھائی جائے۔ انسان ٹھوکر کھائے بغیر، زخم لیے بغیر، خود کو جلائے بغیر بات کیوں نہیں مانتا؟ پہلی دفعہ میں ہاں کیوں نہیں کہتا؟ نیلی مسجد کے کبوتروں کی طرح اوپر اڑنا کیوں چاہتا ہے؟ پہلے حکم پہ سر کیوں نہیں جھکاتا؟ ہم سب کو آخر منہ کے بل گرنے کا انتظار کیوں ہوتا ہے؟ اور گرنے کے بعد ہی بات کیوں سمجھ میں آتی ہے؟

اس نے ہتھیلی کی پشت سے دھیرے سے آنکھیں

رگڑیں اور باہر نکل آئی۔

ایک فیصلہ تھا جو اس نے نیلی مسجد کے گنبدوں کو گواہ بنا کر کیا تھا۔ اب اسے اس فیصلے کو نبھانا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھپھو اور ابا لاؤنج میں بیٹھے بیتے دنوں کی باتیں کر رہے تھے۔ پھپھو بہت خوش تھیں۔ بار بار نم آنکھیں پونچھتیں۔ وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی، جہان کیک ٹرے میں سیٹ کر رہا تھا۔ آج اس نے کون سا اعتراف کیا ہے۔ وہ سب یوں ظاہر کر رہے تھے گویا انہیں یاد ہی نہ ہو۔

"تمہاری پڑھائی کا حرج تو بہت ہو گیا ہو گا؟ اتنے دن لگا دیے اوالار میں، ڈورم آفیسر نے طلبی کی ہو گی؟" وہ کیک پہ کچھ چھڑکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، ڈورم میں حاضری مارکنگ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ہاں کلاسز کا حرج ہوا تو ہے، پانچ دن تو اسپرنگ بریکر میں شامل ہو گئے تھے۔ اوپر کے چھ دن کی غیر حاضری لگی ہو گی۔ اب مزید صرف ایک چھٹی کی گنجائش ہے میرے پاس!" وہ کیتلی میں چائے ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

"ایگزامز کب ہیں؟"

"مئی کے آخر سے، جون کے پہلے ہفتے تک۔"

"اور پاکستان تم نے پانچ جولائی کو جانا ہے نا؟ یہ آخری مہینہ تو شاید صرف ترکی گھومنے کے لیے ہے۔"

"ہاں مگر ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی کوشش ہوتی ہے کہ قریبی ممالک بھی دیکھ لیں۔ کوئی قطر جا رہا ہے تو کوئی پیرس۔" وہ ٹرے اٹھا کر جانے کے لیے مڑی۔

"ہم لندن چلیں؟"

حیا نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اوون سے اسنیکس کی پلیٹ نکالتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تھا۔

"ہم لندن جا رہے ہیں کچھ عرصے تک، ابا کے علاج کے لیے۔ تم بھی چلو۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے، سوچوں گی۔" وہ جواباً مسکرائی اور ٹرے لیے باہر آ گئی۔

"میری بہت خواہش تھی بھائی کہ سب پاکستان میں، سب رشتے داروں کے ساتھ ہو، لیکن شاید ایسا جلد ممکن نہ ہو اور پھر ہم دونوں ہیں تو یہاں اس لیے میں نے سوچا کہ غیر رسمی انداز میں رسم کر لیں۔"

پھپھو شاید ابا سے بات کر چکی تھیں، تب ہی وہ مسکرا رہی تھیں، وہ جو کارپٹ پہ پنجوں کے بل بیٹھی ٹرے سے پیالیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

پھپھو مسکراتے ہوئے اٹھیں اور چند لمحوں بعد چھوٹی سلور ٹرے لیے آئیں جس میں سرخ فیتہ رکھا نظر آ رہا تھا۔ حیا نے نا سمجھی سے ٹرے کو دیکھا، پھر کچن سے ٹرالی دھکیل کر لاتے جہان کو وہ بھی پھپھو کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر رکا، پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"جہان سکندر! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" پھپھو نے بظاہر مسکراتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے متنبہ کیا۔ وہ شاید راضی نہیں تھا، مگر "نہیں" کہہ کر ٹرالی آگے لے آیا۔ حیا ٹرے میز پہ ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب نظر آیا تھا، سرخ فیتے کے دونوں سروں پہ ایک ایک انگوٹھی بندھی تھی۔

"شادی کا وقت تو ظاہر ہے، ہم بعد میں ڈیسائیڈ کریں گے، مگر ہر ماں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں اپنی بہو کو نسبت کی انگوٹھی پہنا دوں۔ فاطمہ بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ دونوں انگوٹھیوں کو پکڑے ان دونوں کے پاس آئیں۔

ان کے ہاتھ بڑھانے پہ حیا نے کسی خواب کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ آگے کر دیا، انہوں نے مسکراتے ہوئے اس میں انگوٹھی ڈالی۔ وہ ایک سادہ، پلاٹینم بینڈ تھا۔ سرخ ربن کے دوسرے سرے سے بندھا بینڈ انہوں نے جہان کی انگلی میں ڈالا، پھر ٹرے سے چھوٹی قینچی اٹھا کر ربن درمیان سے کاٹا۔ دونوں کی انگوٹھیوں

سے بندھا ربن ان کی انگلیوں کے ساتھ جھولتا رہ گیا۔ ترکی میں منگنی شاید اسی طرح ہوا کرتی تھی۔

حیا نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ سر اٹھایا۔ جہان پھپھو کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور وہ اس کی پیشانی چوم کر دعا دے رہی تھیں۔ ابا بھی اٹھ کر اس کو گلے سے لگائے دعا دے رہے تھے۔ وہ سب کتنا حسین تھا' کسی خواب کی طرح۔ دھنک کے سارے رنگوں سے مزین کوئی بلبلہ جو کشش ثقل سے آزاد ہو کر اوپر اڑتا جا رہا ہو۔ اوپر.... اور اوپر....

"تم کیوں چپ بیٹھے ہو برخوردار؟" ابا شاید جہان سے پوچھ رہے تھے۔

"میں سوچ رہا ہوں' میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جس کی منگنی اس کی شادی کے بعد ہوئی ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا تھا۔ وہ نچلا لب دبائے جلدی سے ٹرے لیے کچن میں آگئی۔ اس کا ست رنگا بلبلہ اوپر بہت اوپر تیرتا جا رہا تھا۔

شام میں دیر سے جہان' ابا کو واپس چھوڑنے گیا اور پھپھو اپنے کام نپٹانے لگیں تو وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی سے بندھے ربن کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ تب ہی لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو؟" اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب کوئی نسوانی آواز تھی۔

"کیا میں مسٹر جہان سکندر سے بات کر سکتی ہوں؟"

"نہیں' وہ ذرا باہر تک گئے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو دے دیجیے۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

"جہان کو کہنا' اس نے جو پارسل مجھے بھجوایا تھا' وہ کھو گیا ہے۔ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے شاید۔ میں اسے رات میں کال کروں گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے فون رکھ دیا تھا۔

حیا نے ایک نظر ریسیور کو دیکھا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے اسے کریڈل پہ ڈال دیا۔

جہان جب واپس آیا تو وہ لاؤنج میں منتظر بیٹھی تھی۔ پھوپھو اب تک سونے جا چکی تھیں۔ حیا کا ارادہ تھا کہ وہ لندن کے ٹرپ کا پروگرام جہان سے ڈسکس کرے' اور بھی بہت سی باتیں تھیں مگر پہلے اس کا پیغام۔

"ماموں صبح ہوٹل سے ہی ایئرپورٹ چلے جائیں گے' ہمیں آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم یوں کرو' دو کپ کافی بنا لاؤ' میں کچھ نئی موویز لایا تھا۔ دیکھتے ہیں۔"

وہ بہت اچھے موڈ میں کہتے ہوئے ٹی وی کے نیچے بنے ریک کی طرف آیا تھا۔

"او کے لاتی ہوں اور ہاں' تمہارے لیے فون آیا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "کوئی لڑکی تھی' نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا' کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔ شاید وہ رات میں کال کرے۔"

وہ تیزی سے مڑتے ہوئے اٹھا تھا۔

"میرا پارسل اسے نہیں ملا اور کیا کہا؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ کافی لاؤں؟"

"نہیں' رہنے دو۔" وہ قدرے مضطرب انداز میں کہتے ہوئے صوفے کی طرف آیا اور فون اٹھا کر سی ایل آئی چیک کرنے لگا۔ اس کی انگلی میں انگوٹھی اب بھی تھی' مگر ربن نہیں تھا۔

"تم.... تمہیں صبح کیمپس بھی جانا ہوگا' تم یوں کرو سو جاؤ۔ میں بس تھوڑا کام کروں گا۔" وہ الجھے الجھے متفکر انداز میں سی ایل آئی چیک کرتے ہوئے بولا۔

ست رنگا بلبلہ پھٹ گیا تھا۔

سارا موڈ غارت' سارا پلان ختم۔

وہ "اچھا" کہہ کر بددلی سے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا کمرہ لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ دروازے کی ہلکی سی درز اس نے کھلی رہنے دی۔ جب تک وہ سو نہیں گئی' اسے جہان صوفے پہ مضطرب سا بیٹھا فون کو دیکھتا نظر آتا رہا تھا۔

وہ صبح فجر پہ اٹھی تو دیکھا' جہان اسی طرح صوفے پہ بیٹھا' فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لڑکی کا فون نہیں آیا تھا شاید۔ انتظار لاحاصل۔ اس کے دل پہ بہت سا بوجھ آن پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

کلاس میں وہ سر سے دوپٹا اتار کر گئی تھی اور بالکل پیچھے بیٹھی رہی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دوپٹا پھر ٹھیک سے سر پہ لے لیا۔ کامن روم میں واپس آئی تو معتصم مل گیا۔

"حیا.... کی آحال ہے؟" حسین اور معتصم اس کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈی جے کی سکھائی گئی اردو۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پاس آئی۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔ مجھے تمہیں کچھ دکھانا تھا۔" آخری فقرہ اس نے انگریزی میں ادا کیا۔

"پزل باکس؟ وہ کھلا؟"

"نہیں' مگر اس پہ لکھی پہیلی مل گئی ہے۔ ٹھہرو میں لے آؤں۔" وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے بیگ کھولا' کپڑے' جوتے' سوئٹرز' پرس' ہر چیز الٹ پلٹ کی' مگر پزل باکس وہاں نہیں تھا۔

"کدھر گیا؟ یہیں تو تھا۔ آخری دفعہ کہاں رکھا تھا اس نے؟" وہ سوچنے لگی۔ "ہاں' اسٹڈی میں' جب وہ جہان کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔" اوہ' خدا نہ کرے وہ پاشا کے ہاتھ لگے۔"

اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور اس کی ٹوٹی اسکرین کو دیکھتے ہوئے عائشے کا نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

سفید محل کے عقبی باغیچے میں سہ پہر اتری تھی۔ عائشے اسٹول پہ بیٹھی' ورک ٹیبل پہ لکڑی کا ٹکڑا رکھے' نوکدار چھرے سے اس کو چھید رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مکمل اپنے کام پہ مرکوز تھیں۔

"عائشے! حیا کی کال!" بہارے اس کا موبائل پکڑے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ عائشہ نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا' اور پھر موبائل تھام لیا۔

"سلام علیکم حیا۔" اب وہ فون کان سے لگائے ازلی خوش دلی سے رسمی باتیں کر رہی تھی۔ بہارے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باتیں سننے لگی۔

"پزل باکس؟" عائشے کی مسکراہٹ ذرا سمٹی' بھنویں الجھن سے سکڑیں۔ "تمہارا والا کدھر رکھا تھا؟"

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل اس لمحے زور سے دھڑکا تھا۔

"میں نے کل ہی پوری اسٹڈی کی صفائی اپنے سامنے کروائی ہے۔ اگر ہوتا تو مل جاتا۔ ہو سکتا ہے تم ساتھ لے گئی ہو؟ اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں دوبارہ دیکھ کر کرتی ہوں۔" اس نے موبائل بند کر کے میز پہ رکھا۔

"بہارے! تم نے حیا کا پزل باکس تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں!" بہارے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

"چلو پھر یوں کرتے ہیں کہ مل کر تلاش کرتے ہیں۔ مہمان کی چیز میزبان کے گھر میں کبھی کھونی نہیں چاہیے۔ بہت شرمندگی کی بات ہوتی ہے۔"

وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھ گئی۔ بہارے سر جھکائے اپنی بڑی بہن کے پیچھے چل دی۔ اس کے ذہن کے پردے پہ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

"یہ باکس میرے پاس ہے۔ یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک عبدالرحمن!" اس نے بے دلی سے زیر لب دہرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز جب عائشے نے اسے ایس ایم ایس کیا تب وہ ہالے کے ساتھ جمعہ کی نماز پہ ایوب سلطان جامعہ

آئی ہوئی تھی۔

نماز جمعہ پہ جامعہ میں خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ترک رسم کے مطابق کم سن بچے جمعے کی نماز پڑھنے سلطان کے مخصوص لباس میں آئے۔ سنہری پگڑی، سنہرا اور سفید زرتار لباس، میان میں تلوار، کامدار جوتے پہنے وہ ننھے سلاطین اپنی ماؤں کی انگلیاں تھامے ہر جگہ پھر رہے ہوتے۔

انصاری محلے میں ہالے کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پہلا دن یاد آیا تھا۔ وہ دن جو بہت طویل تھا۔ اب ان ساڑھے تین ماہ میں کتنا کچھ بدل چکا تھا۔

انصاری محلے میں استنبول کے بہترین اور سستے اسکارف ملا کرتے تھے۔ وہ اب سر ڈھکے بغیر باہر نہیں نکلتی تھی، مگر اس کے سارے دوپٹے شیفون کے یا ریشمی ہوتے، جو سر پہ نہیں ٹکتے تھے۔ اب وہ یہاں ایسے اسکارف لینے آئی تھی، جو سادہ اور ایک رنگ کے ہوں نہ کہ ایسے شوخ اور کام دار کہ ہر کسی کی توجہ گھیریں۔ اسے اب کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ جہان اس کا تھا، اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

وہ اپنے چند جوڑوں کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پیک کروا رہی تھی، جب میسج ٹون بجی۔ اس نے فون نکال کر خراش زدہ اسکرین کو دیکھا۔ عائشے کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"میں نے سارے گھر میں ڈھونڈا، مگر نہیں ملا۔ تم خود کسی دن آجاؤ، دوبارہ مل کر ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

اس نے ویک اینڈ پہ آنے کا وعدہ کر کے موبائل پرس میں رکھ دیا۔

"واپسی پہ جواہر چلتے ہیں، مجھے فون کی اسکرین ٹھیک کروانی ہے۔"

"شیور!" ہالے نے ہامی بھرلی۔ وہ ڈی جے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ ہالے ان لوگوں میں سے تھی، جو دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور بدلے کی توقع کے بغیر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ترکی کے پُر خلوص لوگ!

تاقسم سے انہوں نے انڈر گراؤنڈ میٹرو پکڑی۔ پہلا اسٹاپ چھوڑ کر وہ دوسرے پہ اتر گئیں۔ اسٹیشن سے باہر سامنے ہی جواہر شاپنگ مال تھا۔ بلند و بالا کھجور کے درخت، بلش چمکتا مال۔ روشنیوں کا سمندر۔

ہالے کچھ کھانے کے لیے ٹیک اوے کرنے ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی اور وہ بالائی فلور پہ فون ریپئرنگ شاپ پہ آگئی۔

"پانچ دس منٹ کا کام ہے میم! آپ کاؤچ پہ بیٹھ جائیں۔ میں ابھی کر دیتا ہوں۔" جس ترک دکان دار لڑکے نے اس سے فون لیا تھا، وہ فون کا معائنہ کر کے بولا۔

وہ سر ہلا کر سامنے کاؤچ پہ آ بیٹھی اور ریک سے ایک میگزین اٹھا کر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔

لڑکا اب شوکیس کے پیچھے کھڑا، اس کے موبائل کے ٹکڑے الگ کر رہا تھا۔ کیسنگ اتار کر اس نے بیٹری نکالی تو ایک دم رک گیا اور سر اٹھا کر قدرے تذبذب سے حیا کو دیکھا۔

"میڈم!" اس نے ذرا الجھن سے پکارا۔ حیا نے میگزین سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا ہوا؟"

"یہ لگا رہنے دوں؟"

"کیا؟" وہ رسالہ رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

"آپ کے فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ اسے لگا رہنے دوں؟"

"ٹریسر؟ میرے فون میں ٹریسر ہے؟" وہ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

"اوہ! آپ کو نہیں معلوم تھا اور جس نے یہ ٹریسر ڈالا ہے، وہ تو ہمہ وقت آپ کی لوکیشن ٹریس کر رہا ہو گا۔"

وہ بنا پلک جھپکے اپنے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر باریک ٹریسر کو دیکھے گئی۔

اور وہ سوچتی تھی، پاشا کو اس کی لوکیشن کا کیسے پتا چلتا ہے؟ یقیناً" اس کے پچھلے فونز میں بھی ٹریسرز ہوں گے۔ تب ہی۔

"یہ بہت سوفسٹی کیٹڈ ہے میم! وہ جب چاہے اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی سن سکتا ہے۔ اب اس کا کیا کروں؟"

وہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"اسے لگا رہنے دو۔"

"رئیلی؟" لڑکا حیران ہوا تھا۔

"ایک ٹریسر نکالوں گی تو وہ دس اور ڈال دے گا۔ اس لیے بہتر ہے میں اس کو اسی ٹریسر سے دھوکا دیتی رہوں۔ میں ہر جگہ اسے ساتھ نہیں لے کر جاؤں گی۔ خصوصاً" اس جگہ نہیں، جہاں میں نہیں چاہتی کہ اس کو پتا چلے۔"

"او ویری اسمارٹ!" لڑکا مسکرا دیا۔ "میں آپ کو کسی چھوٹی سی ڈبی میں یہ ڈال دیتا ہوں تاکہ آپ کو اسے بار بار فون سے علیحدہ نہ کرنا پڑے۔"

وہ اب احتیاط سے وہ ننھا سا ٹریسر نکال رہا تھا۔ حیا ابھی تک بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

عبدالرحمن پاشا..... وہ کیا کرے اس آدمی کا؟ وہ اپنا اتنا وقت اور توانائی اس پہ کیوں صرف کرتا تھا؟ کیا یہ اندھی محبت تھی؟ شاید کچھ اور؟



اندھیرے کمرے میں مدھم سبز نائٹ بلب کی روشنی بکھری تھی اور جزیرے کے ساحل سے سر ٹکراتی لہروں کی سرسراہٹ یہاں تک محسوس ہوتی تھی۔ عائشے آنکھوں پہ بازو رکھے قریباً" نیند میں جا چکی تھی۔ جب بہارے نے پکارا۔

"عائشے، بات سنو!" وہ چت لیٹی چھت پہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"ہوں؟" عائشے کی آواز نیم غنودگی سے بوجھل تھی۔

"جب بندہ بار بار جھوٹ بولتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟"

"اللہ اسے اپنے پاس.. "بہت جھوٹ بولنے والا" لکھ لیتا ہے۔"

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ عائشے کی آنکھوں پہ بازو تھا۔ شکر کہ وہ بہارے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"اپنے پاس کدھر؟ آسمانوں پہ؟"

"ہاں، آسمانوں پہ۔"

"کیا اس کے نام کے ساتھ "جھوٹا" کسی بڑے پوسٹر پہ لکھا جاتا ہے؟"

"شاید ایسا ہی ہو۔ اب سو جاؤ۔"

"عائشے! اگر اللہ تعالیٰ وہ پوسٹر آسمان پہ بچھا دے تو کیا سب کو اس کے نام کے ساتھ جھوٹا لکھا نظر آئے گا،" اس کی آواز میں انجانا سا خوف تھا۔

چشم تصور میں اس نے دیکھا، باہر تاریک آسمان پہ سرخ انگاروں سے لکھا تھا۔

"اناطولیہ کی بہارے گل..... بہت جھوٹ بولنے والی۔"

"ہاں، سب کو ہر جگہ سے وہ نظر آئے گا۔"

"جو گھر کے اندر، کمرے کے اندر ہو گا اسے بھی؟"

"ہاں، اب سو جاؤ بچے! صبح کام پہ بھی جانا ہے۔"

"اور اگر کوئی بیڈ کے نیچے گھس جائے، تو وہاں سے بھی آسمان نظر آئے گا؟"

"ہاں اور بہارے گل! تم اب بولیں تو میں تمہیں ٹرنک میں بند کر دوں گی۔"

عائشے جھنجلا کر بولی تھی۔ اس کی نیند بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ وہ سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ بہارے ذرا سی عائشے کے قریب کھسکی اور چہرہ اس کے کان کے قریب لے آئی۔

"عائشے!" اس نے بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔ "کیا ٹرنک کے اندر سے آسمان نظر آئے گا؟"

"اللہ اللہ!" عائشے نے غصے سے بازو ہٹایا۔ بہارے نے غڑاپ سے منہ کمبل کے اندر کر لیا۔

مگر اسے کمبل کے اندر سے بھی آسمان نظر آرہا تھا۔ سرخ انگارے اسی طرح دہک رہے تھے۔

اس شام وہ تاقسم اپنی سرخ ہیل ٹھیک کروانے آئی تھی۔ جب ہیل جڑ گئی تو وہ کسی خیال کے تحت شاپر

لیے اسکوائر کے مجسّمے کی طرف آگئی۔ ''استقلال ییمنی'' (مجسمہ آزادی)

مجسّمے کے گرد گھاس کے گول قطعہ اراضی کو مثبت کے نشان کی طرح دو گزر گاہوں نے کاٹ رکھا تھا، جس سے گول قطعہ چار برابر خانوں میں بٹ گیا تھا۔ کمپاس کے چار خانے۔ ہر سوٹیولپس کی مہک تھی۔

بہادر جرنیل اب مجسم صورت اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا۔ یہ وہ دوسرا پاشا تھا جس سے اس کو شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے وہ روز کلاس میں اسکارف اتارتی تھی اور ٹالی اس کو ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا کرتی۔ اس ایک آدمی نے اسے ہرا دیا تھا مگر۔

''انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔'' ڈی جے کہیں دور سے بولی تھی۔

وہ چند قدم مزید آگے چل کر آئی۔ اس نے مجسم ہوئے جنگجو کی پتھر آنکھوں میں دیکھا۔ یہ آدمی کیوں جیتا؟ کیونکہ یہ لڑنا جانتا تھا، کیونکہ اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ لڑتا رہا تھا یہاں تک کہ اسے فتح مل گئی اور ایک جنگجو کو کیسے ہرایا جاتا ہے؟ اس نے میجر احمد سے دل ہی دل میں پوچھا تھا۔

''اس سے مقابلہ کرکے۔ اس سے تب تک لڑ کے 'جب تک فتح نہ مل جائے یا جان نہ چلی جائے۔''

جواب فوراً'' آیا تھا۔ اگر وہ غلط ہو کر اتنا پر اعتماد تھا تو وہ صحیح ہو کر پر اعتماد کیوں نہیں تھی؟ وہ غلط ہو کر جیت سکتا ہے' تو وہ صحیح ہو کر کیوں نہیں جیت سکتی؟ وہ کیوں اتارے اسکارف؟ وہ ان لوگوں کے پیچھے اللہ کو کیوں ناں کرے؟ زیادہ سے زیادہ سبانجی والے نکال دیں گے' تو نکال دیں۔ مگر کیوں نکال دیں؟ نہیں' وہ نہ اسکارف اتارے گی' نہ میدان چھوڑے گی۔

وہ اتاترک کے مجسّمے کو یہی اسکارف لپیٹ کر سبانجی کے کلاس روم میں بیٹھ کر پڑھ کر دکھائے گی۔ مسجد میں جو فیصلہ میں نے کیا تھا' اسے بس اب پورا کرنا ہے ۔طیب اردگان کو قانون بدلنا پڑے' سو پڑے۔ وہ مزید اس ذلت سے نہیں گزرے گی۔ اللہ کی حدود مذاق نہیں ہوتیں۔ اب وہ اسکارف پہن کر ہی پڑھے گی' دیکھتے ہیں کون روکتا ہے اسے۔ اس کی ماں اسے روئے!

اتاترک کے مجسّمے کو دیکھتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر اپنے اسکارف پہ سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ نقاب نہیں کر سکتی' وہ برقع نہیں اوڑھ سکتی' مگر اسکارف اوڑھنا یہ ایک کام ہے جو وہ کر سکتی ہے' تو پھر اسے روکنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ کوئی رستہ تو ہوگا۔

''رستہ ضرور ہوتا ہے۔'' میجر احمد نے کہا تھا۔

رستے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اسے بھی رستہ ڈھونڈنا تھا۔

☼ ☼ ☼

آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اسکارف کو ٹھوڑی تلے پن سے جوڑا' پھر سامنے کے دو تکونے پلوؤں میں سے ایک کو مخالف سمت چہرے کے گرد لپیٹ کر سر کی پشت پہ پن سے لگا دیا۔ اسکارف خاصا بڑا تھا۔ دوسرے پلو نے سامنے سے اسے ڈھک دیا۔ نیچے سیاہ اسکرٹ پہ اس نے پوری آستینوں والا میرون پھول دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ توقع کے برخلاف' میرون اسکارف کے ہالے میں دمکتا اس کا چہرہ کافی اچھا لگ رہا تھا۔

کتابیں اٹھائے' بیگ کندھے پہ ڈالے جب وہ سبانجی کی مرکزی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو سامنے ہی ٹالی چند یورپین اسٹوڈنٹس کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ وہ گزرتے گزرتے آج کل حیا کے اسکارف پہ کوئی تبصرہ کر دیا کرتی تھی۔ اب بھی حیا کو آتا دیکھ کر اس کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

''حیا!'' اس نے زور سے آواز دی۔

حیا اسے نظر انداز کر کے تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آج اس کی پہلی کلاس ٹالی کے ہی ساتھ تھی۔

"Haya! what colour is yuor hair today ? blue ?"

حیا بنا کچھ کہے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے سے آتے قہقہے کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا آج کل جہاں ان لڑکیوں سے سامنا ہوتا' وہ اسے تمسخر سے عرب لڑکی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ بدتمیز نہ ہوں تو....

آج وہ بنا اسکارف اتارے کلاس میں چلی آئی اور دوسری قطار میں بہت اعتماد سے بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ٹالی اس کے ساتھ آبیٹھی۔

''تم نے اسکارف نہیں اتارا؟ کیا ابھی سب کے سامنے اتاروگی؟''

جواباً'' اس نے بہت اعتماد سے مسکرا کر ٹالی کو دیکھا۔

''دیکھتے ہیں!'' جتانے والے انداز میں کہہ کر وہ کتابیں جوڑنے لگی۔ اندر سے اس کا دل بھی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ آج کیا ہوگا؟ وہ اسے نکال دیں گے کیا؟

پروفیسر بابر صات نے ابھی لیکچر شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہ حیا پہ پڑ گئی۔

''مس... میرا نہیں خیال آپ کو کلاس روم میں اسکارف کرنے کی اجازت ہے۔'' وہ براہ راست اسے مخاطب کر کے بولے۔

بہت سے طلبا و طالبات گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ جو ساری بڑی بڑی باتیں' احادیث' آیات' اقوال' اس نے اس موقع کے لیے یاد کر رکھے تھے' وہ سب اسے بھول گئے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے پروفیسر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ٹالی بھی مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مس... آپ ہیڈ کورنگ ریموو کریں۔'' انہوں نے دہرایا۔

''جو اللہ سے ڈرتا ہے' اللہ اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے۔''

عائشے نے ایک دفعہ کہا تھا۔ مگر اسے سارے راستے بند نظر آرہے تھے۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' تب ہی پیچھے سے کوئی ترک لڑکی بول اٹھی۔

''سر! یہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہے۔ مہمان۔ اور یہ رول مہمانوں پہ اپلائی نہیں ہوتا۔'' اس نے جلدی سے اپنے پروفیسر کو کچھ یاد دلایا تھا۔

''اوہ سوری' آپ مہمان ہیں؟ پلیز تشریف رکھیے۔'' پروفیسر بہت شائستگی سے معذرت کر کے لیکچر شروع کرنے لگے۔

ٹالی کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ حیا نے ایک نظر اسے دیکھا' اور دھیرے سے مسکرائی' پھر گردن موڑ کر پیچھے اپنی محسنہ کو دیکھنا چاہا' لیکچر شروع ہو چکا تھا' تمام سر جھکنے لگے تھے۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ نہیں پائی' سو چہرہ واپس موڑ لیا۔ اس کے دل و دماغ سن سے ہو چکے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ سب اتنا آسان ہوگا' اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

''یہیں رکھا تھا' کہاں جا سکتا ہے۔'' وہ ویک اینڈ پہ بیوک ادا آئی تھی اور اب عائشے اور بہارے کے ساتھ مل کر ساری اسٹڈی چھان کر مایوسی سے کہہ رہی تھی۔ ''وہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسے کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔''

ساتھ کھڑی بہارے کا چہرہ زرد اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت دھیرے سے چل رہے تھے آج۔ شاید وہ بیمار تھی۔

''تمہیں کیا ہوا بہار کا پھول؟'' وہ بہارے کا یہ پژمردہ انداز کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی' سو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

بہارے نے گردن اٹھا کر خالی خالی' خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہی پرانا مسئلہ' صبح بہارے کو ایک سیپ ملا' جس میں موتی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے تو آج ایک بھی سیپ

نہیں ملا۔" عائشے اپنے گھر سے پزل باکس کھو جانے پہ بہت اداس تھی۔

"اب میرے سیپ سے موتی کبھی نہیں نکلے گا۔" بہارے بڑبڑائی۔ وہ دونوں محسوس کیے بنا اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔

"وہ باکس عبدالرحمٰن کے ہاتھ نہ لگ جائے' مجھے اسی بات کا ڈر ہے۔ وہ باکس اس کو نہیں ملنا چاہیے عائشے!"

بہارے کی جھکی گردن مزید جھک گئی۔

"ملازمہ کبھی چوری نہیں کرتی' اس نے بھی باکس نہیں دیکھا۔ کہاں ڈھونڈیں۔"

حیا تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پہ گر سی گئی۔ اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری حیا!" عائشے نے آزردگی سے کہا۔ اسی پل کمرے میں دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں۔ حیا نے چونک کر بہارے کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہولے ہولے رو رہی تھی۔

"بہارے! کیا ہوا؟" وہ دونوں بھاگ کر اس کے پاس آئیں۔ بہارے نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"وہ باکس عبدالرحمٰن کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔"

"کیا؟" وہ سانس لینا بھول گئی۔ عائشے خود ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

"مگر مجھے پتا ہے کہ اس نے وہ کدھر رکھا ہے۔ میں تمہیں لا دیتی ہوں۔" بہارے ایک دم اٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ دونوں بالکل ساکت' ششدر سی اپنی جگہ کھڑی تھیں۔

پانچ منٹ بعد ہی بہارے واپس آئی تو اس کا بھیگا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پزل باکس تھا۔ وہ حیا کا پزل باکس ہی ہے' اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

"یہ لو۔ تمہاری امانت۔" اس نے باکس حیا کی طرف بڑھایا۔

"بہارے گل! حیا سلیمان تم سے بہت پیار کرتی ہے۔" اس نے بے اختیار جھک کر اس ننھی پری کے دونوں گال چومے۔ "اور تم اس کو ڈانٹنا مت۔ سچ بولنے پہ کسی کو ڈانٹا نہیں کرتے۔" اس نے ساتھ ہی عائشے کو کہہ دیا تھا' جو بہارے سے ذرا سی خفا لگ رہی تھی' مگر اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

آنے کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ حیا کو واپس چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئیں۔ بہارے قریبی کلب سے عبدالرحمٰن کا گھوڑا لے آئی تھی اور اب اس پہ بیٹھی ان دونوں کے عقب میں چلی آ رہی تھی۔

"اسے عبدالرحمٰن نے رائیڈنگ سکھائی ہے۔ بہارے سے اچھی رائیڈنگ پورے ادا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ عبدالرحمٰن کا نام وہ آخری نام تھا۔ جو اس وقت وہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے اس کا باکس کیوں رکھا' وہ یہی سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم پہ یہ اسکارف بہت اچھا لگتا ہے حیا! اسے کبھی مت چھوڑنا۔"

"نہیں چھوڑوں گی۔ میں سبانجی سے جیت گئی' میں اتاترک سے جیت گئی' مجھے اور کیا چاہیے۔"

"تمہیں کچھ بھی چھوڑنا پڑے' اسے مت چھوڑنا!" عائشے نے دہرایا۔ حیا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ان کے عقب میں گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھی بہارے نے اچنبھے سے عائشے کو دیکھا تھا۔ اس کی بہن اتنے اصرار سے اپنی بات دہراتی تو نہیں تھی' پھر اب کیوں؟

☼ ☼ ☼

معتصم نے جلی ہوئی اطراف والے پزل باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر ایک بڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا' جو اس کے ساتھ گھاس پہ پڑا تھا۔

"پہلے فلوٹیلا کے لیے فنڈ دو۔"

"اوہ شیور!" وہ گھاس پہ بیٹھتے ہوئے پرس سے پیسے نکالنے لگی۔ چند نوٹ ڈبے کی درز میں ڈال کر اس نے دیکھا' اس پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔

"فریڈم فلوٹیلا 2010۔"

وہ مئی 2010 تھا' اور اسی ماہ کے آخر تک فلوٹیلا نے غزہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہ بات اب تک فلسطینی بہت دفعہ دہرا چکے تھے۔

گھاس کے آگے مصنوعی جھیل دوپہر کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ معتصم اس چمکتی دھوپ میں باکس پکڑے کافی دیر تک اسے الٹ پلٹ کر کے دیکھتا رہا۔

"یقین کرو! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا' مگر اس "ہومر" والی پہیلی کو حل کرنا آسان ہو گا۔ ٹھہرو! کوشش کرتے ہیں۔" اس نے جلی لکڑی پہ لکھے سنہرے حروف پڑھے۔

Marked on homer's doubts

A stick with twin sprouts

"ہومر وہی فلسفی تھا نا جس کے بارے میں ہراقلیطس نے کہا تھا کہ اسے درے مارے جانے چاہئیں؟"

اس کے کہنے پہ معتصم نے سر اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔ یونانی فلسفہ وہ آخری شے تھی' جو اسے دلچسپ لگتی تھی' مگر شاید میجر احمد کا حساب الٹا تھا۔

"ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ اسٹک۔ یہاں کسی نشان کی بات ہو رہی ہے۔ ہومر کے شبہات' مگر کیسے شبہات؟" وہ سوچنے لگا۔

"معتصم! نشان تو کسی کے لکھے ہوئے کام پہ ہی لگایا جا سکتا ہے نا' تو کیا ہومر کے لکھے ہوئے کام میں کسی کے شکوک و شبہات کا ذکر ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا' مگر اس کے اپنے کام میں جو حصہ بعد میں آنے والے ناقدین کو مشکوک لگتا ہے' اسے مارک ضرور کیا گیا ہے۔"

"کیسے مارک کیا گیا ہے؟" وہ چونکی۔ "کسی خاص نشان سے؟"

"مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ہومر کے کام میں مشتبہ حصہ ہوتا ہے' اس پہ Obelus کا نشان لگا کر مارک کیا جاتا ہے۔"

"Obelus کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں اوبلس کا نہیں پتا؟ یہ ہوتا ہے اوبلس!" اس نے رجسٹر کے صفحے پہ ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ لگا دیا۔

"یہ تو تقسیم کے سمبل ہے۔ اس طرح کھونا۔" اس نے پزل باکس کی سلائیڈ اوپر نیچے کیں' یہاں تک کہ پورا لفظ "اوبلس" لکھا گیا' مگر باکس جامد رہا۔

"یہ صرف پہلی پہیلی کا جواب ہے حیا! ہمیں ان چاروں کے جواب تلاش کر کے ان میں سے مشترک بات ڈھونڈنی ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

حیا نے بددلی سے پزل باکس اسے تھما دیا۔ وہ اس وقت خود کو بہارے کی طرح محسوس کر رہی تھی' اپنے تحفے کے اتنے قریب مگر اتنی ہی دور اور بے بس۔ بہت بے بس۔

☼ ☼ ☼

شام کا اندھیرا استقلال اسٹریٹ پہ اتر آیا تھا۔ گلی کی رونق اور روشنیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ وہ اور ہالے کافی دنوں بعد استقلال اسٹریٹ آئی تھیں۔ امتحان قریب تھے سو نکل ہی نہیں پائی تھیں۔ اب نکلیں تو ڈی جے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ خریدا انہوں نے کچھ نہیں' بس ونڈو شاپنگ کرتی رہیں۔ وہ آٹھ بجے والے گورسل سے آئی تھیں۔ گورسل کو واپس رات کے ڈیڑھ بجے جانا تھا' سو تب تک ان کا ارادہ خوب اچھی طرح سے جدیسی میں گھومنے کا تھا۔

"پہلے تو برگر کنگ میں ڈنر کر لیتے ہیں' ٹھیک؟" وہ اس روز کے بعد جہان سے بھی نہیں ملی تھی' سو چا اب مل لے۔

"تمہاری صلح ہو گئی اس سے؟" وہ برگر کنگ کے دروازے پہ تھیں۔ جب ہالے نے پوچھا۔ حیا نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ہنس پڑی۔

"وہ بات تو بہت پرانی ہو گئی۔ اب تک بہت کچھ بدل چکا ہے۔" وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ سیاہ

اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اس میں دمکتا اس کا چہرہ بہت مطمئن لگ رہا تھا۔

"ہاں! لگ تو رہا ہے۔" ہالے شرارت سے مسکرائی۔ حیا نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ پلاٹینم رنگ رات کی مصنوعی روشنیوں میں چمک رہی تھی۔

"واٹ؟ تمہاری جہان سکندر سے منگنی ہو گئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟" ہالے خوشگوار حیرت سے کہہ اٹھی۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اطراف میں لوگ آجا رہے تھے۔

"مگر ہماری شادی منگنی سے پہلے ہوئی تھی۔ یہی کوئی بیس اکیس سال پہلے۔ لمبی کہانی ہے ڈنر کے بعد سناؤں گی۔" وہ جلدی سے ہالے کا بازو تھامے اندر چلی آئی۔ آج اس نے وہی سرخ ہیل پہن رکھی تھی اور ذرا احتیاط سے چل رہی تھی۔

"جہان تو چھ بجے آف کر گیا تھا۔ ابھی گھر پہ ہو گا۔" وہاں کام کرنے والے لڑکے نے بتایا۔ اسے مایوسی ہوئی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"مجھے پوری کہانی سناؤ۔ تم نے اتنی بڑی بات نہیں بتائی؟" ہالے پر جوش بھی تھی اور سارا قصہ سننے کے لیے بے تاب بھی۔

"چلو! تاقسم چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر سناتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

چند قدم کا تو فاصلہ تھا۔ باتوں میں ہی کٹ گیا۔ وہ اسکوائر پہ آئیں تو جگہ جگہ بارش سے گیلی سڑک چمک رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار اپنے پاؤں کو دیکھا۔

"یہیں ٹوٹی تھی میری ہیل۔" اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی مرمت شدہ ہیل کو دیکھا۔ لکڑی کی بہت باریک ہیل اب بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ پھر کتنا خوار کرایا تھا اس نے اس دن۔ سرخ ہیل، سرخ کوٹ، برستی بارش۔ اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔

"آؤ پارک میں چلتے ہیں۔" ہالے اسے بلا رہی تھی مگر وہ اسی طرح کھڑی سر جھکائے اپنی ہیل کو دیکھ رہی تھی۔ لمحے بھر کو ان کے گرد جگمگاتا اسکوائر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اپنی ہیل دیکھ رہی تھی۔

یہیں ٹوٹی اس کی ہیل یہیں... یہیں۔

Snapped there a bloody pine

بلڈی؟ یعنی خون... مگر خون سرخ ہوتا ہے۔ سرخ لکڑی... لکڑی کی ہیل...

Split there some tears divine

اس کی متحیر نگاہوں نے تاقسم اسکوائر کا احاطہ کیا۔ آفاقی آنسو، آسمان کے آنسو... بارش۔ نہریں "تقسیم" ہوتی تھیں اس جگہ۔

Roud the emerald crusified

اس کی نظریں مجسمے کے گرد پھیلے گھاس کے قطعہ اراضی پہ جم گئیں، جنہیں دو گزرگاہیں صلیب کے نشان کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ زمرد گھاس جو مصلوب تھی۔

And the freedom petrified

ساکن ہوئی، پتھریلی آزادی۔ یقیناً "مجسمہ آزادی"... اتاترک کا مجسمہ استقلال یمینی

A love lost in symbolic smell

پیار جو کھو گیا؟

"ڈی جے..." اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ادھر ساتھ استقلال جدیسی میں ڈی جے کری تھی اور روز تاقسم اسکوائر میں ٹیولپس کی مہک پھیلی تھی۔ علامتی خوشبو... ٹیولپس جو استنبول کی علامت تھے۔

Under which the lines dwell

اس جگہ کے نیچے کیا تھا؟ لکیریں نہیں لائنز۔ ہاں! میٹرو لائنز، ریلوے لائنز۔ نیچے ریلوے اسٹیشن تھا۔

ایک ایک کر کے پزل کے سارے ٹکڑے جڑتے جا رہے تھے۔

obelus کا نشان کس چیز کا نشان تھا بھلا؟

"حیا... یہ آدمی ہمیں فالو کر رہا ہے۔" ہالے نے اس کا بازو جھنجھوڑا۔ وہ ہالے کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ کسی خوابیدہ کیفیت میں... وہ بڑبڑائی۔

"Taksim پورے چھ حروف۔" اس کی آنکھوں

میں بے یقینی تھی اس نے پزل حل کر لیا تھا۔

"حیا...! یہ آدمی ہمارے پیچھے آرہا ہے۔" ہالے کی آواز میں ذرا سی گھبراہٹ تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی اور پلٹ کر دیکھا۔

سڑک کے اس پار کھڑا شخص اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ ایک دم برف کا مجسمہ بن گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی؟

عبدالرحمٰن پاشا۔

آنے کے ساتھ اور انفرادی کتنی ہی تصویروں میں وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جس شناسائی سے مسکرایا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

"چلو! واپس اسٹریٹ میں چلتے ہیں۔" وہ ہالے کا ہاتھ تھامے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتے، تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے وہ دونوں اس شخص سے دور جا رہی تھیں۔ جب حیا کو یقین ہو گیا کہ وہ ان کو کھو چکا ہے تو اسی طرح ہالے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ایک کافی شاپ میں آگئی۔

"پتا نہیں کون تھا۔" انہوں نے ایک کونے والی میز کا انتخاب کیا تھا۔ ہالے دو مگ گرما گرم کافی کے لے آئی اور اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی اس آدمی کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

"ہاں! پتا نہیں کون تھا؟" اس نے لاتعلقی سے شانے اچکائے اور گرم کپ لبوں سے لگایا۔ ایک دم ہی کافی کا گھونٹ کسی تلخ زہر کی طرح اس کی گردن کو جکڑ گیا۔ اسے سامنے سے پاشا آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ کافی شاپ میں کب داخل ہوا انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"ہالے وہ ادھر ہی آگیا۔" اس نے سراسیمگی کی سی کیفیت میں کپ نیچے کیا۔ ہالے نے پریشانی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عین ان کے سر پہ آپہنچا تھا۔

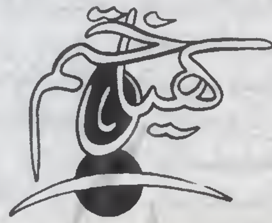
"کیا میں آپ کو جوائن کر سکتا ہوں مسز جہان سکندر؟" کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لمبی سرمئی برساتی میں ملبوس، وہ اچھا خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ فریم لیس گلاسز کے پیچھے سے چھلکتی آنکھوں میں واضح مسکراہٹ تھی۔ وہ لحہ ملاقات جس سے اس کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا، اس وقت بے حد خوف زدہ کر گیا تھا۔

"جی! ضرور بیٹھیے۔" اس نے کپ پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

ہالے نے اسے آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ حیا نے سمجھ کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی۔ جیسے ہی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا اس نے گرما گرم کافی اس کے چہرے پہ الٹ دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید



"میں فون کر رہی تھی اور تمہارا فون آف تھا۔ کہاں تھے تم' کیوں کیا فون آف؟" اجالا نے بمشکل اس کے پانی پینے کا ہی انتظار کیا تھا۔ واصف کی آنکھیں سکڑیں' جو اکثر ایسے وقت ہی سکڑ جایا کرتی تھیں۔

"بیٹری ختم ہو گئی تھی۔"

اجالا نے سامنے ٹیبل پر رکھے موبائل کو اس کے سامنے آن کیا۔ "بیٹری تو ہے دو پوائنٹس ہیں ابھی۔"

"پتا نہیں! ایسے ہی رکھے رکھے بند ہو گیا۔ میں سمجھا بیٹری ختم ہو گئی۔"

"آں.... نیا موبائل ہے اور رکھے رکھے بند ہو گیا؟"

"مجھے کیا معلوم کیسے ہوا؟" وہ چڑ گیا۔

"جب معلوم ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔ سالن بن چکا ہے۔ میں روٹی بنا کر کھانا لگا دوں گی۔"

"کیا مطلب...؟ واصف نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کھانا لگاؤ۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ میں بھی تھک گئی ہوں کام سمیٹ کر' مجھے بھی آرام کرنا ہے۔ تم اتنی دیر سے آئے ہو۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے پریشان الگ ہو گئی تھی۔ اب تم سچ بتاؤ تو میں کھانا لگا دوں۔"

"یار! کہا تو ہے آف ہو گیا تھا.... تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں۔ ہر بار گھر آتے ہی سوال' سوال' تکرار۔"

"ہر بار...." وہ حیرت سے چیخی۔

"ہاں! ہر بار.... تم اتنے سوال کرتی ہو' ایک بات کو اتنا کھینچتی ہو اور پھر میرا یقین بھی نہیں کرتیں۔"

"تو مجھے یقین دلاؤ نا۔ جو کچھ تم نے بتایا' اس پر نہیں آیا یقین' جب آجائے گا تو کر لوں گی۔"

"کب آئے گا یقین...؟"

"یقین ہمیشہ سچ پر آتا ہے۔"

"تو میں ڈراما کر رہا ہوں؟"

"معلوم نہیں' خود سے پوچھو اور مجھے بھی بتاؤ۔"

"کیا تم کبھی کسی بات کو بغیر بحث کیے جانے نہیں دے سکتیں' اسے ویسے ہی نہیں مان سکتیں' جیسے میں بتاتا ہوں۔"

"شاید کبھی ایسا کر لوں' لیکن آج نہیں۔" وہ اسی انداز سے بولی' جس انداز سے وہ منواتی تھی' مانتی نہیں تھی۔

"مجھے نہیں یاد کہ میرے موبائل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کھانا دو مجھے' ورنہ میں بھوکا سو جاؤں گا۔"

"ایک اور جھوٹ.... میں جانتی ہوں کہ تمہیں سب یاد ہے۔"

"ہاں یاد ہے' سب یاد ہے۔ میں نے خود کیا تھا آف... پھر؟"

"پھر...؟" وہ اسے گھورنے لگی۔ "پھر یہ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"بس کر دیا' میری مرضی' میرا دل کر رہا تھا۔"

"بہت اچھا کیا' تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ کوئی ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے۔ گھر میں تمہاری بیوی تمہارے دو بچے رہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں گر سکتی ہوں' کھانا پکاتے ہوئے جل سکتی ہوں' تمہارے کپڑے دھوتے ہوئے مجھے کرنٹ لگ سکتا ہے اور کچھ نہیں تو میں مر بھی سکتی ہوں۔"

"دیکھا۔ اپنے مطلب کے رنگ دینا تم کتنا اچھی طرح سے جانتی ہو' صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ہاں کیا تھا آف.... اور دیکھو' کیا کیا کہہ رہی ہو۔ ایک تو سچ بولا اور...."

"تو یہ سچ پہلے کیوں نہیں بولا....؟"

"اس سب ڈرامے سے بچنے کے لیے' جو تم اب

کر رہی ہو۔"
"یہ ڈراما ہے۔" اس کی آواز اونچی ہوگئی۔ "تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں، تم سے گپیں لگانے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔"
"تم روزانہ مجھے فون کرتی ہو تو کیا وہ ایمرجنسی ہونے پر کرتی ہو؟"
"روزانہ ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ کبھی ہو تو سکتی ہے نا۔"
"کیا ایمرجنسی تھی آج...؟" اس نے تحمل سے پوچھا جس پر وہ اور چڑ گئی۔
"تھی نہیں، ہو سکتی تھی نا!" اسے اور غصہ آگیا اس کے انداز پر۔
"تھی تو نہیں نا۔" وہ زیرلب مسکرانے لگا۔ "نہ تم گریں، نہ تم جلیں نہ ہی تمہیں کرنٹ لگا۔"
"اپنی غلطی مت ماننا۔ میرا مذاق بنالو پہلے تم۔"
"کون سی غلطی.... کس کا خون کردیا ہے میں نے۔" اسے غصہ آگیا تو وہ جو کھڑی تھی عین اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور منہ پھلائے اسے دیکھنے لگی۔ یہ اس بات کی نشان دہی تھی کہ اسے اس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ اس سے ناراض بھی ہے اور اب اسے اس کی طرف اسی ایک انداز میں تب تک دیکھتے رہنا تھا، جب تک وہ اسے یقین نہیں دلا دے گا۔
"تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟" وہ اس کے مسلسل اس طرح دیکھتے رہنے کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔
اجالا نے آنکھوں کے زاویے کو ایسے بدلا جیسے سنا ہی نہیں کہ اس نے کیا کہا ہے۔
"آفس میں ایک کلائنٹ کے ساتھ گرما گرمی ہوگئی پھر گاڑی راستے میں خراب ہوگئی۔ جیسے تیسے اسے ٹھیک کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تمہاری کال آئے گی۔ میں نے پہلے ہی فون آف کردیا۔ میں اس وقت کسی سے بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔"
"مجھ سے بھی نہیں؟"
"نہیں!"
"تو تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ فون خود بخود بند ہوگیا تھا۔"
اگر میں کہتا کہ میں نے خود کیا تھا تو اس سے زیادہ خطرناک صورت حال ہوتی۔ سوچا تھا ایک ہی بات کہہ کر بات ختم کردوں گا لیکن میری غلط فہمی تھی، تم تو اچھا خاصا شک کرتی ہو مجھ پر۔"
"میں نے کب تم پر شک کیا؟"
"کب نہیں کیا' دن میں سو بار بیل کرتی ہو یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا فون بزی تو نہیں۔" واصف نے خفا ہو کر منہ بنایا۔
"فون بزی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں چیک کرتی۔ تمہارا دل چیک کرتی ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
"ابھی تک تمہیں میرے دل پر یقین نہیں آیا۔" وہ اور خفا ہوگیا اور وہ اسے خفا ہی چھوڑ کر کچن میں آگئی۔ کچھ ہی دیر میں واصف بھی وہیں تھا۔
"میں تمہارے لیے اتنی مشقت کرتا ہوں۔ میرا شکریہ ادا کیا کرو۔" اس کے عین پیچھے کرسی پر بیٹھے وہ اس کی کمر پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ شادی کے بعد سے یہ اس کا پسندیدہ کام رہا تھا۔
"تم بھی میرا شکریہ ادا کرو میں تمہارے گھر اور تمہارے بچوں کے ہزار کام روزانہ کرتی ہوں اور مجھے تو اتوار کی چھٹی بھی نہیں ملتی۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔
"لیکن میں تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔"
"میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں....."
"لیکن تم شک بھی کرتی ہو' مجھے جھوٹا فریبی کہتی ہو۔"
"میں کہتی بھی ہوں اور ثابت بھی کرتی ہوں کہ تم جھوٹے فریبی ہو۔ میرے پاس شک کرنے کی وجہ ہوتی ہے جبکہ تمہارے پاس نہیں ہوتی۔"
"وجہ.... وجوہات ہیں اجالا! میکے کی تقریبات میں تم کیسے اپنے چھوٹے بڑے ہر سائز کے کزن کے ساتھ

ہنسی مذاق کرتی ہو۔ کیسے ان کی گردنیں دبوچتی ہو تمہارے ہی خاندان کے دور نزدیک کے رشتے دار تمہیں شک کی نظروں سے گھورتے ہیں میں تو پھر تمہارا شوہر ہوں۔"
"تم بھی گھور لیا کرو۔" روٹی بنا کر وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ "کر لیا کرو سوال جواب۔"
"کر لیتا اگر وہ سب شکوک میری محبت سے قد میں بڑے ہوتے۔"
"تمہاری محبت کا قد بڑا نہیں ہے۔ میری اپنی ذات کا یقین تمہیں کوئی شک کرنے نہیں دیتا۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی خواب میں بھی تمہیں فریب نہیں دے سکتی۔ میری ذات کو لے کر تمہاری ذات میں کوئی الجھاؤ نہیں کیونکہ میں نے الجھاؤ بننے ہی نہیں دیا۔ اس الجھاؤ کو اپنے اندر سے کاٹ کر ہمیشہ کے لیے پھینک دیا ہے۔"
"تو تمہارے خیال میں میرے اندر الجھاؤ ہے جو تمہیں الجھا دیتا ہے؟"
"کچھ تو ہے۔" اس نے ایسے کہا جیسے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتی۔
"یعنی سب تمہاری ہی خوبی ہے اور میری محبت کا تو کمال ہی نہیں۔ اتنی محبت کرتا ہوں۔"
اور وہ ایسے سرہلانے لگی جیسے وہ اس کی باتوں پر ہلایا کرتی تھی تب سے جب وہ اسے یونیورسٹی میں کہا کرتا تھا کہ اسے اس کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ ہنسی روکے سرہلایا کرتی تھی چہرے پر وہی تاثر ہوتا تھا جو ایک نادان کی بات سن کر کسی بزرگ کے چہرے پر آجاتا ہے۔ شروع میں واصف کے لیے یہ صرف اس کی ایک ادا تھی' پھر جیسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گیا۔ پہلے وہ اس سے لڑتا جھگڑتا تھا' اسے قائل کرتا تھا' ناراض بھی ہو جاتا تھا' پھر وہ اسے صرف دیکھ کر رہ جاتا۔
"نہ مانو ہم کیا جانو میرے دل کا عالم...."
"بات یہی تو ہے کہ یہ دل تمہارا نہیں ہے۔"
"تو....!"
"تو یہ کہ ہم اپنی چیزوں کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" اجالا نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔
"دیکھا... دیکھا... پھر وہی بات! تمہیں مجھے چڑانے میں مزا آتا ہے نا!"
"شاید! کیونکہ تمہیں چڑاتے ہوئے میں اپنے دل کے شکوک کا اظہار کر جاتی ہوں۔" اس نے مکمل سنجیدگی سے کہا۔
"کیسے شکوک... بولو جبکہ میں نے تم سے کیا اپنا ہر وعدہ پورا کیا ہے۔" واصف نے کھانا ختم کرکے اپنی اور اس کی پلیٹ اٹھائی اور انہیں دھونے لگا۔
"گھر کے کاموں میں تمہاری مدد کرتا ہوں آفس سے سیدھا گھر آتا ہوں۔ تمہارا اتنا خیال رکھتا ہوں' تمہاری الٹی سیدھی باتوں کا جواب دیتا بھی ہوں اور انہیں برداشت بھی کرتا ہوں۔"
"لیکن ایک وعدہ رہتا ہے۔" کچن کی سلیب صاف کرتے اس کے ہاتھ رکنے لگے۔ "صرف میرے ہی رہنے کا۔"
وہ دل کھول کر ہنسا اور اس کا رخ اپنی طرف کیا۔
"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔"
"مجھے خود نہیں معلوم کہ مجھے یقین کیوں نہیں۔"
"گزرے وقت کا حساب کتاب کرکے مجھ پر یقین کرلو۔"
"لیکن میں تو آنے والے وقت کا حساب کتاب کرتی ہوں۔" اور وہ پھر دل کھول کر ہنسا۔
ان کی ایسی تکراریں ہزاروں بار ہوتی تھیں۔ ان کی پہلی ملاقات سے' محبت کے پہلی بار اظہار سے' اس کے ساتھ زندگی شروع کرنے کے پہلے دن سے....
"اجالا پاگل ہے۔" اکثر تکرار کے اختتام پر وہ اس

کے کان کے پاس آکر چلا کر کہتا۔
"واصف پاگل تھا۔" وہ بھی اسی انداز میں کہتی۔
"میری آنکھوں میں دیکھو! کیا یہ کسی پاگل کی آنکھیں ہیں؟ کیا پاگل ایسے ہوتے ہیں؟ یہ تو رانجھے کی سی آنکھیں ہیں۔"
"رانجھا کبھی محبت سے سیر نہیں ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں اور۔۔۔ اور ہوا ہوگا کیا پتا۔۔۔۔"
"رانجھے پر بھی شک! پھر بھی اس کی زندگی میں صرف ہیر ہی تھی کیونکہ شاید اسے اور۔۔۔۔ اور محبت ہیر سے ہی چاہیے تھی۔"
"مطلب؟"
"چھوڑو مطلب۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے گول گول گھمانے لگا ساتھ وہ گنگنا بھی رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

ایک روز وہ رات گئے ایسے کسی کزن کے ساتھ گھر واپس آیا۔ اس کے بار بار فون پر وہ صرف اتنا ہی کہتا رہا کہ وہ بس گھر آ ہی رہا ہے اور وہ "بس" پانچ گھنٹے بعد ہی آیا۔ دو تین بار اس کے مزید فون کرنے پر وہ جیسے غصے میں آگیا۔
"آرہا ہوں نا یار! کہا تو ہے۔" اس کے انداز نے اجالا کا خون جلا دیا۔
"پانچ گھنٹوں میں تمہیں پانچ منٹ نہیں ملے کہ تم اطمینان سے مجھے فون کرکے بتادو کہ تم کہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو۔ کب تک آجاؤ گے۔" اس کا کزن فیصل جا چکا تھا اور اب وہ عین اس کے سامنے بیٹھا تھا۔
"اگر میں فون نہیں بھی کرتی تو تمہیں چاہیے کہ تم کرو اور مجھے بتاؤ۔ ایک لاکھ دفعہ میں نے فون چیک کیا، ہاتھ میں فون لیے لیے میرا جسم شل ہو گیا اور تم اپنے کزن کو شاپنگ کرواتے رہے تم گاڑی میں بیٹھ کر کسی دکان کے کونے میں کھڑے ہو کر مجھے اطمینان سے ساری بات نہیں بتا سکتے تھے۔۔۔۔ بیوی پرانی ہو گئی ہے، اس نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں، وہ سو سکے گی یا نہیں تمہیں پروا نہیں۔"
"فیصل کے پاس وقت کم تھا، اسے واپس دوسرے شہر جانا تھا۔ یقین کرو، اتنی بری طرح سے ہم الجھ گئے خریداری میں کہ اس سب کا خیال ہی نہیں رہا۔"
"مجھے یہ مت بتاؤ کہ تم کتنے مصروف تھے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس مصروفیت میں سے کچھ وقت نکالنا کیا مشکل تھا؟"
"ہاں! مشکل تھا۔" اس نے صاف کہا۔ اس بات سے اجالا کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "بیوی سے بات کے لیے وقت نہیں۔۔۔ واہ۔" وہ سوں سوں کرکے رونے لگی۔
"یہی تو بات ہے یار! تمہیں ایک بات یونہی کہہ دو تم اسے سچ جان لیتی ہو۔" اس کے روتے ہی اس نے بچوں کی طرح اس کے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔ "اکثر باتوں کے وہ مطلب نہیں ہوتے جو نکالے جاتے ہیں۔"
"میں وہی مطلب نکالتی ہوں جو تمہاری باتوں میں ہوتا ہے۔ رات کے ایک بجے تم گھر واپس آرہے ہو اور تم چاہتے ہو کہ میں تم سے کچھ پوچھوں بھی نہیں۔" خود کو اس کے حلقے سے آزاد کروا کر وہ بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔
"میں شرمندہ ہوں۔" وہ تیزی سے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
"مجھے پروا نہیں۔"
"تم ناراض ہو؟" اس نے انگلی سے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔
"تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔"
رات گئے تک وہ اسے مناتا رہا۔ وہ اسے منا منا کر تھکتا نہیں تھا۔ یونیورسٹی سے ہی یہ اس کا پسندیدہ کام رہا تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار ناراض ہوتی، بات کتنی ہی معمولی ہوتی، مانتی وہ اپنی مرضی سے ہی تھی۔
"تم تھکتی نہیں ہو ناراض ہو ہو کر؟" وہ اکثر اس کے ناراض ہونے پر بار بار پوچھتا۔
"تم نہیں تھکتے مجھے منا منا کر؟"

"نہیں! مجھے اچھا لگتا ہے تمہارا ناراض ہونا، بات بات پر لڑنا، ہزاروں بار ہزاروں سوال کرنا، ہر بار ایک نیا انداز، ایک نیا کھیل۔"
"میں کھیل ہوں؟"
"کھیل سے کم بھی نہیں ہو۔ تمہیں یہ سوچ کر اطمینان نہیں ہوتا کہ ہر بار تمہارے نئے انداز کے ساتھ میری محبت کا انداز بھی نیا ہوتا ہے۔"
"آں۔۔۔ لیکن مجھے تو لفظ "نئے" نے سوچ میں ڈال دیا ہے۔ تم اتنے متلاشی ہو، نئے پن کے؟"
"اوہ۔۔۔۔ یعنی تم اپنی بات کو پھر سے اپنی مرضی کا رنگ دینے جا رہی ہو؟"
"میرا خیال ہے۔ میں تمہاری بات کی گہرائی میں جا رہی ہوں۔"
"میری بات میں کوئی گہرائی نہیں، یہ صرف ایک بات ہے۔"
"اس کا مطلب کہ تمہاری باقی باتیں بھی صرف باتیں ہی ہیں۔ صرف باتیں۔ ہیں نا؟"
"میرے پاس اتنا دماغ نہیں کہ یہ سب سوچوں لیکن تمہارا دماغ بہت گہرا ہے۔"
"شاید واقعات دماغ کو گہرا بنا دیتے ہیں۔" وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں بچے سو چکے تھے اور وہ دونوں لان کی طرف بنی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔
"کیا؟" واصف کی شکل سوالیہ بن گئی وہ جانتا تھا اس کا اس طرح سے دیکھنا۔
"تم بتاؤ کیا۔۔؟" اجالا نے دیکھتے رہنے کا کام جاری رکھا۔ "کچھ تو ہوگا بتانے لائق۔"
"میں نے کیا کہا اب؟" وہ حیران ہوا۔
تم نے ان میں کسی کو میسج کیا، پھر سینٹ آئٹم اور ان بکس میں سے میسجز ڈیلیٹ کردیے۔ باقی میسجز رہنے دیے۔ تم نے وہی میسج کیوں ڈیلیٹ کیا؟
"کون سا میسج۔۔۔ مجھے نہیں یاد۔"
"اداکاری مت کرو پلیز۔"
"یار! کردیا ہوگا ڈیلیٹ۔ اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔"
"یہی میں سوچ رہی تھی کہ آخر میسج میں ایسا کیا تھا کہ اسے ہی خاص طور پر ڈیلیٹ کیا گیا تاکہ میں نہ پڑھ سکوں، دراصل تم نے میسج تو ڈیلیٹ کردیا مگر ڈیلیوری رپورٹ ڈیلیٹ نہیں کی۔"
واصف ایسے چونکا جیسے پکڑا گیا ہو۔ اُجالا کا منہ اتر گیا۔ اسے توقع تھی کہ واصف سچ بولے گا اور ان کی ایک ہزار ایک لڑائیاں صرف ایسی ایک بات پر ہوتی تھیں کہ وہ اسے پہلی بار پوچھنے پر ہی حقیقت کیوں نہیں بتاتا۔
"یار! صائمہ کو کیا تھا۔" واصف اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کا "ہیلو" میسج آیا تھا، میں نے بھی حال چال پوچھ لیا اس کا، پھر میسجز ڈیلیٹ کردیے سوچا تم موبائل دیکھو گی تو پھر پوچھو گی اور صائمہ ویسے ہی تمہیں بہت زہر لگتی ہے۔"
"یہی تو بات ہے کہ تم اس وقت تک حقیقت نہیں بتاتے، جب تک میں ثبوت پیش نہ کروں، پھر تم ساری کہانی سناتے ہو۔"
"یہ غلط بات ہے۔ ہر بار تو تم ثبوت پیش نہیں کرتیں، میں خود ہی مان جاتا ہوں۔"
"تم مانتے نہیں ہو، میں منواتی ہوں۔"
"رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ تمہارا پھر سے ناراض ہونے کا ارادہ ہے۔"
"پھر سے۔۔؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔
"نہیں میرا مطلب ابھی اس وقت سونے کا ارادہ ہے؟"
"تم کبھی مجھے نہیں سمجھو گے۔" اجالا کا منہ پھول گیا۔
وہ بالکل ایک چھوٹی سی بچی کی طرح بن جاتی تھی ایسی بچی جس کا سرپرست ہر حال میں اس کے لاڈ

اٹھاتا ہے۔ وہ عورت تھی اور اسے لاڈ اٹھوانا بے حد پسند تھا۔ جب ہر بار اسے منایا جاتا تو اس کا رتبہ اور بلند ہو جاتا۔

واصف چڑتا تو وہ بھی چڑ جاتی۔ یہ نہیں کہ یہ صرف واصف کا ہی حق ہے۔

واصف غصہ کرتا تو وہ بھی کر لیتی۔

دونوں لڑنے پہ آئے تو جی جان لگا کر لڑتے تھے۔

"یعنی تم دونوں کا ابھی بھی یونیورسٹی والا ہی حال ہے۔"

سویرا نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ پہلے تو وہ ہنسا کرتی تھی' اجالا کے لمبے چوڑے قصوں پر۔ وہ دونوں ہم نام تھیں' ہم خیال تھیں اور ایک دوسرے کی بہترین دوست تھیں۔

"کامران تو مجھ پر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"کیوں... کیوں کرتا ہے ایسے؟"

"پتا نہیں... خیال بھی بہت رکھتا ہے بس اپنے آگے بولنے نہیں دیتا۔ کہتا ہے گھر میں راج کرو بس سوال جواب نہ کرو۔ کہاں جا رہا ہے۔ کب آرہا ہے کیا کر رہا ہے غلطی سے پوچھ بھی لوں تو میری شامت آجاتی ہے۔ ایسے دھاڑتا ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔"

"تمہیں اس پر شک ہے۔ کیا کوئی اور...؟"

"بات کسی اور کے ہونے کی نہیں ہے اجالا! بات صرف اتنی سی ہے کہ ہماری زندگی میں "محبت" صرف اچھا اور صرف میرے اچھا رہنے پر رہے گی۔ میری فرماں برداری میری محبت ہے بس' شادی سے پہلے تک ہر اچھی بری بات میں ہم دونوں میں۔ شادی کے بعد اسے میری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں چاہیے۔ اسے سب کچھ اپنی پسند کا چاہیے۔ مجھے گھر میں سب کچھ ملتا ہے صرف اسی تک جانے کا راستہ نہیں ملتا۔

کبھی میرا دل چاہتا ہے اس سے بات کرنے کو لیکن میں اسے بلا ضرورت فون نہیں کر سکتی۔ کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں بار بار فون کر کے اسے گھر آنے کے لیے کہوں کیونکہ میرا دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ ہم مل کر لنچ کریں۔"

"اور تم ایسا نہیں کر سکتیں؟" اجالا نے حیرت لیے پوچھا۔

"ہاں... نہیں کر سکتی۔"

"کیوں...؟"

"کیونکہ اماں نے ایک بار کہا تھا کہ ایک عورت میں اتنی غیرت تو ہونی چاہیے کہ وہ برداشت کرے اور گالی نہ کھائے اور اگر گالی سنے تو برداشت نہ کرے اور میں نے برداشت کر لیا ہے کیونکہ میں گالی نہیں سن سکتی اور برداشت اس لیے کر لیا کیونکہ میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

سویرا اپنی گیلی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"وہ تو تم سے محبت کرتا تھا نا! کہاں گئی وہ محبت؟"

سویرا نے اسے ایسے دیکھا جیسے کسی نادان بچے کو دیکھا جاتا ہے۔

"محبت... محبت کے نام پر وہ جو کھیل کھیلتا تھا وہ ختم اب' ہم میاں بیوی ہیں...."

"میاں' بیوی... تو کیا میاں بیوی میں محبت نہیں ہوتی' کہاں چلی گئی تم دونوں کی محبت؟"

"شاید کہیں چلی گئی ہے اجالا! محبت یکطرفہ ہو تو وہ نہ ہونے کے برابر ہی ہوتی ہے اور بیوی کی محبت تو سرے سے ہوتی ہی نہیں۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

رات گئے تک سویرا کے الفاظ اجالا کے ذہن میں گھومتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"عورت میں تمہاری پسندیدہ خوبی کون سی ہے؟" واصف فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا اور وہ بور ہو رہی تھی۔ اس نے جھٹ سے ٹی وی آف کر کے سامنے بیٹھ کر پوچھا۔

"یہی کہ وہ دوبارہ ٹی وی آن کر دے جلدی سے۔"

"تم اپنی بیوی سے باتیں کرو' اسے دیکھو' ٹی وی میں کیا رکھا ہے۔" اس کا انداز شرارت لیے ہوا تھا۔ وہ اکثر اسے ایسے ہی سوال پوچھ کر الجھا دیا کرتی تھی۔

"کیا عورت میں خوبی ہوتی ہے؟"

"تو کیا نہیں ہوتی؟"

"میرا خیال ہے عورت کا عورت ہونا ہی خوبی ہے بس۔"

"کیا مطلب؟" وہ خفا ہو کر بولی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ ویسے دم بھرتے رہتے ہو میرا کہ میں یہ ہوں' میں وہ ہوں۔"

"ہاں کہتا ہوں' اپنی بیوی سے کہتا ہوں اور بس۔"

"بس؟"

"بس یہ کہ تم مجھے بھا گئی ہو۔"

"اوہ... یعنی کہ میں تمہیں بھا گئی ہوں۔" وہ چڑ گئی۔

"بالکل! اس لیے تمہاری خامیاں بھی میرے لیے خوبیاں ہی ہیں۔ عورت میں بس یہی خوبی ہونی چاہیے اسے "بھا" جانا آنا چاہیے۔"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ باقی بچے' کھانا پکانا' سینا پرونا' گھر کے ہزار کام جائیں بھاڑ میں' کیونکہ یہ سب تو کسی گنتی میں ہی نہیں' بس وہ اٹھلاتی پھرے شوہر کے آگے پیچھے۔"

اور وہ ہنسنے لگا۔ "دیکھا۔ دیکھا! کتنا چڑتی ہو تم پھر... پھر کہتی ہو کہ سچ نہیں بولتا۔"

"یعنی میں تمہیں بھا گئی ہوں اس لیے ہمارا یہ رشتہ قائم ہے' میری خامیاں' خامیاں نہیں۔ خوبیاں' خوبیاں نہیں۔"

"اتنی گہرائی میں تم جاتی ہو' میں نہیں جا سکتا۔" واصف نے معصوم شکل بنا کر کہا۔

"میں اتنا جانتا ہوں کہ جن سے محبت کی جاتی ہے وہ "دیوتا" بن جاتے ہیں' پھر تم جانتی ہی ہو کہ دیوتاؤں کی صرف پوجا ہی کی جاتی ہے۔" اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر اس نے ٹی وی آن کیا۔

☆ ☆ ☆

"واصف سے پوچھنا تھا کہ اس دیوتا کی پوجا کب تک کی جائے گی۔"

سویرا سنجیدہ ہو گئی جیسے کہ اب وہ اکثر سنجیدہ ہی رہتی تھی۔

”پتا نہیں کیوں اجالا! مجھے لگتا ہے واصف نے ٹھیک ہی کہا ہے‘ دیکھو ناں وہی عورتیں جو خرانٹ ہوتی ہیں‘ چالباز‘ دو نمبر لالچی‘ بدنیت ہوتی ہیں۔ انہیں بھی تو یہ مرد ہی بساتے ہیں ناں کیونکہ وہ ان کے دلوں کو رام کر لیتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اجالا نے پوچھا بھی اور سوچا بھی۔

”بس ایسی ہی کوئی بات ہے۔“

سویرا کو اللہ حافظ کہہ کر وہ واصف کو فون کرنے لگی۔ بیل جا رہی تھی لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا‘ آج کل وہ پہلے سے کہیں زیادہ مصروف رہنے لگا تھا۔ آفس میں بہت سے نئے لوگوں کو تقرر کیا گیا تھا اور وہ پرانے ورکرز کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ کسی نئی پراڈکٹ کی لاؤنچنگ کی وجہ سے سارے اسٹاف کو رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔

شروع میں اجالا نے کافی شکوہ کیا۔ اس کی بدلی ہوئی روٹین کا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد لان میں بیٹھ کر وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ باتیں کرتے تھے‘ اب وہ آتا ہی اتنا لیٹ تھا کہ کھانا کھا کر سو جاتا تھا پھر جیسے اس نے سمجھوتا کر لیا۔ اب وہ شکایت بھی نہیں کرتا تھا اجالا سے اور نہ ہی اس کے چہرے پر وہ تھکن نظر آتی تھی‘ جو شروع شروع میں آیا کرتی تھی۔

”کب تک تمہاری یہ روٹین رہے گی؟“ اس نے اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھی۔

نوالہ چباتے رہنے کے بہت دیر بعد اس نے کہا۔ ”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ جواب دینے میں اتنا وقفہ اجالا کو بہت کھلا۔

”پھر بھی کچھ پتا تو ہو گا۔“ اجالا نے خفگی سے کہا۔

واصف نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کھانا کھانے لگا اور کھانا ہی کھاتا رہا۔ اجالا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تو تھا کہ اجالا نے اگلا سوال نہیں پوچھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ واصف نہیں اور وقت گزار رہا ہے؟“ وہ سویرا سے فون پر بات کر رہی تھی۔

”ہوتا تو وہ آفس میں ہی ہے۔ آفس سے معلوم کیا ہے میں نے۔ کام بھی نئی پراڈکٹ پر ہی کر رہے ہیں۔ رت گئے تک زیادہ تر اسٹاف وہاں موجود ہوتا ہے۔“

”تو پھر...؟“ سویرا نے پوچھا۔

”تو پھر...“ اجالا نے خود سے ہی کہا۔ ”سب کچھ ویسا ہی ہے اور شاید کچھ بھی ویسا نہیں۔ کچھ دن پہلے میرے پاس اس کا موبائل تھا۔ اس نے کال کرنے کے لیے میرے ہاتھ سے لیا۔ واصف کا کہنا ہے کہ اس نے صرف لیا تھا اور مجھے جانے کیوں یقین ہے کہ اس نے چھینا تھا۔“

”تمہارا وہم ہے۔ تم جانتی ہو کہ واصف کتنا اچھا ہے۔“

”ہاں! اچھا تو ہے۔“ وہ خود الجھ گئی۔

واصف نے اسے گول گول گھمانا بھی چھوڑ دیا تھا اور پانی کے چھینٹے مارنا بھی۔ وہ اسے بار بار فون کرتی اور وہ اسے آرام سے بتا دیتا کہ کب تک وہ گھر آ جائے گا اور وہ اس وقت گھر آ بھی جاتا تھا۔

لیکن ایک رات تو اجالا کے لیے حد ہی ہو گئی‘ جب وہ رات کے دو بجے گھر آیا۔ تین گھنٹے سے وہ اسے مسلسل فون کر رہی تھی اور اس کا فون آف تھا۔

”کہاں تھے تم...؟“ لاؤنج میں اس کے داخل ہوتے ہی وہ پھٹ پڑنے کے لیے تیار تھی۔

”میں تھکا ہوا ہوں‘ سونے جا رہا ہوں۔ تم اپنی یہ پڑتال صبح کر لینا۔“ اس نے اس کے بولنے سے پہلے ہی سختی سے کہا۔

”میں بھی تھکی ہوئی ہوں۔ مجھے بھی سونا ہے‘ تمہارا فون آف تھا‘ بارہ بجے آفس بھی بند ہو چکا تھا۔ تم کہاں تھے دو گھنٹے؟“ وہ جیسے اسے سنے بغیر کہیں اور ہی گم تھا۔

”تم سے بات کیے بغیر میں نہ خود سوؤں گی نہ ہی تمہیں سونے دوں گی۔ تم کر کیا رہے ہو آج کل آفس میں‘ تمہارا آفس بند ہو چکا تھا۔ واپس تم اب آ رہے ہو۔ کہاں تھے تم؟ کہاں رہتے ہو تم؟“ وہ غصے میں تیز تیز بول رہی تھی۔ ”اور یہ فون دو مجھے اپنا۔ میں دیکھوں کہ یہ آف کیسے ہو گیا؟“ وہ فون پکڑنے اس کے ہاتھ کی طرف آئی۔

”بکواس بند کرو اپنی۔“ واصف نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹکا۔

”اور بند ہی رکھو۔“ واصف نے دوسری بار بھی اسی سختی سے کہا۔ جیسے اسے للکارا۔ جیسے کھینچ کر اسے تھپڑ مارا۔

”بکواس...“ اجالا بھی اسی کی طرح دھاڑی۔

”ہاں... جو میں اب اور نہیں سنوں گا۔“

اجالا نے اس کی آنکھوں میں در آئی سختی کو دیکھا۔ اجنبیت کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں موجود کچھ نئے رنگوں کو پہچانا۔ اس کا وہ کھٹکا جو اس کے اپنے اندر واصف کو لے کر رہتا تھا‘ اسے اس کی آنکھوں میں نظر آنے لگا۔

”میرے سامنے ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔“ واصف نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا انداز صاف صاف بتا رہا تھا کہ وہ اب اس کا ایک لفظ‘ ایک سوال برداشت نہیں کرے گا۔ کوئی تکرار... کوئی جواز... وہ اب نہیں سنے گا۔

اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ اب برداشت نہیں کرے گا۔

”واصف!“ اجالا کی آنکھیں گیلی ہو گئیں اور یکایک اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا... لیکن واصف نے جیسے اس کی آواز دیکھی نہ ہی اس کے آنسو دیکھے۔ وہ بیڈ روم میں جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

بے آواز روتے ہوئے اجالا کو گمان سا ہوا کہ واصف سیٹی بجا رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

”اجالا! تم تو اتنی نڈر ہو۔ تم تو کبھی چوکی ہی نہیں۔ پھر اس رات تم نے واصف کو بنا کچھ بتائے سونے کیسے دیا۔“ سویرا نے بمشکل اسے چپ کروایا تھا۔

”مجھے اسی رات... اسی وقت یہ معلوم ہوا سویرا کہ میں واصف کے بل بوتے پر ہی نڈر تھی۔ ورنہ... ورنہ میں تو اس رات اس کی چنگھاڑتی آواز سن کر ہی سمجھ گئی تھی کہ میں کتنی ڈرپوک ہوں۔

ہمت کر کے میں اس کے آفس گئی رات گئے۔ آفس تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے میں واصف کو کال کرتی رہی تھی لیکن واصف نے میری کال ریسیو ہی نہیں کی۔“

”پھر...؟“

”واصف کے کیبن میں... میں نے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کافی کے مگ تھے۔ واصف کے قریب ہی موبائل رکھا تھا۔

واصف نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا لیکن واصف کو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں میں دیدہ دلیری تھی۔

ایک نظر میں... میں یہ سب کچھ دیکھ کر واپس پلٹ آئی۔“

”کون تھی وہ...؟“

”اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھی۔“ اجالا نے اپنے گیلے گال رگڑے۔ ”سات آٹھ ماہ میں ہی اتنا کچھ بدل گیا۔“

”تمہیں وہیں واصف سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

”کیسے کرتی... مجھے واصف سے ڈر لگ رہا تھا۔“

”ڈر...“ سویرا حیران ہوئی۔

”ہاں...!“ اس کے آنسو روانی سے گرنے لگے۔

”کیوں...“

”کیونکہ اب وہ واصف نہیں‘ صرف میرا شوہر ہے۔ محبت محبت کا جو کھیل وہ کھیل رہا تھا اب شاید وہ ختم...“

اجالا نے اسی کے الفاظ میں اسے سمجھا دیا۔

☼

فائزہ افتخار

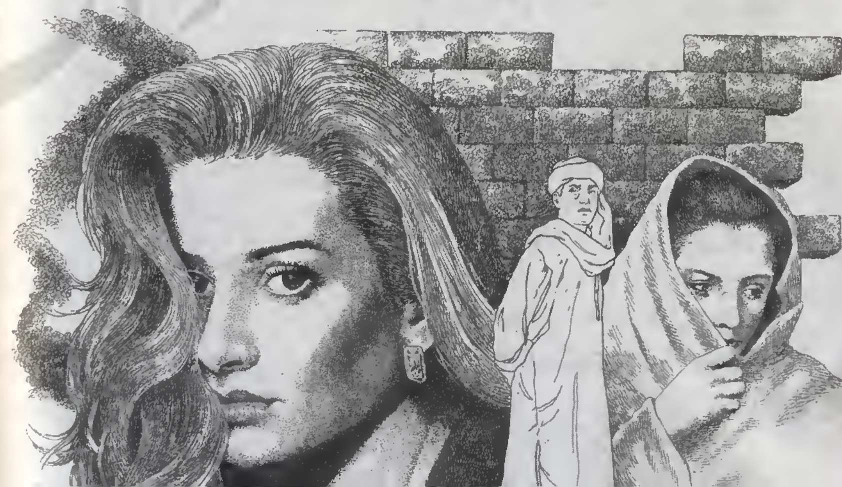
اکیلی سنڈریلا

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میشا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پرشکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مہر نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہوگئی اور دونوں بیٹیوں' زینی اور رامی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی منگیتر کارا کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میشا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پرشکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میشا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے میشا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میشا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پرشکوہ خانم میشا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں میشا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پراسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر' رامی اور زینی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میشا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور گرینی نے اسے روک دیا۔

ناولٹ



میشا نے تہیہ کرلیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہی، میلے میں ضرور جائے گی۔ میشا نے پُرشکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اَپ تھوپ لیا تاکہ کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بُندے پہن لیے۔

میشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہوگئی۔ اسے مائر نامی ایک نوجوان ملا۔ میشا نے اسے گھر تک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام، پتا نہیں بتایا۔ وہ مائر کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ میشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک بندا کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائر نے وہ بُندا سنبھال کر رکھ لیا۔ میشا نے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

مہر نے کارا کو دعوت پر بلایا، کیونکہ وہ اس کے بیٹے مائر سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ مائر دعوت پر آیا تو میشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔

زینی نے وہ بُندا جو اس رات میشا نے پہنا ہوا تھا، اپنے دوپٹے میں بروچ کے طور پر لگایا تو مائر اسے وہی لڑکی سمجھا، جو اسے فیسٹول میں ملی تھی۔

کارا نے خاندان اور قرب و جوار کی تمام لڑکیوں کو اپنے گھر مدعو کیا تاکہ مائر شادی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ پرشکوہ خانم کا گھرانہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ میشا کو ساتھ نہیں لے گئیں۔

میشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں رومان آگیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاد کی حیثیت سے کرایا۔ رومان نے پارٹی میں جانے کے لیے میشا کے لباس کا انتظام بھی کردیا۔ زینی نے وہ بُندا لان میں پھینک دیا تھا۔ رومان نے وہ اٹھا کر میشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ میشا دعوت میں پہنچی تو مائر اسے دیکھ کر چونک گیا۔

قسط نمبر 4

اس رات کی طرح آج بھی اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آرہا تھا۔ اس رات بدہیئت، بے ہنگم میک اپ نے اس کے نقوش چھپا رکھے تھے تو آج آدھے چہرے پہ لگا ماسک انہیں عیاں کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے لانبے گھنگھریالے بال کچھ اس طرح سے چہرے اور گردن کو ڈھانپے ہوئے تھے کہ ماسک سے محروم باقی کا چہرہ ان میں چھپ گیا تھا۔

اس رات کی طرح آج بھی اس کا لباس اپنی طرز کا منفرد پہناوا تھا۔ اس کے ناپ سے کہیں بڑا..... جو بار بار اس کے پیروں میں الجھ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی چال میں وہ بے ساختگی اور بہاؤ نہیں تھا جو عموماً ہوتا ہے۔ وہ سنبھل سنبھل کے ایک ایک قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے باوجود بار بار لڑکھڑا جاتی۔

مائر کی نظروں کے تعاقب میں زینی نے بھی مڑ کے دیکھا اور حیرت سے کہنے لگی۔

"یہ کون پاگل ہے؟"

ان دونوں کے علاوہ وہاں اور بہت سے لوگ تھے جو اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنی بہت سی سوالیہ اور تنقیدی نظروں کو خود پہ مرکوز پاکے وہ مزید گھبرا گئی اور جب مائر کو بے تابانہ اور بے ساختہ اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اس کی تو جیسے سٹی ہی گم ہوگئی۔

"ہائے اللہ! اس نے مجھے پہچان لیا۔ تب ہی تو تیر کی طرح لپکا ہے۔ ابھی مجھے بازو سے پکڑے گا اور باہر نکال دے گا۔ مہر ماما کو سب پتا چلے گا۔ وہ شامت الگ۔"

وہ وہیں بت کی طرح ایستادہ ہوکے سوچنے لگی۔

"مائر..... رکو....."

زینی نے اسے پکارنا چاہا..... مگر وہ کسی کشش سے بندھا سیدھا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زینی کو مائر کی نظریں اس اجنبی لڑکی پہ جمی دیکھ کے جلن سی محسوس ہوئی جب کہ وہ نہیں جانتی تھی۔ مائر کی نظریں درحقیقت میشا کے چہرے یا وجود پہ نہیں۔ اس کے لباس پہ لگے اس جھمکے پہ تھیں۔

"کہیں یہ میشا تو نہیں؟" زینی کے ذہن میں خیال سرسرایا۔

"لگ تو وہی رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"آپ یہاں ریسٹ کرلیں آنٹی۔"

کارا ملازمہ کی مدد سے پرشکوہ خانم کو سہارا دیے ایک الگ تھلگ سے کمرے میں لائی۔

"مناسب نہیں لگ رہا..... سب مہمان کیا سوچیں گے۔"

وہ متذبذب تھیں، ایسے محفل میں سے اٹھ کے آنا بھی معیوب لگ رہا تھا۔

"کچھ نہیں سوچیں گے بلکہ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ جب آپ نے بتا دیا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مجھے اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تم میری وجہ سے پارٹی چھوڑ کے یہاں کیوں آگئی ہو۔ جاؤ کارا..... وہاں سب کو تمہاری کمی محسوس ہو رہی ہوگی۔" پرشکوہ خانم نیم دراز ہوکے سانس ہموار کرنے لگیں۔

"یہ میڈ میں آپ کے پاس چھوڑے جارہی ہوں۔ آپ کا خیال رکھے گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا لیجیے گا۔"

☼ ☼ ☼

اتنے سارے لوگوں کی نظریں.....

اتنے بہت سے سوال.....

زینی کا کھوجتا کریدتا انداز.....

اوپر سے تیزی سے اس جانب بڑھتا مائر.....

وہ حواس باختہ ہوکے تیزی سے مڑی تو اس کا پیر لمبے لبادے کی جھالر میں بری طرح اٹکا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

"تم وہی ہو ناں۔" مائر نے اس کے بالکل سامنے آکے راستہ روکا۔

"وہ..... وہی... کون وہی؟" میشا نے تھوک نگل کے خشک ہوتا حلق تر کیا۔

"تم اس دن مجھے بہت مشکل میں ڈال گئی تھیں۔ جانتی ہو میں کیسے واپس گیا؟ مجھے کشتی چلانی بالکل نہیں آتی تھی۔"

میشا بے دھیانی میں اس کی بات سن رہی تھی جو بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا جبکہ اس کی ساری توجہ زینی پہ تھی جو اسے بار بار شک بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد اب مہر کو اپنی جانب بلا رہی تھی۔

"وہ..... تو وہ تو مجھے بھی نہیں آتی۔"

میشا نے کھسکنے کے لیے پر تولنے کی کوشش کی مگر وہ بالکل سامنے تھا اور اسے جانے دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"تو تم اپنے گھر کیسے جاتی ہو؟ تمہارا گھر تو جھیل کے اس پار ہے ناں؟"

"نہیں؟" میشا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"مر گئی میشا..... اسے شک تو نہیں ہوگیا کہ میں مہر ماما کی بیٹی ہوں اور سیف کاٹیج میں رہتی ہوں۔ یہ تو بتا دے گا سب کو۔"

"میں تو..... میرا گھر تو سفید پھولوں والی پہاڑی کے اوپر ہے۔" ایک اور جھوٹ۔

"سفید پھولوں والی پہاڑی وہ کہاں ہے؟"

"جہاں میرا گھر ہے۔"

ترنت جواب ملنے پہ مائر مسکرایا۔ اب اسے مزید یقین ہوگیا۔ ایسی بھولی باتیں وہی کرسکتی تھی۔

"تو اب تم اسے ایسے استعمال کرتی ہو۔"

مائر نے اس کے کاندھے پہ بروچ کی طرح لگے بندے کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اس جیسا دوسرا کھو گیا ہے ناں۔"

"تمہیں کیسے؟"

میشا پوچھتے پوچھتے رک گئی، دور سے زینی کو دیکھا جو اس کی جانب اشارہ کرکے مہر کو کچھ بتا رہی تھی۔

"زینی نے بتا دیا ہوگا۔ اب میں نے بھی اگل دیا تو یہ مجھے چور بھی سمجھے گا۔"

"پتا نہیں۔ شاید کھو گیا ہو۔ مجھے کیا، کون سا میرا ہے۔" وہ صاف مکر گئی۔

"مجھے تو یہ بھی کسی کا کھویا ہوا لگتا تھا۔ باہر گرا ہوا تھا، میں نے اٹھالیا۔"

اس نے فوراً بات بنائی اور اس سے پہلے کہ مائر کچھ اور پوچھتا۔ وہ کترا کے نکل گئی۔ ڈر تھا زینی مہر کے ساتھ آکر اس کے چہرے سے ماسک ہی نہ نوچ لے۔ وہ بھانڈا پھوٹنے سے پہلے کچھ پیٹ پوجا کرنا چاہتی تھی۔

اسے کھانے کی میز کی جانب جاتے دیکھ کے مائر اب کچھ مایوس سا نظر آنے لگا۔

ادھر وہ اپنا لباس سنبھالنے کے چکر میں پھر سے لڑکھڑائی اور میز سے جا ٹکرائی۔ اور اس پہ رکھے بلوریں جگ اور گلاس ایک دوسرے پہ جا گرے۔ کئی ایک تو کرچی کرچی ہو گئے۔ جو اب تک اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے وہ بھی ہو گئے اور میشا گھبرا کے کانپتے ہاتھوں سے یہ سب ٹھیک کرنے لگی۔ نظر بار بار بھٹک کے اس میز تک جا رہی تھی جہاں چاکلیٹس کا ڈھیر لگا تھا۔

کسی مغنیہ نے سُر چھیڑے تو لوگ میشا کی بدحواسیوں اور عجیب و غریب حلیے سے نظر ہٹا کے اس کی جانب مشغول ہو گئے اور میشا کھسکتی کھسکتی چاکلیٹوں والی میز کے پاس جا پہنچی۔ دونوں ہاتھوں میں چاکلیٹس بھرنے کے بعد اس نے انہیں چھپانے کی کوشش کی....

"کیسا فضول۔ بے کار ڈریس ہے۔ کوئی ایک پاکٹ بھی نہیں ہے کہ چاکلیٹ چھپائی جا سکے۔ ہاں بھئی پرستان سے جو آیا ہے۔ پریوں کو کیا ضرورت ہوتی ہے۔ چیزیں چوری کرنے یا چھپانے کی۔ ان کا تو جب جی چاہے جادو سے ہر چیز اپنے سامنے حاضر کر لیتی ہیں۔"

"یہ کون لڑکی ہے کارا! تمہارے سسرالی عزیزوں میں سے ہے؟"

مہر نے کارا سے پوچھا تو اس نے لاعلمی میں شانے اچکائے۔

"نہیں.... شاید آس پاس سے آئی ہو۔"

"حرکتیں دیکھو اس کی۔"

مہر کے کہنے پہ کارا نے توجہ دی۔ وہ ایک ہاتھ سے دھڑا دھڑ چاکلیٹس کھانے میں تو دوسرے ہاتھ سے انہیں چھپانے میں مصروف تھی۔ نفیس طبع کارا کے ماتھے پہ ناگواری سے بل آ گئے۔ جن پہ میشا کی نظر جیسے ہی پڑی وہ گھبرا کے چاکلیٹ پھینکتی تیزی سے مڑی کہ مہر اور کارا کی نظروں کے حصار سے دور جا سکے۔ وہ ایک بار پھر سامنے سے آنے والے وجود سے جا ٹکرائی اور یہ کوئی اور نہیں امی تھی۔

"ماما...."

امی کے ہاتھ میں کیک کا بڑا سا پیس تھا۔ مگر میشا کے ٹکرانے کی وجہ سے وہ ٹکڑا اس کی ناک اور ہونٹوں پہ جا لگا اور پھیل کے اسے بدہیئت بنا گیا۔ وہ منہ بسورے مہر کو پکارنے لگی۔

"یہ ہے کون؟ تماشا لگا کے رکھ دیا۔"

مہر کو بڑبڑاتے ہوئے یہاں کا رخ کرتے دیکھا تو میشا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

لو جی.... اب یہ آئیں.... ماسک اتارا اور پڑے میرے چہرے پہ طمانچے.... سب کے سامنے انسلٹ!

"کیا؟ تم نہیں جانتیں یہ کون ہے.... آنٹی خانم کو لے کر آؤ۔ وہ یہاں کے سب لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہیں۔"

کارا اپنی کسی ملازمہ سے کہہ رہی تھی۔ میشا کے کان میں یہ بات پڑی تو وہ مرنے والی ہو گئی۔ جانتی تھی کہ گرینی اسے سات پردوں میں بھی پہچان لیں گی۔ اب تو بھاگنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا.... اس نے اپنا لباس مٹھیوں میں بھر کے اوپر اٹھایا اور لگا دی دوڑ۔

راستے میں کتنوں سے ٹکرائی.... کتنوں کو دھکا دیا۔ کتنی چیزیں پیروں کی ٹھوکر سے پرے ہٹائیں.... یہ سب دیکھنے کا ہوش نہیں تھا۔

"جاکے دیکھو کسے کون تھی یہ؟"

کارا نے کچھ ملازموں کو اس کے پیچھے بھیجنا چاہا مگر مائر نے روک دیا۔ اسے اس اجنبی لڑکی کے آنے سے جو موہوم سی آس بندھی تھی، وہ اس ساری بدمزگی سے خود ہی دم توڑ گئی۔

"جانے دیں مام! پہلے ہی بہت mess ہو گیا ہے پارٹی میں۔"

"مجھے تو لگتا ہے، کسی نے یہ سب کرنے کے لیے اسے بھیجا تھا یہاں۔"

میشا کو بڑے سے دروازے کے پار بھاگتے دیکھ کے زینی کے چہرے پہ اطمینان بھری مسکراہٹ چھا گئی۔ کہیں نہ کہیں اس کے دل میں یہ شک ضرور تھا کہ یہ آنے والی لڑکی ہو نہ ہو.... میشا ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رومان جھیل کے کنارے بیٹھا اس میں کنکریاں پھینکتا جا رہا تھا۔ اور پھر کنکری کے گرنے پہ جھیل کی سطح پہ جو دائرے بنتے تھے وہ رومان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکان لے آتے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں اور اس دلچسپ کھیل میں اس قدر محو تھا کہ اسے ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے عقب میں میشا بھاگتی آ رہی تھی اس نے اپنا ریشمی گلابی لباس کافی اوپر تک اٹھا رکھا تھا.... تیز بھاگنے کے لیے اپنے اونچی ایڑی والی سینڈل بھی ہاتھوں میں پھنسا رکھے تھے۔ ماسک چہرے سے اوپر کر کے بالوں میں اڑس رکھا تھا.... رومان اپنے خیالوں سے اس وقت ہڑبڑا کے چونک اٹھا جب میشا اس کے بالکل سر پہ پہنچ گئی اور اس کی پشت پہ دے دھڑا دھڑ گھونسے برسانے اور برا بھلا کہنے لگی۔

"بہت برے ہو تم.... گندے.... فضول۔"

وہ گھبرا کے اٹھا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ یہ کیا حرکت ہے؟"

لیکن وہ اس کی سنے بغیر اپنی کہے جا رہی تھی۔ کہے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔

روئے جا رہی تھی اور اب اس کے سینے پہ زور زور سے مارے جا رہی تھی۔

"ذلیل کروا کے رکھ دیا مجھے تماشا بنوا دیا میرا.... گندے۔"

آخر رومان نے اس کی دونوں کلائیاں زور سے دبوچ لیں۔ "اسٹاپ میشا۔"

اس کے سخت لہجے اور گرفت پہ میشا خائف ہو کے چپ ہو گئی۔ مگر اب وہ پوری طرح سے پھڑپھڑا کے اپنی کلائیاں اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی.... رومان جانتا تھا جیسے ہی اس نے ہاتھ چھوڑے وہ پھر سے مشتعل ہو جائے گی اس لیے اس نے مزید مضبوطی سے اسے جکڑ لیا۔

آخر بے بس سی ہو کے میشا نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ رومان پگھل گیا۔

"کیا ہوا میشا؟"

اس بار اس کا لہجہ بہت نرم تھا جس پہ میشا اس کے سینے پہ ماتھا ٹکا کے سسک کے رو پڑی.... اس کے آنسو ارمان کے گریبان میں جیسے جیسے جذب ہو رہے تھے۔ وہ جیسے اس کے آنسوؤں کے حصار میں بھیگ رہا تھا۔ یہ سسکیاں شاید اس پہ کوئی منتر پھونک رہی تھیں.... اس سحر کے عالم میں جیسے ہی اس کے ہاتھ سے میشا کی کلائیاں چھوٹیں، وہ رونا بھول کے پھر سے پہلے والے جلالی موڈ میں آ گئی اور لگی اس کے سینے پہ مکے برسانے۔

"تم.... ایک دم بے کار فیری مین ہو۔ اگر تمہارا موڈ نہیں تھا پیچھے آ کے میری مدد کرنے کا تو اوپر پڑے سڑتے رہتے۔ منع کر دیتے اپنی گرینڈ ماما کو۔ کباڑا کر کے رکھ دیا میرا سب کے سامنے۔"

"اس سے پہلے کہ مزید کباڑا ہو جائے.... تم گھر تو پہنچو۔ اپنی کھڑوس ماما کے پہنچنے سے پہلے پہلے۔"

رومان نے اس کا ہاتھ کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا لے جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا موٹر بائیک پہ.... جاتے ہوئے وہ جتنی خوش اور پرجوش تھی.... اب واپسی پہ اتنی ہی چپ چاپ اور مضمحل تھی۔ خاموش

آنسو بہہ رہے تھے۔
گھنگھریالے بال اڑ رہے تھے۔ جن کو سمیٹنے کا اسے ہوش نہ تھا۔
بائیک اب بھی اونچے نیچے غیر ہموار راستوں سے گزر رہی تھی مگر اب وہ ڈر کے رومان کی کمر کے گرد بازو نہیں حمائل کر رہی تھی۔ نہ خوف کے مارے آنکھیں میچ رہی تھی۔
رومان نے بھی سارے راستے اسے بالکل مخاطب نہ کیا۔ مگر جب بائیک گھر کے آگے روکی اور وہ اسے اتر کے ڈھیلے ڈھیلے سست قدموں کے ساتھ اندر جاتے دیکھا تو اس کے اترے چہرے پہ رومان کو ترس سا آگیا۔
"سوری..... بیشا..... میں نے کوشش کی تھی..... مگر"
وہ اس کی بات سننے کے بجائے یا مڑ کے کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکائے اندر بڑھنے لگی۔
"ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟"
اس پہ بھی جواب نہ ملا تو وہ پھر بھی باز نہ آیا۔
"کیا ہو گیا ہے یار؟"
اب بیشا زور سے چلاتے ہوئے پلٹی۔
"میں نے کہا تھا ناں..... مجھے یار مت کہنا۔"
اس کی شرر برساتی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرے پہ بے حد برہمی۔ انداز تقریباً "پھاڑ کھانے والا تھا۔ اس کے باوجود رومان کو اسے دیکھ کر ہنسی سی آگئی۔ جس پہ بیشا اور ناراض ہو گئی۔
"گندے..... اوپر سے ہنستے ہو..... بجائے شرمندہ ہونے کے۔"
وہ تیزی سے کائی زدہ سیڑھیاں چڑھی..... مگر گیٹ پہ لگا تالا دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی..... اب جا کے یاد آیا کہ وہ یہاں سے کیسے نکلی تھی۔ تذبذب کے عالم میں کچھ دیر تالے کو گھورتے رہنے کے بعد وہ جی کڑا کر کے پلٹی مگر رومان سے ٹکرا گئی۔ جو پتا نہیں کب اس کے بالکل پیچھے آ کے چپکے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ بغیر کچھ کہے رومان نے دونوں ہاتھ اس کی کمر پہ رکھے اور اسے اٹھا لیا۔ بیشا پھولے ہوئے ناراض چہرے کے ساتھ نظریں چراتی اس کے شانوں پہ اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتی تھوڑی اوپر ہوئی۔

☆ ☆ ☆

گھر آتے ہی ان سب کے قدموں کا رخ بیشا کے کمرے کی جانب تھا..... پرشکوہ خانم کے ہاتھ بھی وہیل چیئر کو تیزی سے آگے دھکیل رہے تھے۔ ان کی تشویش کی وجہ سراسر دوسری تھی۔ وہ بیشا کو اکیلے چھوڑ کے جانے پہ پشیمان اور متاسف تھیں اور ساتھ ساتھ اس کی متوقع ناراضی کا سوچ سوچ کے پریشان بھی' جبکہ وہ تینوں ماں بیٹی اپنا شک دور کرنا چاہتی تھیں۔
"تمہاری طرح مجھے بھی بیشا پہ شک ہے مگر سوچتی ہوں وہ لاک کد گھر میں سے کیسے نکلی ہو گی۔"
مہر نے سرگوشی کی۔ جس کی تائید امی نے کی۔
"اور وہاں تک اتنی جلدی گئی اور واپس کیسے آئی ہو گی اور اس کے پاس وہ کپڑے کہاں سے آئے ہوں گے۔"
"لیکن ایک بار..... صرف ایک بار..... صرف اس کے چہرے کے بارے میں نہ سوچتے ہوئے یہ تصور کرو کہ وہ واقعی بیشا تھی تو آپ دونوں کو بھی یقین آجائے گا..... وہی بال' وہی قد و قامت' وہی فضول حرکتیں..... صرف شکل و صورت چھپانے سے۔"
کمرے کے ادھ کھلے دروازے تک پہنچ کے وہ چپ ہو گئی۔ ان کی چہ میگوئیوں کے دوران پرشکوہ خانم پہلے وہاں پہنچ گئی تھیں۔ اور اب سوئی ہوئی بیشا کے چہرے پہ محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔
"سوری بیشا..... گرینی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
بیشا کے چہرے پہ آنسو خشک ہو کے نشان چھوڑ چکے تھے۔ نیند میں بھی وہ ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہی تھی۔
مہر' امی اور زینی نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر شانے اچکا دیے۔

☆ ☆ ☆

رومان دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔
راہداری میں نیم تاریکی تھی۔ وہ پھونک پھونک کے قدم اٹھا رہا تھا مگر اس کے بھاری لانگ شوز لکڑی کے فرش پہ اتنی احتیاط کے باوجود بھی ہلکی سی دھمک پیدا کر رہے تھے اس نے جھک کے ان کے تسمے کھولے۔ ویسے بھی کیچڑ سے بھرے جوتے اندر لے جا کے اس نے اپنی شامت نہیں لانی تھی۔
جوتے ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے بائیک کی چابیاں لٹکائیں۔ جیب سے وہ ماسک نکالا جو بیشا نے پہنا تھا اور بغل میں دبایا وہ گلابی لبادہ..... دبے پاؤں وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا اور بغیر بتی جلائے اسی نیم تاریکی میں..... محض اندازے کے سہارے الماری تک بڑھا..... دھیرے سے الماری کھول کے اس میں گول مول کر کے بغل میں دبایا لباس پھینکا..... ایک دراز میں ماسک رکھا اور اسی رازداری کے ساتھ وہاں سے نکل آیا..... ایک اور دروازے کو ذرا سا کھول کے اندر جھانک کے اطمینان کیا۔
بیڈ پہ کمبل کا پہاڑ سا بنا تھا جس کے اندر سے کوئی نسوانی وجود..... بلکہ بے پناہ وجود خراٹے لیتا لرز رہا تھا..... اسے گہری نیند سوتے دیکھ کے رومان کی سانس قدرے ہموار ہوئی۔ دروازہ اسی احتیاط سے بند کر کے وہ کچن تک آیا..... فریج سے ایک سیب' آدھا کھایا برگر اور پانی کی بوتل نکال کے وہ لکڑی کا تنگ زینہ طے کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ بے تابی سے برگر کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ یہ زینہ اس مختصر سی اسٹور نما گیلری میں جا کے ختم ہوتا تھا جو اس کا ٹھکانا تھا۔ نیچی چھت والا..... سیلن زدہ..... کسی بھی قسم کے فرنیچر' آسائش' آرائش اور سہولت سے یکسر محروم۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور سیب کترتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔ برابر والے گھر کے سب سے اوپر والے کمرے کا پردہ ہمیشہ کی طرح ہٹا ہوا تھا..... چاند کی روشنی سیدھی بیشا پہ پڑ رہی تھی جو روتے روتے نڈھال ہو کے سو چکی تھی۔
رومان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور نگاہوں میں

محبت جھلکنے لگی۔
''دجھلی۔''

٭ ٭ ٭

پرشکوہ خانم نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو وہ کسمسا کے اٹھ بیٹھی..... ویسے بھی دن کا اجالا سیدھا اس کے چہرے پہ پڑ رہا تھا۔ ایسی بری عادت تھی بچپن سے ہی..... پردے ہٹا کے رکھنے کی۔ گرے ہوئے پردے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ کرتے تھے۔
انہیں اپنے برابر بیٹھے محبت سے مسکراتے دیکھ کے میشا نے خفگی کے اظہار کے طور پہ منہ پھیر لیا۔
''ناراض ہو؟ ہونا ہی چاہیے گرینی نے ٹھیک نہیں کیا اپنی ڈول کے ساتھ۔''
وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انہوں نے جھک کے اس کا ماتھا چوما۔
''میشا میری جان..... کاش میں تمہیں سمجھا سکتی کہ میں تمہیں کیوں نہیں لے کے گئی تھی۔ ویسے اچھا ہی ہوا جو تم نہیں گئیں۔ جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''
''ہاں۔ میں جانتی ہوں۔''
رات کا سارا قصہ تازہ ہوتے ہی اس کے دل میں اس بے عزتی کا زخم بھی ہرا ہو گیا۔ وہ اٹھ کے سلیپر پہننے لگی۔
''مجھے پتا ہے میرے جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ تو صرف غلط ہو سکتا ہے۔ صرف غلط۔''
وہ اٹھ کے باہر جاتے جاتے آزردگی سے کہہ گئی اور پرشکوہ خانم کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ان سے ناراض زیادہ ہے یا کسی اور بات پہ دکھی زیادہ ہے۔

٭ ٭ ٭

دروازہ ایک دھماکے سے کھلنے پہ رومان کی انگڑائی درمیان میں ہی رہ گئی۔ وہ بوکھلا کے سامنے دیکھنے لگا..... سمارا بالوں میں رولرز لگائے۔ میک اپ سے لتھڑے نقوش پہ شدید برہمی لیے اسے تیز نظروں سے گھور رہی تھی۔
''کہاں تھے تم رات؟'' اس کی کرخت نوکیلی آواز گونجی۔
''سو رہا تھا۔'' رومان منمنایا۔
''سونے سے پہلے کہاں تھے؟''
''سونے سے پہلے..... اوہ ہاں، یاد آیا واش روم میں تھا..... یہ بھی بتاؤں کیا کر رہا تھا؟''
''شٹ اپ رومان..... سیدھا جواب دو مجھے۔ میں رات کے ایک بجے تک تمہارے روم میں آ آ کے چیک کرتی رہی ہوں۔ تم یہاں نہیں تھے کہاں تھے اتنی دیر تک؟''
''وہ..... میں ایک دوست کے ساتھ تھا میم!''
''دس دن ہوئے ہیں تمہیں اس ٹاؤن میں آئے ہوئے کون سے ایسے دوست بنا لیے ہیں تم نے جو تمہیں آدھی آدھی رات تک روک کر رکھتے ہیں۔ یاد رکھو رومان..... تم یہاں کام کرنے آئے ہو، دوست بنانے نہیں۔''
''جی۔'' وہ ہمیشہ کی طرح رعب میں آگیا۔
''آئندہ تم میری اجازت کے بغیر رات کے نو بجے کے بعد کہیں نہیں جاؤ گے۔''
''جی۔'' اس نے ہاتھ سینے پہ باندھ کے تابع داری سے سر جھکا لیا۔
''میرے گھر میں رہنا ہے..... میرے ساتھ کام کرنا ہے تو میرے کہنے پہ چلنا ہو گا۔ اوکے؟''
''جی میم۔''
وہ سر جھکائے بڑی تابع داری اور مسکینی سے کہہ رہا تھا۔ چہرے پہ دنیا جہاں کی معصومیت تھی۔ سمارا اسے تیز نوکیلی نظروں سے گھورتی جیسے ہی جانے کے لیے مڑی، رومان کی آنکھوں کی شرارت اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے اس نے سمارا کی شان میں کچھ اضافہ کیا دروازہ بند ہونے پہ زبان چڑائی اور لپک کے کھڑکی کی جانب آیا۔ پردہ ہٹایا۔
میشا ہاتھ میں تنکوں کی ٹوکری اٹھائے اپنے گھر کے اجڑے ہوئے لان کو عبور کرتی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی اور وہ جلدی سے پردہ گرا کے باہر کی جانب لپکا۔

٭ ٭ ٭

مائر کب سے وہ بُندہ ہاتھ میں لیے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ زینی اور میشا آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں..... کبھی زینی کی بات یاد آتی۔
''میری ایک چیز ہے تمہارے پاس..... کچھ تھا جو میں اس رات کشتی میں گرا آئی تھی۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے، وہ تم نے میری نشانی سمجھ کے اپنے پاس رکھ لیا ہو گا۔''
پھر رات والی اجنبی حسینہ کی بات ذہن میں گونجتی۔
''مجھے تو یہ بھی کسی کا کھویا ہوا ملا ہے۔ باہر گرا ہوا تھا کہیں۔''
وہ الجھتا چلا گیا۔

٭ ٭ ٭

میشا کی ٹوکری تازہ خوبانیوں اور آڑو سے بھری ہوئی تھی جو اس نے ابھی چنے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک چکنے پتھر پہ بیٹھی وہ ایک ایک خوبانی ٹھنڈے شفاف پانی سے دھو دھو کے رکھ رہی تھی جب رومان اس کے برابر آ کے بیٹھ گیا۔
وہ ذرا کی ذرا چونکی..... پھر ماتھے پہ ڈھیر سارے بل ڈال کے اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی مگن نظر آنے لگی۔
''ہیلو.....'' رومان نے دلچسپی سے اس کے مگن ہونے کو محسوس کیا۔
''کیا ہے؟''
''ویسے تم نے غلط نہیں کہا تھا..... تم ہو خاصی کیوٹ۔''
''تعریف سننے سے میرا غصہ کم نہیں ہو گا۔''
''تو کیا سننے سے ہو گا؟''
''میرا غصہ بڑا خراب ہے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔''
رومان نے اس کی ٹوکری سے چن کے تگڑا سا آڑو نکالا اور کھاتے ہوئے بولا۔
''کوئی بات نہیں..... تم بڑے شوق سے غصہ نکال سکتی ہو مجھ پہ..... فیری مین بڑے غصہ پروف اور ڈھیٹ ہوتے ہیں۔''
''تم بہت نکمے والے فیری مین ہو۔ کچھ نہیں آتا تمہیں تم نے میری لائف کیا بنانی ہے۔ الٹا سب بگاڑ کے رکھ دیا۔ تم جھوٹ بول رہے تھے کہ یہ کرو گے..... وہ کرو گے، رات کو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو سنڈریلا کے ساتھ ہوا تھا۔ تم نے مجھے شرمندہ کرا دیا۔''
''میں نے؟ مجھے کیا پتا تھا تم اندر کون سے کارنامے انجام دے رہی ہو..... میں تو باہر تھا۔''
''باہر تھے تو کیا ہوا..... تمہیں پتا ہونا چاہیے بڑے آئے کہیں کے پرے..... پرے کو سب نظر آتا ہے چاہے سامنے ہو نہ ہو۔''
وہ ناراض ہو کے اپنی ٹوکری اٹھاتی وہاں سے جانے لگی کہ رومان نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔
''اچھا بیٹھو..... میں تمہیں سچ بتاتا ہوں۔''
''کیسا سچ؟'' وہ ٹھٹھکی۔
''اپنے بارے میں ایک سچ..... کچھ ایسا جو تم نہیں جانتیں۔''

٭ ٭ ٭

''تم اپنی کس چیز کی بات کر رہی تھیں جو میرے پاس رہ گئی تھی؟''
مائر اپنی الجھن دور کرنے کے لیے زینی سے فون پہ بات کر رہا تھا..... جبکہ وہ کھلی پڑ رہی تھی کہ شاید وہ اس کے لیے اتنا بے قرار ہو گیا ہے کہ کال کیے بغیر رہ نہیں سکا۔
''ہاں وہ، وہ بُندہ..... یاد آگیا تمہیں؟''
''کیا تم اسے واپس نہیں لینا چاہو گی۔''
''نہیں۔ تم اسے رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو، اس کے ساتھ کا دوسرا ایئر رنگ مجھ سے کھو گیا ہے۔ شاید کہیں گر گیا ہو وہ بھی۔''
مائر زینی کی بات سن کے چونکا..... پھر ہلکا سا مسکرایا۔

(اوہ تو یہ وہی ہے.....)
مگر اس کی خاموشی نے زینی کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔
"مائر..... "وہ بے تابی سے پکار اٹھی۔
"کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟"
اب کے وہ بولا تو بہت مطمئن تھا جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ چکا ہو۔
"ضرور کیوں..... نہیں۔" وہ فضاؤں میں اڑنے لگی۔

✡ ✡ ✡

میشا تجسس کے مارے کچھ اور قریب ہو گئی۔
روہان بھی بہت سنجیدگی سے اسے بتا رہا تھا کہ اس کا خیال تھا اب اس معصوم سے ڈرامے کو طول دینا مناسب نہیں ہے۔
"میں نے تمہیں اپنے بارے میں پورا سچ نہیں بتایا تھا..... دراصل۔" میشا اپنی آنکھیں پوری کھولے... بغیر پلک جھپکے..... اپنا منہ ذرا سا کھولے اس کے چہرے کے بالکل قریب اپنا چہرہ لا کے اسے ایسے تکے جا رہی تھی کہ روہان کی ساری سنجیدگی ہوا ہو گئی۔
وہ دلچسپی سے اس کی نیم وا ہونٹوں پہ ٹھہری اوس کو دیکھنے لگا۔ اور اس کی اوپر کو اٹھی آنکھیں..... جن میں قدرت نے بڑی فیاضی سے بھر بھر کے کاجل انڈیلا تھا۔
روہان کی آنکھوں میں وہی مخصوص شرارت اور ہونٹوں پہ اس کی ازلی مسکراہٹ پھر سے آن موجود ہوئی۔
"دراصل میں ایک....." اس نے کہتے کہتے بات بدل دی۔
"میں ایک ینگ فیری مین ہوں اور میری پاورز بہت کم ہیں۔ ابھی میرے اختیارات محدود ہیں..... میں تمہاری مدد اس طرح سے نہیں کر سکتا جیسے تم چاہتی ہو..... مگر میرے پاس جادو اور پاورز کم سہی..... عقل پرستان میں سب سے زیادہ ہے۔"

"اچھا..... لگتا تو نہیں۔" بڑی دیر بعد اس نے پلکیں جھپکیں۔
"آزما کے دیکھ لو..... میں تمہارا ساتھ دوں گا اس وقت تک جب تک تم سنڈریلا کی طرح اپنے خوابوں کی شہزادے کو نہ پا لو۔"
"پرامس.....؟" میشا نے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے ایک سیکنڈ کی دیر کیے بغیر روہان نے فوراً تھام لیا۔
"پرامس..... پکا والا وعدہ۔"
وہ مطمئن سی ہو کر اپنے کپڑے جھاڑتی اٹھی۔
"چلو..... ٹھیک ہے اب مکرنا مت۔"
"مگر اس کے لیے تمہیں وہ سب کرنا ہو گا جو میں کہوں یعنی میری ٹریننگ شروع۔ کل ہو گی تمہاری پہلی کلاس۔"
"آج سے کیوں نہیں۔"
وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بات کرنے لگے..... پھلوں کی ٹوکری اب روہان نے اٹھا رکھی تھی اور وہ شاہانہ انداز میں ہاتھ ہلاتی اس کے ایک قدم آگے آگے چل رہی تھی۔
"آج تم اچھی طرح سے سوچ سمجھ کے پہلے کسی نتیجہ پہ پہنچ تو جاؤ۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے یا نہیں۔"
"کس نتیجہ پہ پہنچنا ہے مجھے؟"
"تمہیں مائر کا دل اپنی جانب کھینچنے کے لیے میری مدد چاہیے ناں تاکہ وہ تم سے شادی کر سکے۔ تو اس سے شادی کرنے سے پہلے تم یہ طے تو کر لو کہ تمہیں اس سے محبت ہے بھی یا نہیں۔"
"لو..... یہ کیا بات ہوئی۔ محبت تو ہے۔"
"اچھا..... تمہیں کیسے پتا۔"
"اچھا لگتا ہے وہ مجھے۔"
میشا نے الجھن بھرے عالم میں کہا، اب وہ بھلا اور کون سی علامت ہوتی ہے محبت کی۔ اچھا لگتا ہے تو لگتا ہے۔
"اور؟" روہان تفصیل جاننا چاہ رہا تھا مگر وہ جھنجھلا اٹھی۔

"اور کیا..... بس وہ ہے ہی اچھا۔"
"مجھے سمارا آنٹی کی بلی بہت اچھی لگتی ہے تو کیا میں اس سے شادی کر لوں؟"
"تم سمارا آنٹی کو کیسے جانتے ہو؟"
وہ بری طرح چونکی تھی اور اس کے سوال نے روہان کو اسی بری طرح گڑبڑا دیا تھا مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔
"تم یہ سوال کرتے ہوئے بھول رہی ہو کہ میں کوئی عام انسان نہیں ہوں۔"
"اوہ..... ہاں تم تو پری ہو۔ تم تو سب جانتے ہو۔"
"مگر کیا تم مائر کو جانتی ہو؟"
"ہاں ناں..... وہ مائر ہے۔ کارا آنٹی کا بیٹا..... بہت ہینڈسم بالکل کسی پرنس کی طرح۔"
"اتنا تو سب ہی جانتے ہوں گے اس کے بارے میں۔ مگر کسی سے محبت کرنے کے لیے اس کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا ہوتا ہے۔"
میشا چلتے چلتے رک گئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
"کیا واقعی محبت کرنے کے لیے بہت کچھ جاننا ضروری ہوتا ہے؟"
روہان اس کی نگاہوں کے سحر میں کھو گیا اور جیسے ہتھیار ڈال دیے۔
"ہوں..... نہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ محبت کچھ جاننے، کچھ سوچنے، کچھ سمجھنے یا کسی نتیجے پہ پہنچنے کا وقت ہی کب دیتی ہے۔ یہ تو چپکے سے دل میں گھات لگا کے بیٹھی ہوتی ہے اور کسی کو پہلی نظر میں ہی دیکھ کے دبے پاؤں حملہ کر دیتی ہے..... ایک اجنبی کو، ایک انجان کو دل کا حکمران بنا دیتی ہے۔"
میشا ابھی اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اس کی نظر سامنے..... یعنی روہان کے عقب میں گئی..... کافی فاصلے پہ مہر چھتری تانے کسی کو ڈھونڈتی آ رہی تھی..... میشا جست لگا کے روہان تک آئی اس کے بازو کو زور سے پکڑ کے اپنی جانب کھینچا۔
"ارے..... یہ کیا کر رہی ہو۔"

وہ بوکھلا سا گیا جیسے میشا اسے زبردستی اپنے گلے لگانے والی ہو۔ اس افتاد کا امکان اس کے ذہن میں دور دور تک نہیں تھا..... مگر میشا نے اسے کھینچ کر اپنے سامنے کرنے کے بعد اس کی اوٹ میں پناہ لے لی..... خود کو سمیٹ کے اس کی چوڑی پشت کے پیچھے چھپا لیا۔

"مہر ماما..... مجھے چھپا لو۔"
روہان مسکرا دیا۔ "کاش میں واقعی تمہیں چھپا سکتا۔"

مہر اپنی پالتو بلی کی تلاش میں جنگل کی جانب مڑ گئی..... اور روہان نے پھلوں کی ٹوکری اسے تھمائی۔
"لو گئیں تمہاری مہر ماما..... اب میں بھی چلتا ہوں اور تم بھی اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ۔"
وہ اس کے گال تھپتھپا کے مڑ گیا..... اور میشا ٹوکری جھلاتی اس کے وعدوں کے خمار میں ڈولتی آگے بڑھنے لگی..... روہان کے وعدوں نے کچھ ایسی تقویت دی تھی دل کو کہ مائر اب دسترس سے دور نہیں لگ رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچی..... گیٹ سے ذرا فاصلے پہ کھڑی مائر کی کار کو دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی۔
مائر کار سے ٹیک لگا کے کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے زینی اپنی مخصوص اتراتی ہوئی چال کے ساتھ آ رہی تھی..... اس کا حسن مکمل بناؤ سنگھار کے ساتھ دو آتشہ ہو رہا تھا اور مائر کی نظروں میں رعب حسن کے سامنے مرعوبیت کے مکمل عکس ڈولتے نظر آ رہے تھے۔ میشا رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زینی کو مائر کی کار کی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی اور جب مائر نے آگے بڑھ کے زینی کا ہاتھ تھاما..... اور اس کے لیے اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھولا تو میشا کا پورا وجود جیسے بے جان ہو گیا اور ٹوکری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کے نیچے جا گری اور ساری خوبانیاں اور آڑو ادھر ادھر لڑھکنے لگے۔
وہ ان ہی سست مضمحل قدموں کے ساتھ چلتی اپنے کمرے کی جانب گئی۔ رہ رہ کے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب مائر اسے مکمل طور پہ نظر انداز کرتا زینی کو لے کر اس

کے نزدیک سے زن سے موڑ لے گیا تھا..... وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور اداسی سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

آج سے پہلے کبھی خود کو دیکھتے ہوئے اس کی نظروں میں اتنی ناپسندیدگی نہیں جاگی تھی۔

بالوں کو اسکارف سے باندھنے کے باوجود کئی لٹیں نکل کے اس کے چہرے کے اطراف پھیلی تھیں۔ وہ بال جن کو اچھے شیمپو اور کنڈیشنز سے دھلنا تب نصیب ہوتا تھا جب امی اور زینی کے باتھ روم سے شیمپو کی شیشیاں خالی ہو کے نکلتیں اور وہ ان میں پانی ڈال کے ان کی باقیات استعمال کرتی۔

بالوں میں کہیں کہیں گھاس بھی اٹکی تھی..... کہاں کہاں گھس کے تو توڑے تھے پھل۔

اس نے بالوں کو جھاڑا..... پھر گال پہ لگی مٹی نظر آئی تو قمیص کو تھوڑا سا اٹھا کے اپنے گال کو رگڑ کے صاف کرنے لگی پھر دوبارہ خود کو غور سے دیکھا تو شکل پہ بارہ بج گئے۔

"وہ کیسے مجھے دیکھے..... کیسے مجھے پسند کرے۔ کیسے کرے مجھ سے محبت..... ذرا سی بھی تو اچھی نہیں لگتی میں..... گندی، میلی، پھٹے پرانے کپڑوں والی۔"

اور وہاں سے کچھ دور..... اپنے ڈربے نما کمرے کے روشن دان سے جھانکتا رومان مسکرا رہا تھا۔ دور بہت دور سے پیشا اپنے کمرے کی کھڑکی کے پار آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے پہ ملال سے ہاتھ پھیرتی ہمیشہ کی طرح اس کے دل میں اتر رہی تھی۔

"کیسے نہ دیکھوں تمہیں..... کیسے نہ پسند کروں..... کیسے نہ کروں تم سے محبت..... اتنی تو اچھی لگتی ہو تم ..... سادہ، معصوم..... جھلی۔"

اس نے اپنے بازو کو دیکھا..... جہاں پیشا کے ناخن کا ہلکا سا نشان تھا۔ جب اس نے مہر سے چھپنے کے لیے یکدم رومان کو دبوچ کے اپنی جانب کھینچا تھا۔ رومان نے اس خراش پہ ہولے سے اپنے لب رکھ دیے۔

✡ ✡ ✡



"تو تم نے وہ ایئر رنگ پھینک دیا تھا۔" مائر زینی کے ہمراہ ٹہل رہا تھا۔

"ہاں مجھے لگا..... ایک رہ گیا ہے۔ بے کار ہے اب، پتا ہوتا دوسرا تم نے اتنا سنبھال کے رکھا ہو گا تو میں نہ پھینکتی۔"

"کیسے نہ سنبھالتا..... تم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا وہ۔"

"اور تم مجھ تک پہنچنا کیوں چاہتے تھے؟" وہ اترا گئی۔ حسب عادت..... حسب فطرت۔

"کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟"

مائر نجانے کیوں کھل نہ پا رہا تھا..... کھلتے کھلتے ہی اچانک کنی کترا جاتا۔

"مجھے سننا اچھا لگتا ہے۔"

"اور مجھے تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔"

بالآخر مائر کے منہ سے ایک تعریفی جملہ نکل ہی گیا۔ جو کہ بہرحال اس کی تعریف میں نہیں تھا۔

"جانتی ہو..... میں نے اس رات تمہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا مگر صرف تمہاری باتوں کی وجہ سے میں....."

نجانے کون سا احساس تھا جو اسے کہنے سے روک رہا تھا.....

"کیا..... بولو ناں۔"

"نہیں..... ابھی نہیں۔"

"کیوں؟" وہ مایوس ہو گئی..... کچھ جھنجلا بھی اٹھی۔

"مجھے آہستہ آہستہ قدم بڑھانا اچھا لگتا ہے۔"

"اور مجھے ایک ہی جست میں سب فاصلے مٹا دینا اچھا لگتا ہے۔"

وہ کسی چیلنج کی طرح اس کے سامنے آن موجود ہوئی۔

"ویسے بھی اتنی مختصر سی زندگی میں کچھ بھی آہستہ آہستہ کرنے کا وقت کس کے پاس ہے۔"

وہ مائر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی اور وہ اس کے اس فلسفے اور اس رات والی بے ساختگی

میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ مگر پھر زینی کی دلکشی اور عنایت نے اسے مزید کوشش کرنے سے روک ہی دیا۔

☼ ☼ ☼

مہر سر پہ چھتری تانے سمارا کے ساتھ اس کے گھر کے لان میں تھی اور تعریفی نظروں سے شادابی اور سبزے کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے لان کی تو حالت ہی بدل گئی۔۔۔ نیا مالی رکھا ہے؟"

"نہیں بھئی۔ کون اتنے ملازموں کی درد سری پالے۔ رومان۔۔۔ وہی تمہیں بتایا تو تھا۔ میرے شوہر کا کوئی دور کا بھانجا۔"

"ہاں، ہاں، وہ جو تمہارے پاس کام کرنے آیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اسی نے کیا ہے یہ سب۔"

سمارا نے اس کی تواضع کے لیے جو کا کیک سامنے رکھا اور مہر کی نظریں باریک بینی سے اس کے کناروں پہ لگی پھپھوند کو تلاش کرنے لگیں۔۔۔ مگر سمارا بھی ایسی پھوہڑ میزبان نہ تھی۔۔۔ مہمان کے سامنے یہ تین ہفتے پرانا کیک رکھنے سے پہلے اس نے بڑی نفاست اور مہارت کے ساتھ اس کے سوکھتے پھپھوند زدہ کنارے کتر دیے تھے۔

"تم اس سے مالی کا کام بھی لیتی ہو؟"

"نہ صرف مالی کا، باورچی کا ماسی کا، چوکیدار کا اور ظاہر ہے کارخانے کا تو وہ سنبھالتا ہی ہے۔ ہے ویسے ہر فن مولا ٹائپ لڑکا۔۔۔ کون سا کام ہے، جو اسے نہیں آتا پھر میں کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔"

"میرے گھر میں بھی بہت سے کام رکے پڑے ہیں کچھ رینوویشن کے۔۔۔ کچھ لائٹ کے۔ لان تو خیر ہے ہی۔۔۔ تم اسے میری طرف بھی بھیجنا۔"

مہر نے لجاجت سے کہا جس پہ سمارا کے ماتھے پہ بل آ گئے۔

"اتنا وقت کہاں ہوتا ہے اس کے پاس۔۔۔ ویسے بھی جتنا کام کرتا ہے اس سے دس گنا زیادہ باتیں بناتا ہے۔"

سمارا کے لہجے میں یکایک ہی رومان کے لیے بے زاری اور کوفت ٹپکنے لگی۔

"آدھے گھنٹے کا کام چار گھنٹے میں کرتا ہے۔ تمہاری طرف بھیجوں تو میرے تو سارے کام پڑے رہ جائیں گے۔"

مہر نے منہ بنایا مگر بولی کچھ نہیں۔

(خبیث۔۔۔ یہ تو مر کے بھی کسی کو اپنا بخار تک نہ دے)

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔ ویسے بھی ایک واحد بندے پہ تم نے دو دو ذمے داریاں ڈال رکھی ہیں۔ گھر کی بھی، کارخانے کی بھی۔۔۔ سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔"

☼ ☼ ☼

اس وقت تو سمارا نے جی کڑا کر کے مہر کی بات پی لی مگر پھر سارا دن بڑبڑاتی رہی۔

"مہر۔۔۔ مفت خور، کنجوس، بس نہیں چلتا، سامنے والے سے اس کی سانسیں تک مانگ لے۔"

وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی بھڑاس نکالتی رہی۔

"ہر وقت اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں ہوتی ہے مہر۔۔۔ اب اگر میں تمہیں اس کے کام کرنے بھیج دوں تو میرا کیا ہو گا۔"

جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے نگلتا رومان چونکا۔

"کون سے کام؟"

"ارے نکالے ہوں گے اس نے ڈھیروں ڈھیر۔"

رومان سوکھے توس کا لقمہ چبانا بھول گیا۔۔۔ اور ہاتھ میں پکڑا مرغابی کے گوشت کا بھنا ہوا ٹکڑا بھی واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

"اگر وہ اپنا الو سیدھا کرتی ہیں تو آپ اپنا کر لیں۔"

"کیا مطلب؟ میرا کون سا الو ہے؟"

"میں ان کے سب کام کرنے پہ تیار ہوں اگر آپ ان کے بدلے ان سے پیسے مانگ لیں۔"

"کیا؟" وہ چلائی۔

"ہاں۔ کہہ دیں کہ وہ مارکیٹ سے آدھے پیسے لے گا مگر لے گا ضرور۔"

"تمہیں اپنی کمائیوں کی پڑی ہے۔ پہلے یہ کام تو پورے کرو۔" وہ اسے جھاڑنے لگی۔

"یہ بھی تو آپ کا ہی کام ہے آنٹی۔"

"پھر آنٹی؟"

"اوہ۔۔۔ میم۔۔۔ دیکھیں ناں۔۔۔ میں تو آپ ہی کو لا کے دیا کروں گا اپنی آمدنی۔۔۔ آپ کے علاوہ میرا کون ہے۔ جو فالتو وقت ہوتا ہے میرے پاس اس کے کچھ پیسے آ جائیں گے۔"

سمارا بھی سوچ میں پڑ گئی۔۔۔ اب رومان نے مسکراتے ہوئے بھنی مرغابی کے ٹکڑے کو پھر سے اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دبے پاؤں گھر سے نکلی تھی۔

پچھلے رستے سے۔۔۔ جو کہ خودرو جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ نکل کے جنگل تک آنا تھا تو مشکل۔ ایک تو نوکیلی جھاڑیاں اوپر سے جنگلی گیدڑوں کی خوفناک آوازیں پھر پکڑے جانے کا خوف مگر رومان نے اس کی ٹریننگ کے لیے یہی وقت مقرر کیا تھا۔ اور اسے ہر حال میں مائر کو متاثر کرنے۔۔۔ اور اسے خود سے شادی کے لیے تیار کرنے کے گر سیکھنے تھے۔

جادوئی گر۔۔۔

اس جوش نے اسے اتنا خوف زدہ نہ ہونے دیا جتنا وہ عموماً رہا کرتی تھی اور سب سے بڑھ کے یہ تسلی کہ جانا تو رومان سے ملنے ہے۔ ایک پرے سے۔ اس کے ہوتے کسی کی کیا مجال جو بیشا سیف اللہ کا بال بیکا کر سکے۔

رومان کاسنی پھولوں والے پیڑ کے نیچے حسب وعدہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کاسنی پھول۔۔۔ جو پورے چاند کی روشنی میں سفید اجلے اجلے سے لگ رہے تھے۔

"میں اتنی چھپ کے آئی ہوں تم سے ملنے۔"

"میں نے اس کا حل نکال لیا ہے۔"

رومان نے دلچسپی سے اس کے ماتھے پہ شبنم کی طرح ابھرتے قطروں کو دیکھا۔

"وہ کیا؟"

"اب میں روز تمہارے گھر آیا کروں گا۔۔۔ ایک دو گھنٹوں کے لیے اور روزانہ تمہیں ایسے جادو سکھاؤں گا جس پہ عمل کر کے تم مائر کو اپنا بنا سکتی ہو۔"

"سچی؟" وہ کھل گئی۔ اور پھر ساتھ ہی بجھ گئی۔ "مہر ماما تمہیں گھسنے نہیں دیں گی گھر میں۔"

"تمہاری مہر ماما نے مجھے اجازت دے دی ہے۔"

بیشا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ہمیشہ کی طرح وہ ایسا کرتے ہوئے رومان کو بڑی پیاری لگی۔ اس نے اپنی نظریں بیشا کے نیم وا ہونٹوں سے ہٹا کے اس ستارے پر مرکوز کر دیں۔ جو خود بھی جھک کے بیشا کی حیرت کے اظہار پہ حیران ہو رہا تھا کہ حیرانی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔

"تم نے یہ کیسے کیا رومان؟"

"جادو سے۔"

"مجھے بھی دکھاؤ ناں کوئی جادو۔۔۔ پلیز۔" وہ مچل گئی۔

"اوکے۔۔۔ آنکھیں بند کرو۔"

"ہاں!" بیشا نے فوراً سر ہلاتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔۔۔ مگر اگلے ہی پل گھبرا کے کھول دیں۔

"اب کیا ہوا؟"

"نہیں۔ میں نہیں بند کروں گی آنکھیں۔"

"کیوں؟"

"زینی نے منع کیا ہے۔"

"آنکھیں بند کرنے سے؟" وہ حیران ہوا اس منطق سے۔

"نہیں۔ کسی جوان لڑکے کے سامنے اکیلے میں آنکھیں بند کرنے سے۔ وہ کہتی ہیں، سمجھ دار لڑکیاں جوان جہان لڑکوں سے تنہائی میں نہیں ملتیں۔ اور اگر ملنا پڑے تو ان کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔"

"اوہ ... اوہو... وہ کیوں بھلا؟" کتنی دقت ہو رہی تھی رومان کو اپنی ہنسی روکنے میں۔

"دیکھو ناں... اس وقت رات ہے۔ جنگل ہے۔ تم اور میں اکیلے ہیں۔ اوپر سے میں کیوٹ بھی ہوں اور تم بدتمیز بھی... اگر میری آنکھیں بند دیکھ کے تم نے مجھے..."

کہتے کہتے اس نے زبان دانتوں تلے دبالی اور آنکھیں لمحے بھر کے لیے میچ کے جھرجھری سی لی۔

"کیا میں نے ...؟"

"تم نے مجھے... مجھے پیار کر لیا تو... نہ نہ میں نہیں بند کرنے والی آنکھیں۔"

اب رومان سے مزید ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے ہنستے دیکھ کے میشا کو تاؤ چڑھ گیا۔

"میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔" اس نے اطمینان دلایا۔ اور پھر زیر لب اضافہ بھی کیا۔ "کم از کم تمہاری آنکھیں بند کروا کے تو نہیں۔"

"مجھے تمہیں کچھ اور دکھانا ہے۔ چلو کرو بند آنکھیں۔"

میشا ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کرنے لگی۔ مگر احتیاطاً" اس نے جھری سی چھوڑ دی تھی۔ جسے نوٹ کر کے رومان نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور دونوں ہاتھ جو سینے پہ باندھ کے بغلوں میں دبا رکھے تھے نکالے اور اس کے سامنے کر کے کہتے ہوئے مٹھی کھولنے لگا۔

"کھولو اب۔"

میشا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ اور رومان نے دھیرے سے مٹھی کھولی...

اس کی بند مٹھی میں سے جگنو آزاد ہو کے اڑنے لگے۔

میشا کی کاجل بھری آنکھوں میں کرنیں سی پھوٹ پڑیں۔ وہ سحر کے عالم میں ان جگنوؤں کو اڑان بھرتے دیکھ رہی تھی۔ اور رومان سحر کے عالم میں اس کی آنکھوں میں خواب اترتے اور روشنیاں بکھرتے دیکھ رہا تھا۔

"تم تو سچ مچ کے پرے ہو۔" وہ تالیاں بجانے لگی۔ "ایک اور میجک دکھاؤ ناں۔"

"ہاں... بولو۔" رومان نے شیخی میں آ کے فیاضی دکھائی۔ جیسے سامری اپنی گدی پہ اسے ہی تو بٹھا کے گیا ہو۔

"مجھے زینی جیسا خوب صورت بنا دو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"تم سے کس نے کہا' وہ خوب صورت ہے۔"

"تمہیں نہیں لگتی؟"

"ذرا بھی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں لگتی۔" میشا نے ناک چڑھائی۔ "مگر مائر کو لگتی ہے۔ تب ہی تو وہ اس سے ملتا ہے۔"

"کسی سے ملنے کے لیے اس کا خوب صورت ہونا ضروری نہیں ہے۔ دیکھو ناں۔ ہم بھی تو مل رہے ہیں جبکہ تم مجھے کہیں سے بھی خوب صورت نہیں لگتیں۔" شاید یہ بات میشا کے سر کے اوپر سے گزر جاتی اگر کہتے ہوئے رومان کسی طرح اپنی مسکراہٹ پہ قابو پالیتا مگر یہ شرارتی مسکراہٹ میشا کو بتا گئی۔

"ہاں ' ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم بھی مجھے زہر لگتے ہو میں پھر بھی میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ مطلب ملنے کے لیے کسی کا خوب صورت ہونا یا اچھا لگنا ضروری نہیں ہے۔ مگر محبت کرنے کے لیے ہے۔"

رومان کی ساری شرارت اور غیر سنجیدگی ہوا ہو گئی۔

"کیا واقعی کسی سے محبت کرنے کے لیے اس کا خوب صورت ہونا ضروری ہے؟"

وہ اترے چہرے ' تھکے ہوئے لہجے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں خوبصورت بھی... اور امیر بھی..."

رومان کے چہرے پہ افسردگی چھا گئی اور وہ اپنی قمیص کے اس چھید میں انگلی ڈال کے اسے مزید بڑا کرنے کے شغل میں لگ گیا۔ جو بالکل سامنے ہی تھا۔

"بتاؤ ناں۔ تم ایسا کیا کر سکتے ہو۔ جس سے میں مائر کو زینی سے زیادہ اچھی لگنے لگوں۔"

"اس کے لیے جو کرنا ہے ' تمہیں کرنا ہے۔ مجھے نہیں۔"

"وہی تو... کیا کرنا ہو گا مجھے؟"

"جو میں کہوں... مانو گی؟"

رومان نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"وعدہ..." میشا نے جھٹ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے احترام سے تھامتے ہوئے رومان اپنے گھٹنوں پہ جھکا اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ میری سعادت ہو گی ہر ہائی نیس۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔"

میشا نے بڑی رعونت کے ساتھ سر جھٹکا اور اپنا ہاتھ ہلکے سے جھٹکے سے اس سے چھڑا لیا۔

"تمہیں صرف میرے نہیں۔ اس کے سامنے بھی کسی کوئن کی طرح ہی رہنا ہے۔"

"ایسے پھٹے پرانے کپڑوں والی کوئن؟" میشا کا چہرہ اتر گیا۔ "تم میرے لیے پرستان سے پیارے پیارے کپڑے لاؤ ناں پلیز۔"

"ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں سے جو چیز آئے گی' جادوئی اور عارضی ہو گی۔ یاد کرو سنڈریلا کی کہانی۔ بارہ بجتے ہی سب کچھ غائب ہو جاتا تھا۔ وہ اور وقت تھا۔ بارہ بجے کا مطلب تھا آدھی رات۔ اب تو بارہ بجے شام ہوتی ہے۔ ذرا تصور کرو۔ تم جادو کے کپڑے پہنے مائر کے سامنے شو مار رہی ہو۔ بارہ بجتے ہیں اور تمہارے کپڑے غائب۔"

"نہیں۔" میشا نے ہلکی سی چیخ مار کے دونوں بازو خود پہ رکھ کے ایسے ڈھانپا جیسے واقعی... سچ مچ...

"اور مائر کے اور تمہارے اصلی والے بارہ بج جائیں گے' اس لیے جیسی ہو' جس طرح ہو۔ ویسی رہو اور اسی طرح اسے متاثر کرنے کی کوشش کرو ویسے بھی کوئن بننے کے لیے لباس یا زیور' تاج کی نہیں۔ ایٹی ٹیوڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس کے آگے پیچھے پھرنے کے بجائے یا الٹی سیدھی حرکتوں سے اسے اٹریکٹ کرنے کے بجائے اگنور کرو۔ جیسے تمہیں اس کی پرواہی نہ ہو۔ جیسے تم اسے کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو۔"

میشا کچھ دیر اسے بے یقینی سے گھورتی رہی۔

"تم مذاق کر رہے ہو؟"

"بالکل بھی نہیں۔"

"تو پھر تم میرا کباڑا کر رہے ہو۔ تم چاہتے ہی نہیں کہ مائر کی مجھ سے شادی ہو۔"

وہ روٹھ کے جانے لگی اور رومان کے پکارنے پہ بھی پروا نہ کی۔

"میشا! رکو تو..."

☼ ☼ ☼

ادھر کارا نے الگ شوشا چھوڑ دیا۔ پرشکوہ خانم کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے کسی لڑکی کو طلب کیا۔ بلکہ کسی کو کیا۔ صاف صاف میشا کا نام لیا۔

"آجکل کی رسم ہے۔ اب آئی ہوں تو یہ فریضہ انجام دے کے ہی جاؤں لیکن میں اتنا عرصہ یہاں سے دور رہنے اور فیملی سے کٹ جانے کی وجہ سے سب روایتیں وغیرہ جیسے بھول سی گئی ہوں... میرے تو تقریباً" سب ہی ملازم بھی وہیں سے آئے ہیں میرے ساتھ... بہتر تو یہی ہوتا کہ میں آپ کو کچھ دن کے لیے اپنا مہمان بناتی' لیکن اس دن آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی' میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتی۔"

"ہاں... مگر میشا۔" وہ متذبذب تھیں۔

"آپ کے پاس پلی بڑھی ہے۔ آپ نے سب سکھایا ہو گا اسے۔ اسے کرنا ہی کیا ہے' صرف یہ دیکھنا ہے کہ سب انتظامات رسم و رواج کے مطابق ہو رہے ہیں یا نہیں۔"

"نہیں کارا... اسے کہاں آتا ہے یہ سب۔"

"تو ایمی... یا زینی۔"

"وہ تو بالکل ہی نکمیاں ہیں۔"

مگر کارا کا اصرار بڑھتا گیا۔ ناچار انہیں ٹالنے کے لیے کہنا پڑا۔

"اچھا... دیکھتی ہوں کچھ۔"

"میشا! تم رات کو کہاں تھیں؟" ان کے سنجیدگی سے پوچھنے پہ وہ گھبرا گئی۔
"نہیں.... وہ.... جنگل.... جنگل میں تھی۔"
"جنگل میں' مگر کیوں؟"
"جگنو پکڑنے۔"
"اتنی رات کو؟"
"دن کو جگنو کہاں نظر آتے ہیں' رات کو ہی تو ہوتے ہیں گرینی۔"
"میشا.... تمہیں بالکل ڈر نہیں لگتا' جنگل میں اکیلے جانے سے.... دن کو تتلیاں پکڑنے اور رات کو جگنو پکڑنے چلی جاتی ہو۔ ایسی کون سی ضرورت پڑ گئی تھی تمہیں جگنو کی۔"
"کسی نے بتایا تھا' جگنو مٹھی میں بند کر کے جو دعا مانگو پوری ہو جاتی ہے یا کوئی ایسا دروازہ ضرور کھلتا ہے' جس سے دل کی مراد پوری ہونے کا چانس ہو۔"
"کیا دعا مانگی تم نے؟"
ان کے پوچھنے پہ وہ بے ساختہ گنوانے لگی۔
"بڑا سا محل جیسا گھر' نوکر چاکر' عمدہ' نفیس' مہنگے والے کپڑے' ہیرے جواہرات' دنیا جہان کے ملکوں کی سیر' عیش' آرام' مزے مزے کے کھانے.... اور...."
وہ شرما کے چپ ہو گئی۔
"اور کیا؟"
"اور ایک شہزادہ۔"
پرشکوہ خانم کو غصہ اور ہنسی بیک وقت آئے.... مگر کمال مہارت سے انہوں نے ہنسی چھپالی اور غصہ ظاہر کیا۔
"فضول باتوں میں بہت دل لگتا ہے تمہارا۔"
"دعا مانگنا بری بات نہیں ہے۔"
"تو پھر یہ دعا مانگو کہ تمہیں عقل آجائے۔"
"یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ آپ کو مجھ پہ ترس آجائے۔"
"اللہ نہ کرے' جو میں یا کوئی اور تم پہ ترس کھائے' میں تو چاہتی ہوں لوگ تم پہ رشک کریں' اسی لیے تو کارا پہ مجھے بہت غصہ آیا' جب اس نے یہ بات کی حالانکہ مجھے ہمیشہ سے بہت عزیز رہی ہے وہ۔"
"کس بات پہ غصہ آیا تھا؟" اس نے کریدنا چاہا۔
"اس کے گھر میں کچھ دن بعد آنچل کی رسم ہونے والی ہے۔ وہی رسم جس میں لڑکے کی ماں باقاعدہ طور پہ اپنی منتخب کردہ بہو کا نام سب کو بتاتی ہے۔ تیاریاں جاری ہیں جن میں مدد کے لیے اس نے تمہارا نام لیا۔"
"سچ.... کب جانا ہو گا مجھے؟"
"میشا...." پرشکوہ خانم کو اس کے اشتیاق پہ حیرت ہوئی۔
"اس نے کیا تمہیں ملازمہ سمجھ لیا جو...."
"ملازمہ نہیں گرینی! اپنا سمجھ کے کہا ہو گا۔" میشا نے فوراً بات کاٹ کر کارا کی جانب سے صفائی پیش کی۔
"مگر مجھے یہ بات بہت بری لگی۔"
"آپ نے جھٹ انکار کر دیا ہو گا۔" میشا نے ہونٹ لٹکائے۔
جگنو ہاتھ میں لے کر دعا مانگنے والی بات پہ اب یقین سا آرہا تھا۔ واقعی' ایک دروازہ کھلا تو ہے' مگر گرینی نے بند بھی کر دیا۔
"یہی تو مصیبت ہے۔ اسے صاف انکار کرنا' مشکل لگتا ہے۔"
"پلیز گرینی! انکار نہ کریں نا' پلیز' پلیز' کسی کے کام آنا تو اچھی بات ہے گرینی۔"

☼ ☼ ☼

"مام' یہ کیسے کیسے آئیڈیاز آتے ہیں آپ کو؟" مائر ساری بات جاننے کے بعد ناگواری سے کہہ رہا تھا۔
"یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔"
"بہت عجیب اور فضول سی ہے۔"
"جیسی بھی ہیں' ان پہ عمل تو کرنا ہے۔ کم از کم یہاں رہتے ہوئے تو کرنا پڑے گا۔"
"لیکن ایسا کرنے سے کتنی لڑکیوں کے دل ٹوٹیں گے۔ ان کی فیلنگز ہرٹ ہوں گی۔"
"وہ سب بھی اسی فیملی کی ہیں' ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ سب جانتی ہیں' تم ان میں سے کسی ایک کو ہی پسند کرو گے۔"
"آپ میری پسند جانتی ہیں مام۔" اس نے اپنی بات یاد دلائی۔
"مگر تم اسے نہیں جانتے۔"
"اب جاننے لگا ہوں۔"
مائر کی مسکراہٹ اور اعتراف نے کارا کو ٹھٹک جانے پہ مجبور کیا۔
"کون ہے وہ لڑکی؟"
"آپ کی پیاری آنٹی کی پوتی' زینی۔"
"زینی...." کارا اچھل کے رہ گئی۔ کشمکش و پیچ کے عالم میں مائر کی جانب دیکھا جو داد طلب مسکراہٹ کے ساتھ بڑے امید بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ بمشکل مسکرا کے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اوہ.... زینی.... اچھا۔"

☼ ☼ ☼

وہاں رومان مہر کو شیشے میں اتار رہا تھا۔
"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے.... میں آپ کے لان کو چند ہی دن میں ہرا بھرا کر دوں گا اور جو' جو کام ہیں' مجھے بتا دیں' میں روز دو گھنٹے کے لیے آیا کروں گا۔"
"سمارا تو کہتی ہے' تم بہت کام چور اور سست ہو۔"
"اب میں کیا کہوں؟" اس نے بے چاری سی شکل بنالی۔
"خیر' یہ تو عادت ہے اس کی۔ تم اس کے پاس کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟"
"کیا کروں.... نانا جی نے مرتے وقت نصیحت کی تھی کہ ان کے پاس جا کے ان کے بزنس میں ہاتھ بٹاؤں.... بیوہ ہیں نا بے چاری۔"
"تو تم اب اس دنیا میں اکیلے ہو؟" مہر کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔
"جی.... بالکل اکیلا۔" اس نے منہ کچھ اور لٹکا لیا۔
"آؤ اندر آؤ۔" مہر کا لہجہ پل میں شیرینی سے بھیگ گیا۔ وہ اسے لیے اندر آئی جہاں ایمی صوفے پہ بیٹھی پڈنگ کھاتے ہوئے میشا سے الجھ رہی تھی۔
"تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی کھاتے ہوئے انسان کے سر پہ کھڑے ہو کے ڈسٹنگ نہیں کرتے' بعد میں کر لینی تھی۔"
"تم بعد میں کھا لینا' مجھے کام ختم کرنا ہے۔" میشا مہر اور زینی سے تو پھر بھی دب جاتی تھی۔ ایمی سے ہرگز نہیں۔
"تم ہر بات میں مجھے جواب کیوں دیتی ہو؟"
"اور تم ہمیشہ مجھ سے سوال کیوں کرتی ہو؟"
"میشا.... یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔"
مہر نے اندر آتے ہی اسے لتاڑا اور ایمی نے بھی جھٹ سے شکایت جڑ دی۔
"ماما.... یہ میرے ساتھ بدتمیزی کرتی ہے' اس نے مجھے موٹی بھی کہا۔ لگائیں اسے دو چار۔"
"تمہیں تو ساری دنیا موٹی کہتی ہے۔ کس کس کو مار پڑواؤ گی؟"
میشا' رومان کو گھورنے کے ساتھ ساتھ ایمی کو بھی تپا رہی تھی۔
"کون کہتا ہے اتنی پیاری لڑکی کو موٹی؟ کس کی نظر اور حسن ذوق دونوں خراب ہیں؟"
ایمی ابھی ڈھنگ سے حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ رومان نے اگلی بات کہہ کر اسے پریشان بھی کر ڈالا۔
"یہ آپ کی بیٹی ہے میم.... اتنی پیاری' اتنی حسین؟"
"لگتا ہے نظر اور ذوق تمہارا خراب ہے۔" میشا تلملا اٹھی۔
"میشا.... تمہیں مہمان سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" مہر کے ڈانٹنے پہ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔
"ہونہہ.... مہمان۔"
"ناک میں دم کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔"
"آپ فکر نہ کریں.... آپ کے دوسرے سب مسئلے حل کرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ مسئلہ بھی حل کر دوں گا۔"

رومان نے تسلی دی۔ مہراس پہ تو نہیں ،مگر اپنی ایک تازہ سوچ پہ ضرور خوش ہو کے مسکرا دی کہ ابھی ابھی اس نے اپنا ایک اور اہم مسئلہ بھی رومان کے ذریعے حل کرنے کا سوچا تھا۔

امی کا مسئلہ۔۔۔

☼ ☼ ☼

"کیسی باتیں کر رہے ہو مائر؟" زینی ہکا بکا رہ گئی۔ "میں یہ سب کیسے کر سکتی ہوں؟"

"دیکھو زینی! تم مجھے پسند ہو ،مگر میں چاہتا ہوں تم ماما کو بھی پسند آجاؤ' اور ان کے دل میں اترنے کا یہ گولڈن چانس ہے' تمہیں ان کی تھوڑی سی مدد ہی تو کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے' صرف اور صرف تمہارے لیے۔"

اس نے بادل نخواستہ ہامی بھری۔

"تو کل ہم وہیں ملیں؟"

"کہاں۔۔۔"

"اسی جھیل۔۔۔ جہاں پہلی بار ملے تھے' بلکہ اب تم اپنا وعدہ نبھانا' مجھے کشتی چلانا سکھانا۔"

زینی اس فرمائش پہ گھبرا سی گئی۔

"نہیں' موسم ٹھیک نہیں ہے' ہم کشتی میں نہیں بیٹھیں گے۔"

☼ ☼ ☼

رومان گھاس تراش رہا تھا' جب میشا کو آتے دیکھا۔

"اتر گیا غصہ؟"

"مجھے کوئی غصہ نہیں تھا۔"

"تمہیں غصہ تھا' بلکہ جیلسی۔"

"جیلسی' وہ کس سے؟"

"میں نے تمہارے سامنے تمہارے بجائے امی کی تعریف جو کر دی تھی۔ اسے حسین کہہ دیا تھا۔ اس بات کی جیلسی۔ اسی لیے تو تم مجھ پہ بگڑ رہی تھیں۔"

"جی نہیں' بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔ وہ تو میں اس لیے تم سے ایسے بات کر رہی تھی کہ مہر ماما تم پہ اور زیادہ مہربان ہو جائیں۔ جو لوگ مجھے زہر لگتے ہیں' ان کو بہت اچھے لگتے ہیں او جن کے ساتھ میں اچھے سے بات کروں' وہ ان کو بہت برے لگتے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ تم تو بہت ذہین ہو' آئم امپریس یار۔"

"تم نے پھر مجھے یار کہا۔۔۔ تمیز سے رہا کرو۔"

"ایسے نخرے اور رعب تم مائر کے سامنے دکھاؤ تو کچھ بات بھی ہے۔"

"میں اس کے سامنے جاؤں گی تو کچھ دکھا پاؤں گی نا' ایک موقع ملا تھا' مگر گرینی نے منع کر دیا۔"

"کیسا موقع؟"

☼ ☼ ☼

"ماما۔۔۔ یہ سنہری موقع ہے۔" زینی مہر کو منا رہی تھی۔

"مگر کارا نے تمہاری گرینی کو فون کر کے پہلے ہی اس مقصد کے لیے میشا کو بلوا لیا ہے۔"

"کیا؟ میشا۔"

"اور یہ اسی پہ سوٹ کرتا ہے۔۔۔ تم خود سوچو' ایک طرف تم مائر سے شادی کرنا چاہتی ہو اور دوسری طرف وہ کرنا چاہتی ہو جس کے لیے سب سے پہلے ذہن میں صرف میشا جیسی لڑکی کا نام آتا ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ میشا تک کے لیے تمہاری گرینی نے منع کر دیا ہے کارا کو۔"

"زبردست۔۔۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اب تو جب آپ کارا آنٹی سے کہیں گی کہ چونکہ گرینی نے نہیں ۔۔۔ نہیں' آپ یہ ظاہر کریں کہ انکار گرینی نے نہیں' میشا نے خود کیا ہے' تو اس وجہ سے آپ ان کی پریشانی کا خیال کر کے مجھے مدد کے لیے بھیج رہی ہیں۔"

"تو تم نہیں مانو گی؟"

مہر زچ ہو اٹھی' جو بھی تھا کارا سے ازلی رقابت کی وجہ سے وہ اس کے سامنے کبھی بھی سر نیچا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"پلیز ماما۔۔۔ ان پہ بہت اچھا امپریشن پڑے گا۔"

☼ ☼ ☼

"ان پہ اچھا امپریشن ڈالنے کے لیے تمہیں وہاں ضرور جانا چاہیے' مناؤ گرینی کو۔"

"عجیب ہو تم۔۔۔ کبھی کہتے ہو' مجھے مائر کو اگنور کرنا چاہیے۔ اس پہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہیے کہ میں اس کی ایک نظر کے لیے مر رہی ہوں اور کبھی کہتے ہو کہ کارا آنٹی کے آگے پیچھے پھر کے ان کی چاپلوسی کرنی چاہیے۔"

"لڑکیوں کو پٹانے کے طریقے الگ ہیں اور ان کی ماؤں کو پٹانے کے الگ۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا' تم نے کبھی کسی لڑکے کو پٹایا۔"

"شٹ اپ۔"

وہ بھنا اٹھا اس نامعقول سوال پہ۔

☼ ☼ ☼

کارا سے پہلے گرینی کو پٹانے کا مرحلہ سر کیا میشا نے۔ ادھر مہر نے بھی زینی کے کہنے پہ کارا کو فون کر دیا۔۔۔ اب کارا میڈم پریشان۔

"مائے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں' آنٹی سے میں نے خود کہا تھا میشا کے لیے۔ مجھے لگا وہ انکار کرنا چاہ رہی ہیں۔ مگر کر نہیں پا رہیں' ادھر مہر نے خود فون کر کے زینی کے لیے کہا تو میں منع بھی نہ کر سکی۔ بہرحال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت تو ہے ہی' لیکن اب آنٹی بھی میشا کو بھیج رہی ہیں۔"

"تو بھیجنے دیں۔۔۔ سو واٹ' اچھا ہے آپ کی زیادہ سے زیادہ ہیلپ ہو جائے گی۔"

وہ الٹا مطمئن ہو گیا کہ زینی پہ کام کا زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا تو اس کا موڈ آف نہیں ہو گا۔

کچھ ایسی ہی سوچ زینی کی بھی تھی۔

"آنے دو اسے بھی۔۔۔ میرا کیا جاتا ہے۔"

"مگر وہ ایسے کاموں میں بڑی تیز ہے۔" امی نے ڈرانا چاہا۔ "ایسا نہ ہو کارا آنٹی کو امپریس کر لے۔"

"ہاں' ہاں پتا ہے۔ عادی ہے وہ ان سب کاموں کی اور ماہر بھی۔۔۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ اچھا ہے وہ آجائے۔ اب سارے فضول کام وہ کرے گی' میں پورے دھیان سے مائر اور کارا آنٹی کے دل میں اترنے کے مرحلے طے کروں گی اور مجھے پتا ہے کہ اس کے کیے کرائے کو میں نے اپنے نام کیسے کرنا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو اس کے سارے کاموں کا کریڈٹ تم لینے والی ہو؟"

امی اب معاملے کی تہ تک اتری۔

☼ ☼ ☼

رومان پہلے گلاب کی قلمیں لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مٹی سے بھرے تھے۔ گیلی مٹی کو تھپتھپا کے وہ اٹھا اور پائپ سے ساری بیلوں کو پانی لگانے لگا۔ اسی اثنا میں زینی اٹھلاتی بل کھاتی فون پہ بات کرتی اندر سے نکلی۔

"میں کب سے ویٹ کر رہی ہوں مائر! تم لیٹ ہو گئے ہو؟ کہاں پہ ہو؟"

رومان کی مخصوص شرارتی مسکراہٹ بیک وقت ہونٹوں اور آنکھوں میں لپکی اور اس نے پائپ کا رخ زینی کی جانب کر دیا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا اٹھی۔

"اوہ۔۔۔ گاڈ۔۔۔ یہ کیا ہے؟"

اس کے سنبھلتے سنبھلتے ہی رومان اسے بھگو چکا تھا۔

زینی خطا ہوتے اوسان کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک طرف پھینک کے کسی ستون کی آڑ لینے لگی۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔ کون ہو تم؟"

"اوہ۔ سوری۔"

رومان چہرے پر گھبراہٹ کے آثار لیے اسی رخ پر مڑا جہاں وہ مڑی تھی اور ساتھ ہی اس کا پانی کا پائپ بھی۔

"پتا نہیں کیسے یہ۔۔۔ سوری۔"

پائپ ایک بار پھر اسے نشانے پر لیے ہوئے تھا۔ وہ چلاتی ہوئی اچھل کے دوسری جانب مڑی۔

"ہٹاؤ اسے۔"

"اوہو۔ آپ تو ساری بھیگ گئیں۔"

معذرت اور ہمدردی کے دوران بھی پائپ کا رخ

مسلسل زینی کی جانب ہی تھا یہاں تک کہ وہ چیختی چلاتی اندر کی طرف بھاگی۔

"ماما۔ یہ کون ہے۔ کسے گھر میں گھسا رکھا ہے آپ نے۔"

رومان نے نیچے گرا موبائل فون اٹھایا اور پائپ کی پھوار سے اسے بھی تسلی بخش انداز میں فیض یاب کرنے کے بعد دوبارہ نیچے پھینک دیا۔

ماڑ کتنی ہی دیر نمبر ملاتا رہا۔ مگر دوسری جانب زینی کا فون اسے مسلسل بند مل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بیشا چلتے نہیں بھاگتے ہوئے پگڈنڈی سے گزر رہی تھی جب رومان نے اس کے سامنے لا کے بائیک روکی۔

"سنو لڑکی!"

"تمیز سے۔"

بیشا نے گھر کا۔ رکی وہ پھر بھی نہیں۔

"ہر ہائی نیس! رکیے تو۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ زینی کب کی پہنچ چکی ہوگی۔"

"نہیں پہنچی اور ابھی اسے ایک آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔ تم آؤ، میں تمہیں دس منٹ میں وہاں پہنچا دیتا ہوں۔"

"ہائے تھینک یو رومان!" وہ اچھل کے بائیک پر سوار ہو گئی۔

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو میری ڈیوٹی ہے یار!"

"پھر سے یار؟"

بیشا نے اس کی کمر پر دھموکا جڑا۔ رومان نے حسب وعدہ دس منٹ کے اندر اندر بائیک کارا کے گھر کے سامنے روکی۔ راستے میں وہ اسے زینی کو بھگونے اور اس کا فون خراب کرنے کا کارنامہ سنا چکا تھا جس پر بیشا کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی اور ہنستے ہنستے وہ یکدم خائف ہو گئی، جب کارا کے محل جیسے گھر پہ نظر پڑی۔

پہلے اس نے اپنے کپڑے دونوں ہاتھوں سے جھاڑے ان کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی، پھر بال سنوارنے لگی۔

"رومان! میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میں بہت .... بہت نروس ہوں۔" پھر وہ اس کی بائیک میں لگے آئینے میں خود کو دیکھ کے تسلی کرنے لگی۔

"میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا۔"

رومان نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مسکراتا رہا۔ جانتا تھا کچھ بھی کہہ دے وہ یقین کرنے والی نہیں۔

بے اعتماد قدموں کے ساتھ پسینے کی بوندوں سے بجی پیشانی اور ٹھنڈے یخ ہوتے وجود کے ساتھ اس نے آگے قدم بڑھانا چاہا تو ٹھٹک کے رک گئی اس کا ہاتھ رومان کی گرفت میں تھا۔ بیشا نے ابرو اچکا کے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا۔ رومان اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے تھامے بائیک سے اترا۔ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے عقیدت سے کہا۔

"وش یو آل دی بیسٹ مائی کوئین!"

جیسے جادو کی چھڑی گھوم گئی۔

پل میں سب بدل گیا۔

بیشا کی ساری گھبراہٹ ہوا ہو گئی۔ چہرے پہ اعتماد جھلکنے لگا اور اس نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ رومان سے چھڑایا۔ گردن اکڑائی اور ایک تمکنت بھرے اعتماد کے ساتھ شاہانہ چال چلتی اندر بڑھنے لگی۔

رومان ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی اور نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رومان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ایسے اوجھل ہوئی جیسے اس نے اپنی بڑی قیمتی چیز کسی کو خود اپنے ہاتھوں سونپ دی ہو۔

☆ ☆ ☆

امی منہ بنائے بیٹھی تھی۔

"زینی تو زینی بیشا بھی وہاں گئی ہے۔ میں ہی فالتو ہوں۔"

"تمہیں وہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے یہاں دھیان دینا چاہیے۔"

مہر کے مشورے پہ وہ ہاتھ نچانے لگی۔

"کوئی نہیں۔ میں نہیں کرنے والی بیشا والے کام۔"

"تم سے کہہ کون رہا ہے؟ الٹا سارے کام بگاڑو گی۔ بہتر ہو گا تم سارا دھیان رومان پہ رکھو۔"

"رومان؟" وہ چونکی۔

"ہاں۔ میں نے تمہارے لیے اسے منتخب کیا ہے، اس سے بہتر لڑکا کوئی ہو ہی نہیں سکتا گھر داماد بنانے کے لیے۔"

امی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رومان پینٹ کا ڈبا اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔ امی نے پہلی بار غور کیا۔

"ہوں۔ اتنا برا بھی نہیں ہے۔"

اگلے ہی پل وہ پچھلے دالان میں تھی، جہاں وہ دیواریں رنگ رہا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا کیونکہ جس دیوار پہ اس نے برش پھیرنا تھا اس سے ٹیک لگا کے امی کھڑی چیونگم کے ببل بنا رہی تھی۔

رومان گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا گھور رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں اگر تمہیں پینٹ کروں تو کتنا ٹائم اور لگے گا۔"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"نہیں۔ سیریسلی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، مجھے فضول مذاق پسند نہیں ہے۔"

اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی پر شکوہ خانم نے بڑی ہی ناگواری سے یہ منظر دیکھا۔ اور فوراً مہر سے باز پرس کرنے گئیں۔

"یہ کس راہ چلتے کو تم نے گھر میں گھسا لیا ہے مہر!"

"رومان کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"ہاں۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ اس گھر میں تین تین جوان خوبصورت لڑکیاں ہیں اور تم نے ایک جوان جہان اجنبی لڑکے کو یہاں دندنانے کی اجازت دے دی ہے۔"

"رومان بہت اچھا اور شریف لڑکا ہے اور پلیز! آپ میرے معاملوں میں نہ بولا کریں۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کون کتنا قابل بھروسا ہے۔"

"تمہیں یہ پتا ہوتا تو تم سیف اللہ پہ بھی بھروسا کرتیں مہر!"

وہ تاسف سے کہتی وہاں سے چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

کارا اور زینی دونوں کے چہروں پہ ایک دوسرے کے لیے زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔ جیسے دل پہ پتھر رکھ کے جھیل رہی ہوں۔

"ویسے تو کالج اور اسٹڈیز کی وجہ سے اتنا ٹائم نہیں ملتا پھر بھی ماما نے مجھے اتنا ٹرینڈ تو کر دیا ہے کہ میں ضرورت پڑنے پہ کوئی بھی کام کر سکوں۔"

"ہاں۔ مہر کی ٹریننگ تو تم میں صاف نظر آ رہی ہے۔" کارا نے مسکرا کے چبھتے لہجے میں کہا۔

"میں پہلی بار یہاں ہونے والی کسی آنچل کی رسم میں شرکت کر رہی ہوں۔ ورنہ مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں ہے۔"

اس نے بے نیازی جتانی چاہی مگر دوسری جانب بھی کارا تھی۔

"اگر تمہیں پسند نہیں ہے جانی! تو کوئی بات نہیں۔ کوئی فورس نہیں کر رہا۔ تم بے شک اٹینڈ نہ کرنا سویٹ ہارٹ!"

وہ گھبرائی۔ سانس پلٹ گیا تھا۔

"نہیں آنٹی! آپ کی بات اور ہے۔ آپ کے گھر کا کوئی بھی فنکشن میں کیسے مس کر سکتی ہوں۔"

ان دونوں کی گفتگو سے الگ بیشا رومان کی ہدایت کے پیش نظر صرف اور صرف کام پر دھیان دیتے ہوئے کسی ملازم سے کشنز وغیرہ بدلوا رہی تھی مگر تب اس کا سارا انہماک دھرا کا دھرا رہ گیا جب ماڑ کو سیڑھیوں سے نیچے اترتے دیکھا۔

"زینی! تمہیں میرے ساتھ فلاور شاپ تک چلنا

ہوگا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی پسند کے پھول آرڈر کرو۔"

وہ میشا کو مکمل طور پر نظرانداز کرتا اس کے پاس سے گزر گیا۔ زینی نے بے کار کی سعادت مندی دکھائی۔

"نہیں مائر! میں کارا آنٹی کے ساتھ بزی ہوں ان کو میری ضرورت زیادہ ہے۔"

"نہیں زینی! مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے نہ ہونے سے یہاں میرا کوئی کام رکے گا۔" کارا نے صاف گوئی اور بے مروتی کی انتہا کردی۔ "تم چاہو تو جاسکتی ہو۔" وہ دل سے چاہتی تھی زینی چلی جائے۔ اسے برداشت کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا مہر کو جھیلنا۔

میشا ابھی تک گم صم بت بنی کھڑی تھی اسے اپنے پیچھے سے آتے دونوں ملازموں کی آواز بھی نہ سنائی دی جو کوئی صوفہ اٹھائے اس کے پیچھے کھڑے منتظر تھے کہ وہ کب راستہ دے۔

"پلیز۔ سائیڈ پر ہوجائیں۔"

کارا متوجہ ہوئی تو اس نے بھی پکارا۔

"میشا۔" مگر میشا مائر کو زینی کے اتنے نزدیک دیکھ کے اور اس کی پیار بھری نظریں زینی پر مرکوز دیکھ کے گنگ ہوگئی تھی۔

"اسے صرف دکھائی ہی کم نہیں دیتا۔ سنائی بھی کم دیتا ہے۔" زینی کے طنز پہ سب ہنس پڑے۔

کارا بھی۔ مائر بھی اور چھ سات ملازم بھی۔ ان کی کھلکھلاہٹ نے میشا کو ہوش دلایا مگر ہوش آکے پھر سے اڑ گیا جب احساس ہوا وہ اس وقت کتنے لوگوں کی تمسخر بھری نظروں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا میشا! کہ تم راستہ روکے ہوئے ہو۔"

کارا نے ناگواری سے ٹوکا۔

"اسے کم سننے، کم دیکھنے کے ساتھ ساتھ کم سمجھنے کی بھی عادت ہے آنٹی!" زینی نے مائر کے ساتھ باہر نکلتے نکلتے ایک اور چٹکی بھری۔

میشا کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔

✡ ✡ ✡

"اب کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟"

رومان کوئی سوئچ بورڈ کھولے اسے ٹھیک کرتے ہوئے فون پہ میشا سے بات کر رہا تھا، جو کارا کے گھر میں ہی کسی کونے میں دبکی بڑی رو رہی تھی۔

"وہ مجھے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔"

"کیونکہ تم جان بوجھ کے اس کی نظروں میں آنے کی کوشش کررہی ہو۔ ایسے وہ تم پہ توجہ نہیں دے گا۔ تم سے چڑے گا۔"

"اور اگر میں اسے نظر ہی نہ آؤں گی تو کیا وہ میرے پیچھے آئے گا بے وقوف! ان دیکھی چیز کے پیچھے کوئی کیسے جاسکتا ہے۔ دل تو اسی کی طرف جاتا ہے، جو نظر کو اچھا لگے۔"

"چھپی ہوئی چیز کو ہی تو ڈھونڈنے میں مزا آتا ہے۔ سمجھیں۔"

"کارا میم کہہ رہی ہیں باہر پھولوں کی ڈلیوری آئی ہے چیک کرلیں۔ کم تو نہیں۔" کسی ملازمہ کے آکے کہنے پہ میشا نے فون رکھا۔

"اچھا۔ میں رات کو آکے ملتی ہوں۔ ابھی کام ہے۔"

رومان نے ابھی ریسیور رکھا نہیں تھا کہ پرشکو، خانم آگئیں۔

"کس کی اجازت سے تم نے فون استعمال کیا؟"

"میں فون کا تار ٹھیک کررہا تھا۔"

"میں نے خود تمہیں کسی سے بات کرتے سنا ہے۔"

"وہ تو اس لیے کہ مجھے پتا چل سکے فون ٹھیک ہوا یا نہیں۔"

"باتیں بہت بناتے ہو تم۔"

"چائے بھی بہت اچھی بناتا ہوں۔ بناؤں آپ کے لیے؟" اس نے اتنی اپنائیت کے ساتھ کہا کہ وہ فوری طور پر انکار بھی نہ کرسکیں اور وہ مزید رعایت لے گیا۔

"دل کررہا ہے نا آپ کا؟ میں جانتا ہوں اس موسم

میں زبردست سی چائے کا ایک کپ ہی آپ کا موڈ ٹھیک کرسکتا ہے۔ اور وہ بھی الائچی والی۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ مجھے الائچی والی چائے پسند ہے۔ یہ بات تو صرف میشا۔"

وہ چونکیں۔ مگر وہ ان کے اگلے سوالات سے بچنے کے لیے فوراً ہی منظر سے غائب ہوگیا۔

"میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔"

✡ ✡ ✡

میشا کارا کے گھر کے وسیع و عریض ڈرائیو وے میں کھڑے ایک لوڈر سے پھولوں کے ٹوکرے اتروا رہی تھی۔

"یہ والا اوپر، بلکہ یہ دونوں اوپر لے جاؤ۔" ملازموں پہ حکم چلانے کا اپنا ہی سرور تھا۔

مائر فون پہ کسی سے بات کرتے ہوئے اندر سے نکلا۔ میشا کی دھڑکن خود بخود تیز ہوگئی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ رومان کی ساری نصیحتیں بھی گونجنے لگیں۔ اس نے اپنی بے قراری پہ خود کو گھرکا۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ رخ موڑ کے کسی ملازم کو ڈانٹنے لگی۔

"کتنے سست ہو تم۔ ذرا سا کام ہے اور گھنٹہ لگادیا۔ جلدی کرو۔"

اور جس وقت مائر فون کان سے لگائے اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہ اچانک ہی مڑی اور سختی سے اس سے مخاطب ہوئی۔

"اور تم کیا فون پہ گپیں لگا رہے ہو۔ کام کرو کام۔"

مائر چونکا۔ رکا۔ "جی؟"

میشا نے فوراً ہی ایک پھولوں کا ٹوکرا اسے تھمادیا اور رعب سے کہا۔

"یہ لو پکڑو۔ اندر رکھ کے آؤ اور آکے دوسرا بھی لے جاؤ۔"

"آپ نے مجھ سے کہا؟" وہ حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کو تھا۔

"تمہارے علاوہ دوسرا کوئی ملازم مجھے یہاں نظر نہیں آرہا۔"

"ایکسکیوز می۔ میں ملازم نہیں ہوں۔ میں۔"

"تم جو بھی ہو۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

وہ سرسری سا کہہ کر اندر جانے کے لیے پلٹی۔ بڑی مشکل سے چہرے پہ جو بے نیازی سجائی ہوئی تھی۔ دھواں ہوگئی۔ اب وہاں بے تحاشا گھبراہٹ اور خوف نظر آرہا تھا۔ آنکھیں زور سے میچے وہ آہستہ آہستہ ہونٹ بڑبڑاتی جارہی تھی کہ کہنے کو تو کہہ دیا، اب نجانے کیا نتیجہ نکلے اس بکواس کا۔

"سنو۔"

بالآخر مائر نے اپنی حیرت پر قابو پاکے اسے پکارا۔ وہ رکی ضرور مگر مڑنے سے احتراز کیا کہ وہ اس کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت نہ بھانپ لے۔

"مگر مجھے تمہارے بارے میں جاننے میں دلچسپی ضرور ہے۔" "میں مائر ہوں۔ اور تم؟"

جیسے ہی اس نے سامنے آکے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ میشا نے بڑے جتنوں کے ساتھ اپنے چہرے کی خوشی چھپائی اور بے نیازی سی نظر آتے ہوئے سرسری سا ہاتھ ملایا۔

"میشا۔ میشا سیف اللہ۔" اور آگے بڑھ گئی۔

✡ ✡ ✡

"وہ خود میرے پیچھے آیا اور اس نے میرا نام پوچھا۔"

میشا اپنی کامیابی کا سارا حال رومان کو بتاتے ہوئے حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

"میں مائر ہوں۔ اور تم؟"

اس نے مائر کے انداز میں ہاتھ آگے کرکے اپنی آواز بھاری کرتے ہوئے کہا کہ اور کھلکھلا کے ہنس دی۔

"اور یہ سب اس لیے ہوا کہ تم نے اسے اگنور کیا۔ اسے اہمیت نہیں دی۔ میں نے کہا تھا نا۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔"

"تو یعنی اب تم میری باقی سب باتیں بھی مانو گی؟"

"ہاں۔ بولو۔ بولو۔" میشا نے فی الحال تو فیاضی دکھائی۔

"اسے مزید اگنور کرو۔بار بار کرو۔"

"کوئی نہیں جی۔" میشا نے صاف انکار کردیا۔ "بس اتنا کافی ہے۔ ویسے بھی مائر کوئی اگنور کرنے والی چیز ہے بھی نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم اسے جی بھر کے اہمیت دو تاکہ وہ تمہیں اگنور کرسکے۔ اس نے صرف تمہارا نام پوچھا ہے۔ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا نہیں پوچھا جو تم اتنی خوش ہورہی ہو۔"

"اگر میں بار بار اس کے ساتھ ایسے پیش آؤں گی تو وہ برا مان جائے گا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"نہیں۔ وہ چونکے گا۔ اور جب کوئی کسی کو چونکانے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو وہ اسے اپنے بارے میں سوچنے پہ بھی مجبور کردیتا ہے۔وہ تمہارے بارے میں سوچے گا میشا!"

"پکا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہوں۔پکا۔"

"اچھا۔یعنی اب میں اسے پہچاننے سے دوبارہ انکار کردوں؟"

"ارے نہیں بھئی۔ورنہ وہ تمہاری دماغی حالت پہ شک کرے گا کہ شاید تمہیں بھولنے کی بیماری ہے اس سے جب بھی ملو' نارمل انداز میں ملو۔ اس پہ یہ ظاہر مت کرو کہ تم اس کی خاطر وہاں جاتی ہو۔ اس کے آس پاس مت منڈلاؤ۔ وہ بات بھی کرے تو ایسے جواب دو جیسے اس پہ احسان کررہی ہو۔ اس کے پیچھے مت بھاگو۔ دیکھنا! وہ خود ایک دن تمہارے پیچھے آئے گا۔"

"سوچ لو۔ تمہارے کہنے پر ہامی بھر رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو' میرا کباڑا ہوجائے۔"

"نہیں ہونے دوں گا۔ وعدہ کیا ہے تمہارے خواب پورے کرنے کا۔ کرکے رہوں گا۔"

روماں کو یکایک اس پہ ڈھیر سارا پیار آیا۔ وہ ہولے سے اس کا سر تھپتھپا کے بولا۔

"اب گھر بھاگو شاباش۔ دیر ہورہی ہے۔ صبح تمہیں جانا بھی ہوگا مائر کے ہاں۔"

میشا اچھے بچوں کی طرح فوراً ہی گھر کی طرف جانے والے راستے کی جانب مڑگئی اور روماں سمارا کے گھر کی طرف۔ مگر وہاں ایک نئی مصیبت سامنے تھی۔ سمارا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے خونخوار نظروں سے گھورتی اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟ مہر کے لیے ایک آدھ گھنٹہ جانے کی اجازت کیا دی' تم نے سارا دن گھر سے باہر گزارنا شروع کردیا۔ اور روز آدھی آدھی رات تک میں جاگ رہی ہوتی ہوں کہ کب تمہاری شاہی سواری اترے اور میں گھر لاک کروں۔"

"وہ۔دراصل مہر میم نے اتنے کام بتادیے کہ۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جاؤ اپنی مہر میم کے پاس۔ جو تمہیں اتنے کام دے سکتی ہے رات رکنے کی جگہ بھی وہی دے۔"

سمارا نے دروازہ دھڑ سے بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

"مائر پوری طرح میری محبت میں گرفتار ہے۔ میرے علاوہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ آنچل کی رسم والا فنکشن تو ایک فارمیلٹی ہے۔ مجھے تو بڑا مزا آئے گا ان سب لڑکیوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کے' جو وہاں مائر کے خواب سجا کے آئیں گی۔"

زینی امی کے سامنے اترا رہی تھی مگر امی بھی اپنی ناقص عقل کے مطابق اس کی ساری اتراہٹ مٹی میں ملانے کو تیار بیٹھی تھی۔

"میری مانو تو مائر سے کہہ کر یہ فنکشن کینسل کرا دو۔ کیا فائدہ بے چاریوں کی آہ لینے کا۔"

"ہونے دو نا یار۔ مزا آئے گا۔"

"ایسا نہ ہو لوگ تمہاری حالت سے مزے لینے لگیں۔ تمہارا مذاق بن جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مائر تمہاری محبت میں گرفتار ہے' کارا آنٹی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ فنکشن پر کوئی اور انہیں تم سے زیادہ پسند آجائے اور وہ مائر کے نام کا آنچل اس کے سر پہ ڈال دیں۔ مت بھولو اس رسم میں یہ اختیار صرف ماں کے پاس ہوتا ہے اور کارا آنٹی کی ماما سے ذرا نہیں بنتی۔ وہ اس بات کا بدلہ تم سے لے سکتی ہیں۔"

امی کی باتوں نے اسے وسوسوں میں ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

روماں کو رات گزارنے کے لیے اس سے قریبی اور اس سے محفوظ جگہ کوئی اور نظر نہیں آئی۔

میشا کے گھر کا سال خوردہ گیٹ پھلانگنا اس کے لیے کون سی نئی بات تھی۔ کچھ دن پہلے اس رات اسی گیٹ سے کود کے تو وہ آیا تھا اس سے پہلی بار ملنے۔

بادام کے درخت کے نیچے وہ لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ہوائیں جسم کے آرپار ہوکر کپکپی طاری کررہی تھیں۔ مگر سارے دن کی تکان بار بار آنکھیں موندنے پر مجبور کررہی تھی۔

میشا نے کھڑکی سے دیکھا اگرچہ لان میں نیم تاریکی کا عالم تھا مگر چاند کی ٹھنڈی روشنی سیدھی روماں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"بے چارہ پرا۔ پرستان کی گاڑی چھوٹ گئی ہوگی۔"

اس نے تاسف سے سوچا۔ روماں نے کچھ ایسی ہی کہانی سنائی تھی اسے۔

اس نے شال اٹھائی اور کمرے سے نکلی۔ سوئے ہوئے روماں پہ شال ڈالتے ہوئے وہ پل بھر کے لیے ٹھٹکی۔

"سوتا ہوا کچھ معصوم لگتا ہے۔"

وہ ہلکا سا مسکرائی اور شال اوڑھانے کے بعد پلٹی تو جھٹکا کھا کے رک گئی۔ اس کا ہاتھ سوئے ہوئے روماں نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں مگر ہونٹوں کی شرارتی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ وہ جاگ رہا ہے۔

"جھوٹے۔ڈرامے باز!" میشا مسکرا کے بولی۔
رومان نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بند آنکھوں کے ساتھ نیم خوابیدہ آواز میں بولا۔
"شکریہ۔اے مہربان۔ نرم دل ملکہ....."

☼ ☼ ☼

زینی مکمل طور پر امی کی رات والی باتوں کے زیر اثر تھی۔ اسے کارا کا روکھا پھیکا اور لیا دیا انداز بھی یاد آرہا تھا۔
"امی صحیح کہتی ہے۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ عین موقع پر دغا دے گئیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مائر تو اتنا زیادہ ماماز بوائے ہے کہ..... نہیں، مجھے خود کچھ کرنا ہوگا۔"
اس نے تہیہ کر لیا تھا، اس لیے چھوٹتے ہی مائر سے فرمائش کر دی۔
"کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟"
"تمہیں کوئی شک ہے؟"
"یقین دلانے میں کوئی حرج ہے؟"
"بالکل نہیں۔ بولو۔ کیسے یقین دلاؤں؟"
"میں چاہتی ہوں۔ تم پرسوں جو آنچل کی رسم والا فنکشن ہو رہا ہے۔ اسے کینسل کرا دو۔"
"کیا؟" مائر اس انوکھی فرمائش پر بھونچکا رہ گیا۔
"ہاں۔ اپنی مام سے کہو کہ تم اس رسم کے خلاف ہو اور اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔"
"میں واقعی پسند نہیں کرتا اور شروع میں ہی مام سے کہہ بھی چکا ہوں مگر وہ نہیں مانی تھیں نہ اب مانیں گی۔"
"تم منواؤ۔ کسی بھی طرح۔" وہ زور دے کے بولی۔
"مگر کیوں زینی؟"
"کیونکہ اس سے سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب تم یہ طے کر چکے ہو کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہے اور یہ بات تم اپنی مام کو بھی بتا چکے ہو تو ان سب کا مقصد کیا ہے۔"
"مام کا کہنا ہے، ہمارے ہاں بہو اسی طرح پسند کی جاتی ہے۔ میں ایک ہی بیٹا ہوں ان کا۔ وہ میرے حوالے سے سب رسمیں پوری کرنا چاہتی ہیں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ مگر یہ بات ساری فیملی کے سامنے اسی انداز میں ظاہر کی جائے گی۔ یہ مام کا کہنا ہے۔"
"مام یہ چاہتی ہیں۔ مام وہ چاہتی ہیں۔ مام کا یہ کہنا ہے۔ مام کا وہ کہنا ہے۔ تم خود بھی کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟ ہر بات اپنی مام سے پوچھ کے کرنی ہے تو مجھ سے محبت بھی اپنی مام سے پوچھ کے کرتے۔"
وہ حسب مزاج تلخ ہو گئی۔ مگر مائر کی نفیس طبیعت کو اس کا چلانا برا لگا۔ وہ ناگواری جتا گیا۔
"زینی! مجھے بالکل پسند نہیں کہ کوئی مجھ سے اس طریقے سے بات کرے۔"
"اوہ رئیلی۔ تمہیں خود بھی کچھ پسند یا ناپسند ہے؟ مجھے تو لگا ہر معاملے میں مام کی ہی پسند ناپسند چلتی ہوگی۔"
کارا نے مائر کو بالکل ایک مختلف ماحول میں پالا تھا۔ ایسی بچکانہ بحث۔ طنز۔ طعنے۔ یہ سب اس کے مزاج اور فطرت سے میل نہیں کھاتا تھا۔
"جب تم ڈھنگ سے بات کرنے کے موڈ میں ہوگی تب ملتے ہیں۔"
زینی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر وہ چلا گیا اور وہ تلملاتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

رومان نے پرشکوہ خانم کو الائچی والی چائے پلا پلا کے اور اپنی لچھے دار باتیں سنا سنا کے شیشے میں اتار لیا تھا۔
"چائے اچھی بناتے ہو تم۔ بالکل میشا کی طرح۔ وہی ذائقہ، وہی خوشبو۔"
"اور وہی ریسیپی" وہ بے ساختہ بولا مگر اس کی روانی میں کہی بات انہیں چونکا گئی۔
"تمہیں کیسے پتا اس کی ریسیپی کا؟"
"ظاہر ہے۔ ذائقہ اور خوشبو ایک جیسی ہے تو طریقہ بھی وہی ہوگا۔ چلیں میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ آپ کے آرام کا وقت

ہو گیا ہے۔" اس نے وہیل چیئر آگے دھکیلی۔
"تمہیں تو دو دن میں ہی میری ساری روٹین یاد ہو گئی۔"
وہ شفقت سے مسکرا دیں۔

☼ ☼ ☼

مائر کی عادت تھی، جب اپ سیٹ ہوتا، خود کو کمرے میں بند کر لیتا۔ زینی نے اس بدمزگی کے بعد دو تین بار اس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ فون بھی بند کر کے بیٹھا تھا۔ وہ غصے میں بھری اس کے گھر پہنچ گئی۔ غصہ تو آنا ہی تھا۔ سب کچھ اس کی توقعات کے خلاف جو ہو رہا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا اس کی ناراضی دیکھ کے مائر کے ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور اسے مانتے ہی بنے گی۔
"کارا آنٹی! مائر کہاں ہے؟"
وہ چھوٹتے ہی بولی اور کارا کو اس کا مالکانہ طرز تخاطب ذرا نہ بھایا۔ ماں بیٹا ایک جیسے مزاج کے مالک تھے۔
"تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ تمہیں مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ مجھے تمہاری کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں۔ تم غالباً روز اسی لیے یہاں آرہی ہو۔"
کارا کے تنبیہی لہجے نے زینی کو سنبھلنے پہ مجبور کیا۔
"میں آپ کے پاس یہی کہنے آنے والی تھی آنٹی! مگر دراصل مائر مجھے بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔"
"اسے بتا کے جانے کی عادت نہیں ہے اور میں نے بھی کبھی اس سے زیادہ سوال نہیں کیے۔ اسے پسند نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ کہاں جاتا ہے کہاں نہیں۔ یہ جاننا تمہارا مسئلہ نہیں ہے، تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"
کارا نے درشت لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔
زینی کا تو وہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ میشا کراکری سیٹ کرواتے ہوئے بار بار کن اکھیوں سے یہاں دیکھتے ہوئے زینی کی سبکی کے مزے لے رہی تھی۔ کارا کے منظر سے غائب ہوتے ہی زینی کے پاس آئی۔
"کچھ زیادہ ہی ہو گئی تمہارے ساتھ۔ چہ۔ چہ کارا آنٹی کا غصہ بھی نا بس۔ شربت پیو گی؟ شاید اندر لگی آگ کچھ ٹھنڈی ہو جائے۔"
"تم میرے زخموں پہ نمک چھڑکنا بند کرو۔" وہ دھاڑی۔
"نہیں چاہیے مجھے تمہارا شربت۔"
"جو میں بتانے والی تھی۔ اس کے بعد تو ضرور چاہیے ہوگا۔ شربت..... مگر خیر۔ اب میں نہ بتانے والی ہوں نہ تم سننے والی۔" اس نے شوشا چھوڑا اور پلٹی۔
"رکو میشا! بتاؤ کیا کہنا تھا تم نے۔" زینی نے بے تابی سے اسے پکارا۔
"نہ بابا! میں نہیں بتاتی پھر تم کہو گی میں تمہارے زخموں پہ نمک چھڑکتی ہوں۔"
"نہیں کہتی۔ اب نخرے مت دکھاؤ۔ بتاؤ بھی۔"
"کارا آنٹی کی رائے تمہارے بارے میں بہت بری ہے۔"
"کتنی بری؟"

"اتنی ہی بری جتنی میری ہے۔" یشا نے صاف گوئی سے بتایا۔

"تمہارا تو مجھے پتا ہے اور جتنی بری میں تمہیں لگتی ہوں گی تم مجھے اس سے دس گنا زیادہ بری لگتی ہو۔" زینی نے دانت کچکچا کے کہا۔

"چلو، ہماری ایک دوسرے سے نفرت تو بنتی ہے مگر کارا آنٹی کو تم اتنی زہر کیوں لگتی ہو کہ وہ ہر وقت ماڑ کو تمہارے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ میں نے خود سنا تھا انہیں تمہاری برائیاں کرتے ہوئے اور وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ زینی میں عزت نفس نام کی کوئی چیز نہیں ہے اُسے خود کو پلیٹ میں رکھ کے تمہارے سامنے پیش کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اس کے لیے وہ کچھ بھی برداشت کر سکتی ہے۔ چاہے میں اس کی کتنی بھی انسلٹ کروں یا چاہے تم اسے کتنا بھی نظر انداز کر دو، وہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کرے گی۔"

"اوہ... تو اسی لیے ماڑ مجھے نخرے دکھا رہا تھا اور کارا آنٹی میرے ساتھ ایسے... ہوں... مگر یہ ان کی بھول ہے کہ میں چپ چاپ سب برداشت کر لوں گی... یا میرے اندر عزت نفس نہیں ہے۔ اب ان کو پتا چلے گا، زینی ہے کیا؟"

یشا کھل کے مسکرائی۔

زینی کو جوش میں لانے کا اس کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں... میں نے نکالا تھا اسے گھر سے۔"

سمارا نے مہر کے استفسار پہ بتایا۔

"بہت سر چڑھتا جا رہا تھا۔ تمہیں اسے اپنے گھر پہ رکنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ سردی میں باہر پڑا رہتا تو دماغ ٹھکانے آجاتا۔ تمہارے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات کچھ زیادہ ہی پیدا ہو رہے ہیں۔"

"تم تو بے وقوف ہو سمارا! تمہیں رومان کی وہ خوبیاں نظر ہی نہیں آ رہیں جو میں نے دیکھی ہیں۔"

مہر کی بات پہ سمارا نے تمسخرانہ ہنکارا بھرا۔

"ہونہہ... کون سی خوبیاں؟ ایک نمبر کا بہانے باز اور جھوٹا... پکی کام چور لڑکا ہے۔"

"مگر پوری دنیا میں بالکل اکیلا ہے... نہ کوئی آگے، نہ کوئی پیچھے، دل کا سادہ ہے اور بہت ہی خیال رکھنے والا۔ یعنی پورا پورا ایک ہزبینڈ میٹریل۔"

"ہزبینڈ میٹریل؟" سمارا چونکی۔

"ہاں، مجھے دیکھو، میری شادی سیف اللہ سے اس لیے زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کہ اس پہ اس کی ماں کا کنٹرول تھا اور اوپر سے سیف اللہ کو اپنے خاندان اور حیثیت کا گھمنڈ بھی بڑا تھا۔ جبکہ رومان جیسے شوہر ہمیشہ مٹھی میں رہتے ہیں۔ خاص طور پہ اگر ان کو گھر داماد بنا کے رکھا جائے۔ خود سوچو، وہ اکڑ اگر دکھائے بھی تو کس اوقات پہ... اسے تو ساری عمر دب کے رہنا ہے۔"

"ہوں... کہتی تو تم ٹھیک ہو۔"

مہر کی باتیں سمارا کو سوچنے پہ مجبور کر گئیں۔

"بس یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے میں رومان کو توجہ دے رہی ہیں۔ تم تو جانتی ہو۔ زینی خوب صورت ہے۔ ذہین ہے، اس کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ وہ سیف اللہ سے زیادہ تیز شوہر کو بھی ہینڈل کر سکتی ہے۔ مگر امی کے لیے مجھے ایسا لڑکا چاہیے جو ساری عمر بے دام کا غلام بن کے اس گھر میں رہے۔"

مہر اپنی پلاننگ بتا کے داد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، جبکہ سمارا اپنی ادھیڑ بن میں گم تھی۔

"بے دام کا غلام... اس نظر سے تو میں نے کبھی اسے سوچا ہی نہیں۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہجر کی شب ہے اور اُجالا ہے
کیا تصوّر بھی لُٹنے والا ہے

غم تو ہے عین زندگی لیکن
غم گساروں نے مار ڈالا ہے

عشق مجبور و نامراد سہی!
پھر بھی ظالم کا بول بالا ہے

موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے

کتنے اشکوں کو، کتنی آہوں کو
ایک تبسّم میں اس نے ڈھالا ہے

دم اندھیرے میں گھٹ رہا ہے خمار
اور چاروں طرف اُجالا ہے

خمار بارہ بنکوی

اُداس لڑکیاں
اجل دریدہ، سحر زدہ، ستم نصیب
آئینے کے آس پاس لڑکیاں
اُداس لڑکیاں
تمام رات آفتاب ان کے انتظار میں رُکا رہا
کہ سو سکیں
تمام دن خزاں کی دُھوپ ان کے گھر سے دُور
خیمہ زن رہی
کہ تیز روشنی سے مضطرب نہ ہوں
یہ زندگی کی سل پہ پلس پلکیں تو زنگ آئے گا
عدم نصیب عورتیں عدم کا راستہ بتائیں گی
یہ آئینے کے اس طرف گئیں تو آئینے کا ماجرا سنائیں گی
اُداس عورتیں سفر کے راز لے کے آئیں گی
سفر نصیب عورتیں
اجل نشاں عورتیں
عدم نژاد عورتیں

انور خالد

چاند کی فصیلیں تھیں اور مکان شیشے کا
میں نے خواب میں دیکھا سائبان شیشے کا

کیسے میں بچا لیتی خود کو تیز سورج سے
موم سے بنی تھی میں اور مکان شیشے کا

غیر کے سیلے سج کے مجھ سے رائے لیتے ہو
دل لگی زمانے سے، امتحان شیشے کا

اس قدر اُڑی مٹی، نقش مٹ گئے سارے
ریت میں چھپا دیکھو کاروان شیشے کا

صندلی مہک اٹھی میرے جسم و جاں سے بھی
بارشوں سے نکھرا ہے یہ جہان شیشے کا

میری ذات پہ ناصح انگلیاں اٹھاتا ہے
وہ کہاں سے بن بیٹھا ترجمان شیشے کا

میری کشتیٔ دل تو ڈوبنا ہی تھی عینی
رنگ و سنگ کی لہریں اور بادبان شیشے کا

عینی زا سید

رودادِ محبت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

جب جام دیا تھا ساقی نے، جب دور چلا تھا محفل میں
اک ہوش کی ساعت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیدادِ مشیئت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامن دل شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغر، بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

ساغر صدیقی

ساٸرہ غلام نبی

ان کہی کے ہیں مسئلے

اصول پسند

بیگم سلیم بڑی اصول پسند خاتون تھیں۔ انہوں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ کھانے کی میز پر جو بھی دیر سے آئے گا، وہ کھانے کے دوران ایک لفظ بھی بولنے کا مجاز نہ ہوگا۔ ان کے بڑے بیٹے نسیم کی عادت تھی کہ عموماً لیٹ ہو ہی جاتا۔ ایک دن کھانا چن دیا گیا اور نسیم نہ پہنچا۔ کھانا شروع ہو گیا اور وہ غائب۔ جب وہ لوگ تھوڑا بہت کھا چکے تو حضرت پہنچے۔ آتے ہی اس نے کہا۔

"امی جان...!"

لیکن بیگم سلیم نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس پر بھی نسیم نے ہمت کر کے کہا۔ "وہ بات یہ ہے امی جان!"

"ایک لفظ اور نہیں۔" بیگم سلیم نے جواب دیا اور نسیم خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ جب میز پر سے برتن اٹھائے جا چکے تو انہوں نے کہا۔

"ہاں بولو! کیا بات تھی؟"

"امی جی! آپ کی نئی ساڑھی کے ساتھ وہ آپ کا چیتا کتا باہر کھیل رہا تھا۔"

لبنیٰ اسلم۔ ہجرت کالونی

جواب

جامع مسجد فتح آباد کی مجلس انتظامیہ کے ارکان بڑے تنگ دل اور تنگ نظر معززین تھے۔ جب علاقہ کے مشہور غنڈے جیدے خان نے اپنے کردار میں تبدیلی پیدا کی تو اسے دین کی خدمت کا شوق چرایا۔ اس نے امام مسجد کے پاس جا کر مجلس انتظامیہ میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ امام صاحب نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ مجلس کے دوسرے ارکان سے بات کر کے بتائیں گے۔

اگلی میٹنگ میں انہوں نے جیدے خان کی تمنا کا اظہار کیا تو سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور متفقہ طور پر کہا۔

"خدا کے لیے! اسے مسجد میں گھسنے نہ دینا۔ ورنہ وہ خانۂ خدا میں بھی خرابیاں کرے گا۔"

اگلے روز پیش امام صاحب نے جیدے خان سے کہا۔ "میاں! میں نے تمہارا کیس مجلس کے سامنے پیش کر دیا تھا لیکن ہر ایک نے کہا کہ یہ خدا کا معاملہ ہے اور اسی سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ تم خدا سے پوچھ لو، اگر وہ اجازت نامہ جاری کر دیں تو ٹھیک ہے۔"

جیدے خان مایوس ہو گیا۔

ہفتہ عشرے بعد پیش امام صاحب کی سر راہ جیدے خان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

"کہو میاں! تم نے اجازت نامہ حاصل کیا یا نہیں؟"

جیدے خان نے آہ بھر کر کہا۔ "پوچھا تھا مولوی صاحب! لیکن اللہ میاں کہنے لگے۔ ہوش کرو جیدے خان! جب سے یہ مسجد بنی ہے، انہوں نے مجھے اس میں گھسنے نہیں دیا، تمہیں کہاں اجازت دیں گے۔"

فریال صلاح الدین۔ میٹروول سائٹ

آفر

پاگل خانے کے بڑے گیٹ پر ایک پاگل پانی کی بالٹی اور برش لے کر گیٹ پر پینٹ کر رہا تھا۔ ایک نوجوان ادھر سے گزرا اور پاگل کی یہ حرکت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پاگل نے برش روک کر کہا۔

"ہنستے کیوں ہو میاں! دشمنوں نے مجھے پاگل بنا کر یہاں ڈال دیا ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ پانی ہے وارنش نہیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی پڑتا ہے۔ سو میں یہ کام کر رہا ہوں۔ دراصل جب میں یہاں سے رہا ہوں گا تو سامنے پہاڑی پر اس درخت کے نیچے سے خزانہ نکالوں گا، جس کا سوائے میرے کسی کو علم نہیں ہے، پھر ساری زندگی مزے سے گزاروں گا اور سکھ کی بنسی بجاؤں گا۔"

نوجوان اس کی یہ بات سن کر چلا گیا۔ اگلے دن جب وہ دوبارہ پاگل خانے کے پاس سے گزرا تو وہ پاگل پھر پانی سے دروازہ پینٹ کر رہا تھا۔ نوجوان نے رک کر کہا۔

"کہو بھائی! پھر وقت گزار رہے ہو؟"

"اور کیا۔" پاگل نے سر اٹھا کر کہا۔ "وقت جو ٹھہرا۔"

نوجوان نے آہستہ سے کہا۔ "کل آپ نے کون سا درخت بتایا تھا؟"

پاگل ہنس کر بولا۔ "شاباش! جلدی سے تم بھی پانی کی بالٹی اور برش لے کر میرے ساتھ کام میں شریک ہو جاؤ۔"

مدیحہ احمد۔ گلشن اقبال

اشتہار

ایک اخبار میں اشتہار دیا گیا۔

"ایک خوش شکل کروڑپتی اعلا تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے رشتہ درکار ہے۔ ذات پات اور جہیز کی کوئی پابندی نہیں، البتہ لڑکی کا فلم کی ہیروئن سے مشابہت رکھنا ضروری ہے۔"

اشتہار میں جس فلم کی ہیروئن کا حوالہ دیا گیا تھا۔ وہ فلم ان دنوں مقامی سینما ہال میں پہلے ہفتہ میں ہی دم توڑ رہی تھی مگر اشتہار شائع ہونے کے بعد وہ فلم شہر میں پورے بارہ ہفتے چلی۔

رخسار ظفر۔ لاہور

متفق

میاں بیوی میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہونے پر گرما گرم مباحثے کا آغاز ہو گیا۔ جب بات ختم ہونے کے بجائے بحث کے نئے نئے پہلوؤں پر بہت زیادہ بگڑتی نظر آنے لگی تو جھگڑا ختم کرنے کے لیے خاوند نے کہا۔

"چلو ڈارلنگ! مٹی ڈالو اس بات پر۔" خاوند کے لہجہ سے مصالحت کا اظہار ہوتا تھا۔ "ویسے پوری بات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

"مگر تمہارے اتفاق رائے کرنے کا کیا فائدہ؟" بیوی نے جوش میں غصہ سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"جبکہ میں نے اپنا وہ خیال ہی بدل دیا ہے۔"

کومل عدنان۔ گلستان جوہر

کارکردگی

پولیس نے جعلی نوٹ بنانے والے شخص کو پکڑا تو دوسرے شہر میں موجود ان کے سربراہ نے حکم دیا کہ جعلی نوٹ انہیں بھجوا دیے جائیں۔ دو دن بعد سربراہ نے ماتحت عملے کو فون کر کے پوچھا۔

"جعلی نوٹ اب تک نہیں ملے۔"

"جناب! وہ تو ہم نے منی آرڈر کے ذریعے بھجوا دیے تھے۔" جواب دیا گیا۔

نمرہ رزاق۔ ڈیفنس

خیال کی تبدیلی

بیوی نے شوہر سے شکایتاً کہا۔ "دیکھیے! میں نے کس قدر پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو یقیناً یہی سمجھے گا کہ میں اس گھر کی باورچن ہوں۔"

شوہر نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں پیاری! جب مہمان تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائے گا تو فوراً اپنے خیال کو تبدیل کرے گا۔"

فاطمہ احسن۔ ڈیفنس

انکشاف

"مجھ پر چوہے کی آواز کا راز ظاہر ہو گیا ہے۔" پسینے میں شرابور خاتون نے کار مکینک سے کہا، جو خاتون کی شکایت پر ڈھائی گھنٹے سے کار کے انجن میں چوہا تلاش کر رہا تھا۔

"دراصل چوں چوں کی آواز میرے جوتوں سے نکل رہی تھی۔" خاتون نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ کاشف۔ باغبان پورہ

شکر گزار

ایک صحافی خاتون مہنگائی پر دل ہلا دینے والا مضمون لکھنا چاہ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ مضمون لکھا مگر بات نہیں بنی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مضمون لکھنے سے پہلے غربت میں پسے ہوئے مفلوک الحال لوگوں سے گفت و شنید کریں تو مضمون تاثر انگیز جائے گا۔

وہ مشاہدہ کی غرض سے غریبوں کی بستی میں پہنچیں۔ وہاں ایک بھکاری مل گیا۔ اس سے پوچھا۔ "بابا جی! آٹا مہنگا ہو گیا ہے، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اچھا...!" بھکاری حیرانی سے اس طرح اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "آٹا مہنگا ہو گیا اور مجھے پتا ہی نہیں۔ بڑی مہربانی بی بی! جی کہ آپ نے مجھے بتا دیا۔ دکاندار تو مجھ سے اب تک پرانے بھاؤ پر ہی آٹا خرید رہا ہے۔"

سمیرا علی۔ لاہور

اصل رشتہ

ایک غریب خاندان کا لڑکا پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بن گیا تو اس کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ وہ ہر وقت امیروں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار کیے رکھتا اور اپنی اوقات بالکل ہی بھول گیا۔ غریب لوگوں سے ملنا جلنا تو در کنار، ان سے بات چیت کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کا باپ دفتر میں اس سے ملنے گیا تو اس نے اپنے ساتھی سے باپ کا تعارف کچھ اس طرح سے کروایا۔ "یہ میرے بچپن کے دوست کا باپ ہے اور کام کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔"

باپ نے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو حیران رہ گیا اور اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بیٹے کو تین، چار تھپڑ رسید کر دیے اور اس کے ساتھی سے کہنے لگا۔ "میں اس کے دوست کا باپ نہیں بلکہ میں اس کی ماں کا دوست ہوں۔"

غزالہ شہباز۔ کراچی

حکمت عملی

اختر صاحب کو اپنے پڑوسی سے اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے کی عادت تھی۔ ایک روز وہ پڑوسی کے پاس پہنچے اور بولے۔ "کیا آج آپ اپنی گاڑی میں کہیں جائیں گے؟"

پڑوسی نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں! گاڑی آج میرے استعمال میں رہے گی۔ آج مجھے کئی جگہوں پر جانا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا، مجھے اصل میں آپ کی موٹر سائیکل کی ضرورت تھی۔" اختر صاحب نے اطمینان سے کہا۔

غزل۔ کوئٹہ

سراپا احتجاج

ایک بوئنگ طیارے نے سمندر پر پرواز کے دوران ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کیپٹن نے اعلان کیا۔ "خواتین و حضرات، توجہ فرمائیے! طیارے کا ایک انجن خراب ہو گیا ہے، تاہم باقی تین انجن

ہمیں بہ حفاظت ہماری منزل پر اتار دیں گے۔ البتہ آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔"

ایک گھنٹے بعد کیپٹن کی پھر آواز آئی۔ "توجہ فرمائیے! ہمیں افسوس ہے کہ طیارے کا دوسرا انجن بھی خراب ہو گیا ہے، تاہم باقی دو انجنوں پر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں، البتہ ہمیں دو گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر اور گزری تھی کہ کیپٹن نے پھر اعلان کیا۔ "خواتین و حضرات! ہم انتہائی دکھ کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جہاز کا تیسرا انجن بھی خراب ہو گیا ہے، لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم بہ حفاظت اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے، لیکن اب ہمیں تین گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔"

بار بار کے اعلان سے بھنایا ہوا ایک مسافر بڑے غصے سے بولا۔ "کچھ تو خدا کا خوف کرو، شرم کرو..... اگر چوتھا انجن بھی خراب ہو گیا تو ہم کیا ساری رات پرواز کرتے رہیں گے؟"

ثمین طارق۔ لاہور

میڈل

ایک گلوکار ہر وقت اپنے ساتھ دو میڈل لیے گھوما کرتے تھے۔ ایک میڈل چھوٹا تھا اور ایک بڑا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست نے خیال ظاہر کیا۔ "شاید آپ کو چھوٹا میڈل کسی ہلکے پھلکے گانے پر..... اور بڑا میڈل کوئی کلاسیکل مقابلہ جیتنے پر ملا ہو گا؟"

"نہیں! یہ بات نہیں ہے۔" گلوکار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک مرتبہ گلوکاری کا مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ چھوٹا میڈل مجھے اس میں بہترین گانا گانے پر ملا تھا۔"

"اور بڑا میڈل؟" دوست نے پوچھا۔

"بڑا میڈل مجھے وہی گانا بند کرنے پر ملا تھا۔" گلوکار نے بتایا۔

ثمرہ یار رشید۔ بلدیہ ٹاؤن

نجات

فقیر نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک لمبے تڑنگے کرخت صورت سے صاحب باہر نکلے۔ فقیر نے عاجزی سے کہا۔

"حضور! کیا آپ ایک پریشان حال اور دکھی آدمی کو اس کی پریشانیوں سے نجات دلانا پسند کریں گے۔"

"ضرور..... ضرور۔" ان صاحب نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم پستول کی گولی کھا کر نجات حاصل کرنا پسند کرو گے یا چاقو کے ذریعے؟"

شہلا اظہر۔ وہاڑی

اندیشہ

ایک صاحب جھومتے جھامتے نائٹ کلب سے نکلنے لگے تو دربان ان کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے لپکا، مگر کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔

کلب کے منیجر نے باہر آ کر اسے ڈانٹا۔ "ذرا احتیاط سے چلا کرو۔ تمہارے اس طرح گرنے سے کوئی سمجھے گا کہ تم دربان نہیں، کلب کے ممبر ہو۔"

زیب نجم۔ لندن

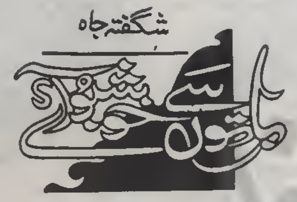
مرغا

باپ (حیرانی سے) "عرفان! تم مرغا کیوں بنے ہوئے ہو بیٹا؟"

"ابا جان! آپ ہی نے تو کہا تھا۔ جو کام اسکول میں کرایا جائے۔ اسے گھر آ کر دہرایا کرو۔"

الوینہ۔ راولپنڈی





رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔"

(بخاری - 78- 15)

اللہ تعالیٰ کی قربت،

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا۔

"جب اللہ کے تیر مرض، موت، حادثہ و غم کی صورت میں چاروں سو چل رہے ہوں تو ہم کیسے بچیں؟"

آپ علیہ السلام نے فرمایا۔

"تیر انداز کے پہلو میں آ جاؤ۔"

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے۔ اگرچہ تیر کمان سے گزرتا ہے لیکن دانش مند کو کمان کے پیچھے ایک کمان والا بھی نظر آتا ہے۔

چنگیز و ہلاکو خان وغیرہ محض کمان تھے جن سے لاکھوں تیر نکل کر دنیائے انسانی تک پہنچے۔ کمان والا کوئی اور تھا اور یہ تیر اسی کے چلائے ہوئے تھے۔

غلام کی عقل،

لقمان حکیم سے کون واقف نہیں۔ وہ بنی اسرائیل کے ایک شخص کے غلام تھے۔ اس شخص نے انہیں تین مثقال میں خریدا تھا۔ وہ اپنے آقا کی خدمت میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ ان کا آقا چوسر کھیلتا تھا۔ وہ اس کھیل میں شرطیں بھی لگایا کرتا تھا۔

اس کے گھر کے دروازے کے قریب ایک نہر بہتی تھی۔ اس نے ایک دن اس شرط پر چوسر کھیلی کہ جو ہار جائے گا نہر کا سارا پانی اسے پینا پڑے گا۔ ہارنے والا ایسا نہ کر سکا تو اسے فدیہ ادا کرنا پڑے گا۔

لقمان کا آقا یہ شرط ہار گیا۔

جیتنے والے نے شرط پوری کرنے کے لیے کہا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شرط کے مطابق اگر وہ پانی نہ پی سکے تو اسے فدیہ ادا کرنا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"مجھے فدیہ میں کیا ادا کرنا ہو گا؟"

جیتنے والے نے کہا۔ "میں تمہاری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا یا تمہارے پاس جو کچھ ہے، وہ میرے حوالے کر دو۔"

اس پر لقمان کے آقا نے کہا۔ "مجھے آج کے دن کی مہلت دے دو۔"

جیتنے والے نے اس کی بات مان لی اور مہلت دے دی۔

لقمان باہر گئے ہوئے تھے۔ جب وہ لکڑیوں کا گٹھا لیے گھر میں داخل ہوئے تو اپنے آقا کو غمگین حالت میں دیکھ کر پہلے تو انہوں نے سلام کیا پھر لکڑیوں کا گٹھا ایک طرف رکھ کر آقا کے پاس چلے گئے۔ آقا کی عادت تھی کہ وہ جب بھی لقمان کو دیکھتا تو ان سے دل لگی کیا کرتا تھا، وہ ان سے حکمت کی باتیں سن کر بہت حیران ہوتا تھا۔ لقمان حکیم آقا کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگے۔

"آقا! کیا بات ہے، میں آپ کو اداس اور غم زدہ دیکھ رہا ہوں؟"

آقا نے ان کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ بس خاموش بیٹھا رہا۔ جواب نہ پا کر انہوں نے پھر پوچھا۔ لیکن آقا نے اس بار بھی جواب نہ دیا۔ لقمان نے تیسری بار اور پھر چوتھی بار پوچھا تو آخر اس نے ساری بات بتا دی۔ پوری بات سن کر وہ مسکرائے اور فرمایا۔

"آقا! غم نہ کیجیے۔ میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔"

"کیاحل ہے تمہارے پاس؟" آقا نے چونک کر پوچھا۔

اس پر لقمان نے فرمایا۔

"جب وہ آپ کے پاس آکر نہر کا پانی پینے کے لیے کہے تو آپ اس سے پوچھیے گا'دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا نہر کی لمبائی کا؟ اس پر وہ آپ سے یقیناً یہ کہے گا کہ دونوں کناروں کے درمیان کا۔ تب آپ اس سے کہیں' میں پینے کے لیے تیار ہوں لیکن تم لمبائی میں پانی کو بہنے سے اس وقت تک روکے رکھو جب تک کہ میں دونوں کناروں کے درمیان کا پانی نہ پی لوں آقا یہ کام اس کی طاقت سے باہر ہوگا۔"

آقا لقمان حکیم کی بات سن کر بہت خوش ہوا۔

صبح کے وقت جیتنے والا شخص آیا اور کہنے لگا۔

"میری شرط پوری کرو۔"

لقمان کے آقا نے کہا"یہ بتاؤ دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا لمبائی کا؟"

اس نے کہا۔"دونوں کناروں کے درمیان کا۔"

آقا نے کہا۔"ٹھیک ہے تم لمبائی میں پانی کو بہنے سے روکو' میں پانی پی لیتا ہوں۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔" اس نے حیرت سے کہا اور یوں لقمان کے آقا کی جان چھوٹ گئی۔ وہ اپنے غلام سے بہت خوش ہوا چنانچہ اس سے انہیں آزاد کر دیا۔

تمثیلہ اصغر۔ گجرات

فطری دانش،

مسلمانوں نے مدائن فتح کیا تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے آتش کدہ نوبہار سر کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا۔ روایت تھی کہ یہ آتش کدہ زرتشت کے زمانے سے مسلسل فروزاں چلا آرہا ہے۔ فوجی دستے نے آتش کدے کے مرکزی دروازے پر زرتشت کا یہ قول دیکھا۔

"بادشاہ کے دربار میں اسی شخص کو حاضری دینا چاہیے جس کے پاس علم، حوصلہ اور دولت ہو۔"

فوجی دستہ میں ایک بدو بھی تھا۔ اس نے زرتشت کے قول کے نیچے کوئلے سے یہ لکھ دیا۔

"جس کے پاس ان تینوں میں سے ایک وصف بھی ہو' اسے بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

غلام،

بادشاہ نے فقیر سے کہا۔

"مجھ سے کچھ مانگ۔"

"فقیر نے جواب دیا۔" میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟"

بادشاہ نے کہا۔"کیا مطلب؟"

فقیر نے کہا۔" میرے دو غلام ہیں۔ لالچ اور امید۔ تو ان کا غلام ہے۔"

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

بیمار دلوں کا علاج،

عبداللہ انطاکیؒ نے فرمایا ہے۔" پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دل کی تمام بیماریوں کے لیے بمنزلہ دوا کے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

1۔ نیک لوگوں کی ہم نشینی۔
2۔ قرآن کا پڑھنا۔
3۔ پیٹ کا خالی رکھنا۔
4۔ نماز تہجد کی ادائیگی۔
5۔ نالہ سحر گاہی۔

نماز میں انہماک،

حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے بچپن میں ایک عابدہ عورت کو دیکھا کہ بچھو نے اس کو نماز میں چالیس جگہ کاٹا اور اس میں کچھ بھی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

"اے اماں جان! تو نے اس بچھو کو کیوں نہیں ہٹایا؟"

اس نے جواب دیا۔

"لڑکے تو ابھی بچہ ہے' یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کام میں اپنا کام کرتی۔"

مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

سنہرے موتی،

- چیزوں کی محبت دلوں میں مستقل بس جائے تو اندھی دیواروں جیسی ہو جاتی ہے۔ باقی عمر ان سے رہائی نہیں ملتی۔
- ہم اکثر اتنے اچھے نہیں ہوتے جتنا وہ محبت ہمیں اچھا کر دیتی ہے جو ہمارے دلوں میں اپنے پیاروں کے لیے ہوتی ہے۔
- محبت چہروں سے نہیں' دلوں سے اور روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے روپ بدل سکتے ہیں مگر روح روپ نہیں بدلتی۔
- غلط فہمی اگر دل میں زیادہ دیر رہے تو بدگمانی کو جنم دیتی ہے اور بدگمانی فاصلوں کا باعث بنتی ہے۔
- ایمان یہ نہیں کہ اللہ دیتا ہے بلکہ ایمان یہ ہے کہ اللہ یقیناً دے گا۔

آسیہ طارق۔ منڈی بہاؤالدین

جان لیجیے،

- اپنے آپ سے مت لڑیے۔ ٹوٹ جائیں گے۔ اپنے اندر روگ مت پالیے' اس دنیا میں آپ ایک ہی تو ہیں۔
- اگر کوئی آپ کو یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں' اصل چیز یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کرے۔
- جب آپ کے کسی بھی عمل سے دوسروں کی آنکھوں کے جگنو بجھ جائیں اور ان آنکھوں میں خوشیوں کے بجائے ویرانیوں کا بسیرا ہو جائے تو جان لیجیے کہ اس کی ویران اور بے نور آنکھوں سے آپ کے دل کی ویرانی کا راستہ شروع ہوتا ہے۔
- ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور اسی طرح ہر ساتھ رہنے والا آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔

ہر لفظ انمول،

- اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے' زیادہ بولنے والا انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔
- آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں ہوتا۔ مگر کبھی کبھار مفہوم وہ نہیں ہوتا، جو ہماری عقل سمجھتی ہے۔
- ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں، کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں' بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔
- اپنی چھوٹی چھوٹی فضول خرچیوں سے بچیں، کیونکہ ایک چھوٹا سا سوراخ بہت بڑے جہاز کو ڈبونے کی طاقت رکھتا ہے۔

مدیحہ، ندا۔ فیصل آباد

- ★ زندگی ایک ایسی ٹرین ہے، جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پر رکتی ہے۔ جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔
- ★ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔
- ★ کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں نبھاتے ہوئے پل صراط سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

فضہ۔ کراچی

عمل،

لفظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی بڑے بڑے لفظ بھی بے جان اور کھوکھلے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا عمل بھی بہت جاندار اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

سعدیہ سلیم۔ کراچی





موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مسالے دار بیسنی روٹی

اجزا :

بیسن	ایک پاؤ
آٹا	ایک پاؤ
تیل	دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	ایک چٹکی
پیاز	ایک عدد
ہرا دھنیا، پودینہ	آدھی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

پیاز، ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ پیس کر تیل، دہی اور بقیہ تمام اجزا کے ساتھ بیسن اور آٹا میں ملا کر گوندھ لیں۔ پیڑے بنا کر روٹی بیلیں اور گرم توے پر ڈالیں۔ ایک سائیڈ پک جائے تو صاف کپڑے سے سینکیں، پھر پلٹ کر دوسری سائیڈ بھی اسی طرح دبا دبا کر سینکیں، پھر ہلکا ہلکا گھی دونوں اطراف میں لگائیں۔ اچار، چٹنی اور رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

اسپیگیٹی پین پزا

اجزا :

اسپیگیٹی	آدھا پیکٹ
انڈے	چھ عدد
مکھن	آدھا کپ
لہسن پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

اسپیگیٹی ابال کر چھان لیں۔ انڈے پھینٹ کر اس میں نمک، کالی مرچ، لہسن پیسٹ، میدہ اور اسپیگیٹی مکس کردیں۔ فرائنگ پان میں مکھن پگھلا کر اسپیگیٹی کا آمیزہ ڈال کر پھیلائیں اور ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ پکائیں۔ سیٹ ہو جائے تو بڑی پلیٹ میں نکال کر ساس کے ساتھ پیش کریں۔

شیرہ لڈو

اجزا :

دودھ	ایک کپ
کنڈینسڈ ملک	آدھا کپ
گھی	چار کھانے کے چمچے
سوجی	چار کھانے کے چمچے
کشمش	دو کھانے کے چمچے
بادام	ایک کھانے کا چمچہ
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

گھی گرم کر کے سوجی براؤن کرلیں۔ دودھ میں کنڈینسڈ ملک ملا کر سوجی اور الائچی پاؤڈر شامل کردیں۔ چولہے پر چڑھا کر ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ دودھ مکمل طور پر خشک ہو جائے اور گھی سوجی سے الگ ہونے لگے۔ کشمش ڈال کر اچھی طرح مکس کردیں اور اتار کر لڈو بنالیں۔ کٹے ہوئے بادام چھڑک کر گرم اور ٹھنڈے دونوں صورتوں میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

روپہلی سنہری بریانی

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
باسمتی چاول	آدھا کلو
پیاز	تین عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ثابت ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
ہری مرچ	آٹھ عدد
ہرا دھنیا، پودینہ	آدھی گٹھی
دہی	آدھا کپ
کیوڑہ	چند قطرے
بریانی مسالا	ایک پیکٹ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
چاندی کے ورق	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک کپ

ترکیب :

قیمے میں (چکن کا بھی لیا جاسکتا ہے) ایک پیاز، باریک کتری ہوئی ادرک، آدھا ہرا دھنیا، چار ہری مرچیں، دو کھانے کے چمچے بریانی مسالا اور نمک ملا کر پیس لیں اور چھوٹی چھوٹی بالز بنا کر فرائی کر کے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر رکھ دیں۔

دوسری پتیلی میں تیل گرم کر کے بقیہ دو پیاز سنہری کر کے نکال لیں اور پیس لیں۔ اب اسی تیل میں ادرک، لہسن کا پیسٹ اور بقیہ بریانی مسالا دہی میں اچھی طرح پھینٹ کر شامل کریں اور خوب بھون لیں، پھر بالز ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ چاولوں کو نمک ملا کر ابال لیں، یوں کہ ایک کنی رہ جائے۔ الگ بڑی پتیلی میں بالز مسالے کی تہ لگائیں۔ پودینہ اور ہری مرچ



کتر کر ڈالیں اس کے اوپر چاولوں کی تہ لگادیں۔ زردے کا رنگ ذرا سے دودھ میں گھول کر چھڑک دیں اور کیوڑہ ڈال کر آدھا گھنٹہ ہلکی آنچ پر دم لگائیں۔ مزے دار روپہلی سنہری بریانی تیار ہے۔

چاکلیٹ شاہی ٹکڑے

اجزا :

بڑی ڈبل روٹی	چار سلائس
دودھ	دو پیالی
چینی	آدھی پیالی
کوکو پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ملک چاکلیٹ	پچاس گرام
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

سلائس کے تکون ٹکڑے کاٹ لیں اور ہلکی آنچ پر تھوڑے سے گھی میں فرائی کرلیں۔ ایک چھوٹے برتن میں ملک چاکلیٹ کو کوکو پاؤڈر اور دو کھانے کے چمچے دودھ ڈال کر ابلتے ہوئے پانی پر رکھ دیں۔ گرمائش سے چاکلیٹ پگھل کر مکس ہو جائے تو اتار لیں۔ ایک چوتھائی پیالی پانی میں چینی ملائیں اور پانچ منٹ تک پکا کر شیرہ بنالیں۔ فرائی کیے ہوئے سلائس دو سے تین منٹ کے لیے شیرے میں ڈبو کر نکال لیں۔ دودھ ابال کر اس میں چاکلیٹ والا آمیزہ ڈال دیں۔ کارن فلور کو علیحدہ سے دو کھانے کے چمچے ٹھنڈے دودھ میں گھول کر ابلے ہوئے دودھ میں ملادیں۔ چمچہ ہلاتے رہیں۔ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو شیرے میں ڈبو کر رکھے ہوئے سلائس پر لگادیں۔ چاکلیٹ شاہی ٹکڑے تیار ہیں۔



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ثمینہ طاہر بٹ ———— لاہور

اس تیغ ہوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے
اپنے ہی گھر میں بے در و دیوار ہم بھی تھے
دامن دریدہ تم ہی نہیں تھے فقط وہاں
بے آبرو کھڑے سرِ بازار ہم بھی تھے

اقرا محمد اشرف ———— حافظ آباد

میں سمجھا مری گھٹن مٹانے آیا تھا
وہ جھونکا تو دیا بجھانے آیا تھا

نورین ضیا ———— ساروکی گجرات

میں نے دل کی بات رکھی اور تو نے دنیا والوں کی
میری عرض بھی مجبوری تھی ان کا حکم بھی مجبوری
روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو
کچی مٹی تو مہکے گی، ہے مٹی کی مجبوری

ثانیہ عبدالغفور ———— للیانی

صحرا ہے میری ذات کہ جو مجھ سے ملا وہ
نزدیک تو آیا ہے، مگر کھو بھی گیا ہے

رخشندہ ———— جھنگ چوندہ

تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

طاہرہ ملک ———— پسرور

چند خوابوں کے عطا کر کے اجالے مجھ کو
کر دیا دنیا نے وقت کے حوالے مجھ کو
جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا
اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اجالے مجھ کو

نجمہ بخاری ———— مظفر گڑھ

تشنگی دل میں ہو محبت کی
لوگ دریا سے لوٹ جاتے ہیں
ایک تصویر بنتی جاتی ہے
ایک تصویر ہم بناتے ہیں

فائزہ، اقرا، آفرین ———— جام پور

کیوں اندھیرے نگل گئے اس کو
شہر میرا تو روشنی کا تھا
سایہ کس کا رفیق ہوتا ہے
چاند کا تھا، نہ چاندنی کا تھا

ثیبا گل ———— کراچی

عشق کی بازی تم جیتے یا ہار گئے
تم ہی کہو، کیا پورا قصہ لکھا جائے
قتل ہوئی ہے یوں تو کتنی بار انا
کیسے اپنے آپ پہ نوحہ لکھا جائے

عمارہ منیر ———— گوجرانوالہ

اسے جنون کہ صحرا میں کشتیاں اتریں
مجھے یہ شوق کہ پانی پہ گھر بناؤں گی
کچھ اس طرح سے بنی ہوں اس کا آئینہ
وہ مجھ سے کچھ نہ کہے گا، میں جان جاؤں گی

غزالہ ———— جھنگ

پھر اس کے بعد تو آنکھوں میں بس گیا وہ شخص
اگرچہ ہم نے اسے بے دلی سے دیکھا تھا

روحی بانو ———— سیالکوٹ

دستِ نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے

بنت فیض ———— ملتان

تو کبھی دیکھنا ان کی صبحوں کو محسن
کتنا روتے ہیں اوروں کو ہنسانے والے

زوباریہ خالد ———— لاہور

عشق ہارا ہے تو دل تھام کے کیوں بیٹھے ہو
تم تو ہر بات پہ کہتے تھے، کوئی بات نہیں

کوثر خالد ———— فیصل آباد

تیرے خیال میں کچھ ایسا گم رہا برسوں
میں اپنے آپ سے بھی مل نہیں سکا برسوں
کہیں وہ ذائقہ تحلیل ہی نہ ہو جائے
میں اس سے مل کے کسی سے نہیں ملا برسوں

میمونہ منشا ———— وہاڑی

ہجر لازم ہے تو پھر وصل کا وعدہ کیسا
یوں خزاں رت پہ بہاروں کا لبادہ کیسا
زخم دے کر نہ تم درد کی شدت پوچھو
درد تو درد ہے کم کیسا، زیادہ کیسا

انیلا ———— ڈہرکی

دلوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے بیکار جاتے ہیں

مقدس ظہور ———— فیصل آباد

ثابت ہوا کہ مجھ سے محبت نہیں رہی
وہ شخص میرے پاس سے ہو کر گزر گیا

مقدس رباب ———— چکوال

تعمیر کر رہا ہے محبت کا وہ حصار
میرے لیے خلوص کی زنجیر ہے بہت
بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

تمثیلہ اصغر ———— گجرات

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

فریحہ شبیر ———— شاہ نکڈر

ابھی تو زندگی کی عجب کہانی ہے
جس چیز کو چاہا وہ ہی بے گانی ہے
ہنستے ہیں دنیا کو ہنسانے کے لیے ورنہ
دنیا ڈوب جائے ان آنکھوں میں اتنا پانی ہے

صفیہ، صبا ———— عثمان والا

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا ہوں
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا ہے
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

مہر، ملائکہ گل ———— اورنگی ٹاؤن کراچی

پاس آ ہی گیا ترکِ تعلق اسے آخر
آنکھوں میں وہ پہلی سی ندامت نہیں رکھتا

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدر مرجان

بچھڑنا ہے تو الفاظ مت ڈھونڈو
ہمارے واسطے لہجہ ہی بہت ہے

ہمزہ، اقرا ———— کراچی

حوصلے بھی جواب دینے لگے
اس قدر اس نے آزمایا مجھے

بختاور ———— کراچی

شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
تبھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے موجوں کا سر جھک جاتا ہے
اور کشتی کو کشتی والے آپ ڈبونے لگتے ہیں

فاطمہ ———— کبیر والا

بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے بھی
کب تلک جیا جائے اور کیوں جیا جائے

حنا کنول ———— حویلی لکھا

اس کے رویے سے مجھ کو بس یہ معلوم ہوا ساغر
اسے دشوار لگتا ہے اب مجھ سے تعلق رکھنا

نوال افضل گھمن ———— گجرات

درد میٹھا ہو تو رک رک کے کسک ہوتی ہے
یاد گہری ہو تو تھم تھم کر قرار آتا ہے

زنیرہ ———— جھنگ

کٹے وقت جا بجا ہے عذاب ہیں، کسی خواب ہیں یا سراب ہیں
جو نظر سے گزر گیا، اسے یاد کرتا ہے ہر کوئی



شاعری سچ بولتی ہے

امبر خالد

سیکھے کوئی کاش تجھ سے حُسن گفتار
ہر بات کا ایک خوبصورت اظہار
یہ رنگ ادب کا، یہ روایت کا جادُو
جملوں میں سلیقے سے پروئے اشعار

شاعری جذبات واحساسات کو خوبصورت الفاظ میں پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعری اگر دلوں کی ترجمانی ہے تو دوسری جانب محض ایک تصوراتی تخیل اور اختراع بھی ہے۔

تمہیں صبح کہو کیسی لگی میری خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو
وہاں کون گھر میں ہے منتظر، جسے غم ہو دیر سویر کا
یہ مختصر سی رات ہے، اسے چاندنی میں گزار دو

شاعری کے میدان میں دن بدن وسعت اور جدّت آرہی ہے جو کافی خوش آئند بات ہے۔ ذاتی طور پر مجھے سید وصی شاہ، احمد فراز، ابن انشا کا کلام زیادہ متاثر کرتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی بہت سے شعراء ہیں جن کے کلام سے لطف اندوز ہوتی ہوں مگر سب سے زیادہ مجھے سید وصی شاہ کی شاعری متاثر کرتی ہے۔ ان کے کلام میں جو برجستگی اور تازگی ہوتی ہے وہ کسی اور کے کلام میں مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا مجموعہ کلام "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" میں موجود یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ شاید آپ کو بھی پسند آئے۔

دیوار پہ لرزہ ہے تو در کانپ رہا ہے
بچھڑے ہو تو اُجڑا ہوا گھر کانپ رہا ہے

تم آنکھ کی پُتلی میں چھپے سچ کو بھی تو دیکھو
مجرم تو نہیں ہے وہ اگر کانپ رہا ہے

ویران ہے اس درجہ تیرے بعد میرا دل
اس شہر میں آتے ہوئے ڈر کانپ رہا ہے

احمد فراز کی نظمیں بہت خوبصورت احساسات کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ متاثر کن ہیں جیسے کہ اُن کی یہ نظم "کنیز"۔

حضور آپ اور نصف شب میرے مکان پر
حضور کی تمام تر بلائیں میری جان پر

حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خاموش ہیں
حضور بولیے کہ وسوسے وبالِ ہوش ہیں

حضور مُنہ سے پیک بہہ رہی ہے صاف کیجیے
حضور آپ تو نشے میں ہیں، معاف کیجیے

حضور کیا کہا میں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں

حضور چھوڑیے ہمیں ہزار اور روگ ہیں
حضور جائیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

ابن انشا، فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد، پروین شاکر اور نوشی گیلانی کو تو آپ لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں مگر میں آج ایک نئے شاعر اسعد کی غزل آپ کے ذوق تک منتقل کروں گی جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

اُن کو جب بے نقاب دیکھیں گے
اک مہکتا گلاب دیکھیں گے

ان کا چہرہ کتاب جیسا ہے
پڑھ کر ہم یہ کتاب دیکھیں گے

رو برو میرے چاند ہے اب کے
آج ہم بے حساب دیکھیں گے

سایہ اُس وقت ڈھل چکا ہو گا
مڑ کر جب بھی جناب دیکھیں گے

چل کے اسعد آج تم دستک دو
کیا ہے ملتا جواب دیکھیں گے

اور اب اختتام کی جانب گامزن ہونے سے قبل اپنا مختصر سا تعارف۔

میرا نام امبر خالد ہے۔ پہلے امبر وحید خان ہوا کرتی تھی مگر چند سال قبل مسز امبر خالد کے نام میں ڈھل گئی اور اب ایک عدد اتنہائی شریر اور پیارے سے بیٹے کی مما بھی ہوں۔ اور میرے بیٹے کا نام "الینرے" ہے۔

شعرو شاعری سے شغف شادی سے قبل بھی تھا اور اب بھی یہ جذبہ دل میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے علاوہ میری ایک اور سرِفہرست ہابی مختلف میگزینز میں اپنی تحاریر ارسال کرنا بھی ہے۔

اس منفرد سے سلسلے کی ہمیشہ سے روایت رہی ہے کہ اختتامی پیراگراف میں عموماً بہنیں اپنا کہا ہوا کلام تحریر کرتی ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اپنا تو نہیں مگر اپنی عزیز از جان سسٹر نازش وحید خان کی ایک چھوٹی سی کاوش آپ سب بہنوں کی نذر کروں گی۔ نازش کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے اور اس کی اب تک کی تمام شاعری اپنے حلقہ احباب میں بے انتہا مقبول ہے اور رہی جناب میری بات تو میں نے زندگی میں پہلا اور آخری شعر کہا تھا جس پر میرا اتنا ریکارڈ لگایا گیا کہ زندگی میں شاعری کی جانب پہلا قدم اور وہ بھی اتنا غیر رومانی اور تب سے میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے کہ آئندہ شعر وغیرہ نہیں کہنا۔

وہ شعر کچھ یوں تھا۔

کبھی سائبان اُجاڑ کے، کبھی کفن کو پھاڑ کے
چل دیے وہ اطمینان سے گریبان جھاڑ کے

بس اب اتنا مسکرائیں نہیں ورنہ میں آپ سب سے ناراض ہو جاؤں گی۔ ویسے ہی میں بہت تمسخرانہ مسکراہٹیں اپنے ننھے سے دل پر جھیل چکی ہوں۔ خیر اب میں اصل موضوع کی جانب آتی ہوں۔ یعنی کہ نازش کی ذاتی غزل کی جانب۔ تو جناب ایڈیٹر صاحبہ! آپ سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سنسر کی قینچی چند منٹ کے لیے کسی غیر محفوظ مقام پر رکھ کر بھول جائیں اور تھوڑی سی حوصلہ افزائی کر دیں۔

کیا ہوا اگر پُر ملال و بے بس ہے بہت وہ
میں بھی تو یہاں بے قرار بہت ہوں

جو پوچھ لیں کبھی وہ میرا حال دوستو
کہہ دینا دُعا سے تیری میں بیمار بہت ہوں

نہ آنا ملنے تم کہ تمہیں زحمت ہو گی بے وجہ
مصروف کام میں اس اتوار بہت ہوں

★ ★ ★

قارئین بہنوں سے التماس ہے کہ وہ اپنے تبصروں میں میرے انتخاب کے بارے میں بھی ضرور رائے دیں کہ میرے منتخب کردہ اشعار اور غزلیں وغیرہ آپ کے دلوں تک رسائی پا سکے ہیں یا نہیں۔



تبصیر نشاط





سجن بے ایمان نکلا

ایک وقت تھا کہ اکثر کرکٹرز کرکٹ دیکھنے والی خواتین کے ساتھ ساتھ بیشتر اداکاراؤں کے دلوں کی دھڑکن بھی ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر بھارتی اداکاراؤں کو کھیل سے زیادہ پاکستانی کرکٹرز ہی بھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ٹیم کوئی میچ یا سیریز کھیلنے جب جب بھارت گئی، ہمارے کرکٹر کے لگائے ہوئے چھکے وہاں کے فلمی اسٹوڈیوز کی باؤنڈریز ہی میں جاکر گرے۔ سو اکثر کرکٹرز کے نام اداکاراؤں کے ساتھ جوڑے گئے۔ مثلاً "زینت اور عمران خان، رینا رائے اور محسن حسن خان، دیا مرزا اور شعیب اختر، سشمیتا سین اور وسیم اکرم وغیرہ وغیرہ۔

مگر جناب! یہ تو ماضی کی بات تھی۔ اب تو نیا دور ہے اور اس دور کے طور طریقے بھی اور ہیں۔ سو اس دور میں بات کرکٹرز سے امپائروں تک جا پہنچی ہے۔

بھارت کی ایک ابھرتی ہوئی خوبرو ماڈل لینا کپور نے ممبئی کے ایک پولیس اسٹیشن میں پاکستانی امپائر اسد رؤف کے خلاف تحریری درخواست جمع کرائی ہے کہ اسد رؤف نے لینا کپور سے شادی کا وعدہ کیا، مگر پھر مکر گئے۔ لینا نے مزید کہا کہ اسد رؤف نے انہیں فلیٹ دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ (اچھا تو اصل دکھ یہ ہے) لینا کے مطابق انہیں پتا ہے کہ اسد رؤف شادی شدہ ہیں اور انہوں نے کہا کہ اسد رؤف نے بتایا تھا کہ ہمارا مذہب ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ (اور یہ نہیں بتایا لینا جی! کہ ہندوؤں سے شادی کی اجازت نہیں دیتا؟) لینا کپور نے ثبوت کے طور پر اسد رؤف کے ساتھ اپنی تصویر بھی پیش کی ہے۔

اسد رؤف نے لینا کے الزامات سنے تو انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر "آؤٹ" کہا اور تحریری درخواست کو "نوبال" قرار دے دیا۔ اسد رؤف کا کہنا ہے کہ لینا ان کے پاس ایک پرستار کی حیثیت سے آئی تھیں اور ان سے بھارتی پروگرام "بگ باس" میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ (ائے ہے! تو اس اوٹ پٹانگ پروگرام کے بگ باس آپ ہیں اسد جی؟) اسد رؤف نے لینا کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا اعتراف کیا ہے۔ (ایسی تصویر بنوائی تھی تو اب بھگتیں)

(اردو شاعری کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں محبوب سب سے زیادہ ظالم اور ہرجائی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ (خود رقیب روسیاہ اور ظالم سماج سے بھی زیادہ۔) فلمیں دیکھیں تو وہاں بھی "متاثرین محبت" محبوب کے جور و جفا سہتے ہی نظر آتے ہیں، مگر کوئی

حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ بہت ہوا تو ایک گانا گالیا کہ۔

"دل لے کے مکر گیا ہائے! سجن بے ایمان نکلا۔"

دنیا میں بھی اکثریت کا یہی دستور ہے کہ شادی کا وعدہ کیا اور پھر مکر گئے۔ مگر لینا سے پہلے کسی متاثرہ شخص نے باقاعدہ شکایت درج نہیں کرائی تھی۔ اگر یہ دستور چل پڑا تو اخبارات میں اور شہر میں جا بہ جا دیواروں پر مختلف تھانوں کے اشتہارات لکھے نظر آئیں گے۔ جس کی سرخی ہوگی:

"محبوب صرف چند گھنٹوں میں آپ کے قدموں میں...")

مشکل

ان دنوں آپ ایک ڈراما سیریل دیکھ رہے ہوں گے جس میں کئی جوڑے نظر آرہے ہیں جو حقیقی زندگی میں بھی آپس میں میاں بیوی ہی ہیں۔ اس سیریل میں جہاں اکثر فنکار نہایت جم کر کام کررہے ہیں، وہیں ایک فنکار ایسا بھی ہے جو اکثر کام کرتے ہوئے خود جم سا جاتا ہے۔ پھر اسے ڈانٹ ڈپٹ سننے کو ملتی ہے۔ وہ اداکار ہیں فخر امام۔

فخر امام اداکارہ ثنا کے شوہر ہیں۔ وہ ڈرامے میں بھی ثنا کے شوہر کا رول ہی کررہے ہیں۔ حقیقی زندگی کا رول نبھانے پر فخر کو مشکل تو نہیں ہونی چاہیے تھی، مگر ہو رہی ہے۔ فخر امام نے اپنی مشکل کچھ یوں بیان کی ہے کہ "میں ڈرامے میں ثنا کے شوہر کا رول کررہا ہوں۔ میرے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں ثنا کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر بات نہیں کرسکتا۔ اس سیریل میں زیادہ تر سین ایسے تھے، جن میں مجھے ثنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اداکاری کرنی تھی۔ جب میں ایسے سین کرنے لگتا تو مکالمے بھول جاتا۔ جس پر مجھے ڈانٹ پڑتی تھی۔" (کس سے پڑتی تھی فخر جی! ڈائریکٹر سے یا ثنا سے؟)



گویا باقی فنکار تو واقعی اپنی حقیقی زندگی کا کردار ہی نبھا رہے ہیں، تاہم فخر امام کا کردار حقیقی ہونے کے باوجود بھی حقیقی نہیں۔ اس لیے فخر مشکل میں ہیں۔ (لیکن اگر یہ رول نبھاتے ہوئے سیریل ختم ہونے تک فخر کو ثنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادت ہوگئی تو پھر حقیقت میں ثنا مشکل میں ہوجائیں گی۔)

جیو شان سے

معروف فلمی اداکار شان صرف نام ہی کے شان نہیں، بلکہ ہماری فلموں کی واقعی شان سمجھے جاتے ہیں۔ شان نے انکشاف کیا ہے کہ بھارتی فلموں کے معروف ہیرو عامر خان نے شان کو اپنی مشہور زمانہ فلم "گجنی" میں ولن کے کردار کی پیش کش کی تھی۔ تاہم شان نے یہ پیش کش ٹھکرادی تھی۔ (عامر خان کی اس فلم سے زیادہ اس میں عامر خان کا ہیر اسٹائل مشہور ہوا تھا۔ عامر خان کو دیکھ کر پاک و ہند کے اکثر نوجوانوں بلکہ بچوں تک نے اپنے سروں میں کئی سڑکیں کھدوالی تھیں۔) شان نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ

"میں نے وہ رول اس لیے نہیں کیا کہ فلم میں ولن کو پاکستانی دکھانا تھا جو پاکستان کے خلاف کچھ کام بھی کرتا ہے۔ عامر خان مجھے کافی دنوں تک فون کرتے



رہے، مگر میں راضی نہیں ہوا۔"

شان نے مزید بتایا کہ

"میں نے عامر خان سے پوچھا کہ "آپ پنجابی زبان جانتے ہیں؟" جب عامر نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے انہیں پنجابی میں کہا کہ

"تسی انڈیا دے پہلوان او تے میں پاکستان دا پہلوان آں تے میں پیسے لے کے کشتی نئیں ہاراں گا۔"

(شان جی! اس کردار سے انکار کرنے کے لیے صرف یہ ہی وجہ کافی تھی کہ عامر خان آپ کو "ولن" کا کردار ادا کرنے کو کہہ رہے تھے جبکہ آپ ہماری فلموں کے "ہیرو" ہیں۔ تاہم آپ نے ثابت کردیا کہ آپ صرف فلموں کے ہی نہیں بلکہ واقعی ہیرو ہیں۔ آپ کو عامر خان سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ

"تسی انڈیا دے ہیرو او تے میں پاکستان دا ہیرو آں تے میں پیسے لے کے ولن دا رول نئیں کراں گا۔")

ضائع

پرانے وقتوں کی بات ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو نصیحتیں کرتے تھے۔

"پڑھو گے، لکھو گے، بنو گے نواب"

شاید اسی لیے اپنی شائستہ مزاج شائستہ واحدی کو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں، پھر وہ بڑی تو نہیں ہوئیں، تاہم ڈاکٹر ضرور بن گئیں۔ لیکن انہوں نے ابھی طب کی تعلیم حاصل کی ہی تھی کہ وہ شوبز کو پیاری ہو گئیں اور ایسی پیاری ہوئیں کہ اب وہ شوبز چھوڑنا بھی چاہیں تو شوبز انہیں چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا۔ شوبز کی دنیا میں اتنی والہانہ پذیرائی دیکھ کر اب شائستہ کو اپنے ان چھ سال کے ضائع ہونے کا افسوس ہوتا ہے، جو انہوں نے میڈیکل کالج میں گزارے تھے۔ وہ کہتی ہیں:

"مجھے میڈیکل کی پریکٹس نہ کرنے کا بالکل بھی افسوس نہیں ہے، بلکہ اپنے چھ قیمتی سال ضائع ہونے کا افسوس ہے۔"

یہ کہہ کر شائستہ نے حسب عادت قہقہہ لگایا گویا وہ مذاق کررہی تھیں۔ (مگر مذاق ہی مذاق میں دل کی بات بھی کہہ گئیں۔) تاہم پھر سنجیدگی سے کہا کہ:

"ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کی جاتی ہے۔ میں میزبان بن کر صبح سویرے اپنے پروگرام کے ذریعے لوگوں میں خوشیاں بانٹتی ہوں تو میرے خیال میں یہ بھی انسانیت کی خدمت ہی ہے۔" (مذاق کررہی ہیں ناں شائستہ جی... تو پھر انسانیت کی زیادہ خدمت وینا اور میرا کررہی ہیں کہ انہوں نے اپنے "فن" سے زیادہ لوگوں کو خوش کیا ہوگا... اگر کچھ لوگ اس "فن" کو انگریزی کا فن سمجھ رہے ہیں تو وہ بھی غلط نہیں کہ بعض لوگوں کا فن محض مذاق ہی تو ہوتا ہے ناں!)

کچھ ادھر ادھر سے

انقلاب حقیر مصلحتوں کے خس و خاشاک سے نہیں، عشق کی آتش تند و سرکش و بے باک سے پھوٹا کرتے ہیں۔ جب عشق جنوں بھی مصلحتوں کی بالکل مار لیں تو کون سی تبدیلی؟ کیسا انقلاب؟

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والوں نے کبھی پاکستان چھوڑنے کا سوچا تک نہیں۔ ایک فہمیدہ ریاض گئی تھیں، وہ بھی اپنی غلطی کا احساس کر کے واپس آگئیں۔ جبکہ قیام پاکستان سے اب تک لاکھوں مسلمانوں کی پاکستان آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ خدا کے لیے ناشکری نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو ناشکری پسند نہیں ہے۔

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

عدلیہ کی ساکھ کو "نقصان" اس ملک میں صرف آصف علی زرداری کو ہی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، کچھ اور لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو آصف علی زرداری کی طرح محض "ایک فرد" نہ ہوں۔

(نصرت جاوید۔ برملا)

اللہ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ جمہوریت رہتی ہے یا ڈکٹیٹر شپ، سسٹم رہتا ہے یا انارکی۔ اس کی اپنی ترجیحات ہیں اور وہ اپنی ترجیحات پر حساب لے گا۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

جنرل مشرف نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے فائدے کے لیے آئین کے بخیے ادھیڑ دیے لیکن ان عورت دشمن قوانین کو ہاتھ نہیں لگایا جن کے لیے حقوق انسانی کی تنظیمیں احتجاج کررہی ہیں۔

(زاہدہ حنا۔ نرم گرم)

امریکا نے حافظ سعید کے سر کی قیمت ایک کروڑ ڈالر طے کردی۔ امریکا کے اس اعلان پر پاکستان کے لبرل باشندے کیوں خاموش ہیں؟ کیا حافظ سعید صرف عالم دین ہونے کی بنا پر پاکستانی شہری نہیں رہتے؟

(زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)

ایک طالبہ کا کہنا ہے کہ "میں عافیہ صدیقی پر ایک فلم بنانا چاہتی ہوں۔ شاید مجھے بھی آسکر ایوارڈ مل جائے۔" میں اس معصوم بچی کو کیا سمجھاؤں کہ ایسے موضوعات مغرب کی منڈی میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ کوئی ایسا موضوع چنو جو وہاں کے بازار حصص میں اچھا بھاؤ رکھتا ہو اور اس بات کا خیال رکھو کہ تمہاری کہانی کی زد "اسلام اور پاکستان" پر پڑتی ہو، مغرب یا امریکا کے کسی طرز عمل کی توہین کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔

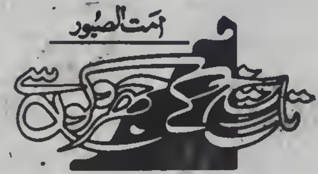
(نقش خیال۔ عرفان صدیقی)

پنجاب کے اردو پر بہت احسانات ہیں پنجاب میں نئے تجربات ہوئے۔ اردو کے تین اسکول ہیں، دکنی، لکھنوی اور دہلوی اسکول۔ اس فہرست میں پنجاب کو بھی ہونا چاہیے۔

(انور شعور)



امت الصبور



اصحاب سبت

(1100 قبل مسیح اندازاً")

سبت اور اس کی حرمت:

ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے "دین حنیف" یعنی اللہ کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحاق کے ذریعے قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے۔ اس لیے ان دونوں سلسلوں

میں "شعائراللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں۔ مگر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے جو بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیا علیہ السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدّد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملت ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔

مثلاً" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت الٰہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہود' بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لیے ہفتہ کا دن "عبادت" و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے' ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں۔

لیکن جب ان کا اصرار حد سے تجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرار بے جا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس ___ لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لیے ہفتہ کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں۔ ہم اس دن میں ان کے لیے خرید و فروخت' زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے' آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے مخصوصاً" اہل کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن ہم سب سے پہلے ان اہل کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی' سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہود کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد ہفتہ ہے اور نصاریٰ کا اس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔"

واقعہ کی تفصیلات

غرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے

مطلوبہ روز عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں اللہ کے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا' ان سے بچتے رہے مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی "جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے" خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بد عملی پر فخر کیا جانے لگا' تب اللہ کے عذاب نے

ان کو آپکڑا اور وہ ذلّت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھ روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھ دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے باآسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے۔ آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرت آمد سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔ اور

بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے' چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصین امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو' لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں۔ باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت و سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے' چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو

بھی ہوا اور انہوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت بہ بانگ دہل ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگی۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کمر ہمت چست کی اور ان کے مقابل آ کر ان کو اس بد عملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا۔

لیکن حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پروا ہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی تب اچانک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کر لی۔

رب تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعے مسخ کر دیا، قانون پاداش عمل کے مطابق اسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ "پاداش عمل از جنس عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے "کن" کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہو کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا، اس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اس نے ان سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراک عمل ختم کر دیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو ان پر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے۔

چنانچہ جس دن بد کرداروں پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے لہٰذا وہاں جا کر دیکھا تو صورت حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے، جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹتے اور اپنی حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔

سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ۔ "کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے؟" انہوں نے یہ سنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا۔

تعین مقام

قرآن عزیز، سورہ اعراف میں اس بستی کے بارے میں کہ جہاں یہ حادثہ گزرا صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر پر واقع تھی مگر مفسرین نے اس کے تعین میں متعدد نام لیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس کا نام متنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی۔ عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول رائج ہے۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام

جو قومیں رب تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کر دی جاتی ہیں۔ وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا

سلسلہ جاری نہ ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ "یہ بندر و خوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا۔ یہ جانور اللہ کی مستقل مخلوق ہیں لہٰذا جب رب کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انہوں نے اس درمیان کچھ کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا۔"

آدم علیہ السلام کی وفات اور بیٹے شیث علیہ السلام کو وصیت

"شیث" کا مطلب ہے "اللہ کا دیا ہوا تحفہ۔" آدم علیہ السلام نے ان کا یہ نام اس لیے رکھا تھا کہ ہابیل کے قتل ہو جانے کے بعد اللہ نے انہیں شیث عطا فرمایا۔

محمد بن اسحاق رحمتہ اللہ نے فرمایا۔ "جب آدمی علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اپنے بیٹے شیث کے حق میں وصیت کی۔ انہیں رات اور دن کے اوقات اور ان اوقات میں ادا کی جانے والی عبادات کی تعلیم دی اور انہیں بتایا کہ ایک طوفان آنے والا ہے۔

کہتے ہیں کہ آج کل جتنے انسان موجود ہیں، ان کا نسب شیث علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے دوسرے بیٹوں کی اولاد ختم ہو چکی ہے۔ (واللہ اعلم)

جب آدم علیہ السلام فوت ہوئے، اس دن جمعہ تھا۔ فرشتے اللہ کے پاس سے جنت کی خوشبو اور جنت کا کفن لے کر آئے اور ان کے بیٹے اور خلیفہ شیث علیہ السلام سے تعزیت کی۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا۔

"بیٹو! میرا جنت کے پھل کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

وہ تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں سامنے سے فرشتے آتے ملے، جن کے پاس آدم علیہ السلام کا کفن اور خوشبو تھی اور ان کے پاس کلہاڑے، کسیاں اور ٹوکریاں بھی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"آدم کے بیٹو! تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟" یا کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "ہمارے والد صاحب بیمار ہیں اور جنت کے میووں کی خواہش رکھتے ہیں۔"

فرشتوں نے کہا۔ "واپس چلے جاؤ، تمہارے والد تو فوت ہونے والے ہیں۔"

فرشتوں نے ان کی روح قبض کی، غسل دیا، کفن پہنایا، خوشبو لگائی، آپ کی قبر کھودی اور لحد تیار کی۔ پھر انہوں نے آدم علیہ السلام کی نماز جنازہ ادا کی، پھر انہیں قبر میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر انہوں نے کہا۔ "آدم کے بیٹو! تمہارے لیے یہی طریقہ ہے۔"

حضرت آدم علیہ السلام کہاں دفن ہوئے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مشہور ہے کہ انہیں ہندوستان (کے پاس سری لنکا) میں اس پہاڑ کے قریب دفن کیا گیا، جہاں انہیں جنت سے اتارا گیا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل ابی قبیس پر دفن کیا گیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے موقع پر ان کی اور حضرت حوا علیہ السلام کی میتوں کو ایک تابوت میں ڈال کر کشتی میں رکھ لیا تھا۔ پھر (طوفان ختم ہونے کے بعد) انہیں بیت المقدس میں دفن کر دیا۔

☆



ادارہ

خوبصورتی کے لیے

ماضی میں ہمارے ہاں کی خواتین اپنے چہرے کی دلکشی کے لیے قدرتی اجزا سے بنی ہوئی اشیا استعمال کرتی تھیں چنانچہ ان کی صحت و تندرستی اور حسن و شادابی بالکل نوجوانوں کی طرح برقرار رہتی تھی۔ اور ان کا چہرہ صاف شفاف اور تروتازہ رہتا تھا۔ عرقِ گلاب، لیموں کا رس استعمال کیا کرتی تھیں۔ بعد میں جدید طب نے ان دونوں چیزوں کو دلکشی اور جلد کی صحت کا ضامن قرار دیا۔ عرق گلاب انسانی جلد کے لیے بے حد مفید ہے۔ جلدی امراض کے ماہرین اسے کئی بیماریوں میں استعمال کراتے ہیں۔

☆ عرق گلاب جلد کی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ یہ جلد میں پانی کی صحیح مقدار قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس کی وجہ سے جلد ملائم، چمکدار اور ہموار رہتی ہے۔

☆ عرق گلاب جلد سے پانی کے غیر ضروری اخراج کو روکتا ہے۔ عموماً" گرمیوں کے دنوں میں جنہیں زیادہ پسینہ آتا ہے، عرق گلاب کا استعمال انہیں پسینے کی بدبو سے نجات دلاتا ہے۔

☆ چھائیوں سے نجات حاصل کرنے اور جلد کی رنگت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے عموماً" بازاری کریمیں استعمال کی جاتی ہیں، مگر جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر عرق گلاب کو ترجیح دیتے ہیں۔ چہرے کی خشکی اور جھریوں سے بچنے اور رنگت گوری کرنے کے لیے عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کا رس ملا کر استعمال کرنا مفید ہے۔

☆ گھریلو خواتین جن کے ہاتھوں کی انگلیاں کپڑے اور برتن دھونے سے کھردری ہو کر پھٹ جاتی ہیں اور ان میں زخم بن جاتے ہیں۔ ایسے میں گلیسرین اور عرق گلاب روزانہ تین چار مرتبہ استعمال کرنا بے حد مفید ہے۔

☆ بعض لوگوں کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ اگر وہ عرق گلاب اور گلیسرین کا مکسچر لگائیں تو ان کی یہ بیماری ختم ہو جائے گی۔

☆ عرق گلاب، زیتون اور شہد کے ساتھ مل کر جلد اور معدہ کے افعال بہتر بناتا ہے۔ خصوصاً" صرف عرق گلاب پینے سے قبض دور ہو جاتا ہے اور یہ انتڑیوں کو جراثیم سے پاک و صاف کرتا ہے۔

☆ سیاہ مرچ کو عرق گلاب میں پیس کر دانتوں پر اس کا لیپ کر دیا جائے تو درد سے فوراً" نجات مل جاتی ہے۔ جبکہ عرق گلاب میں سیاہ مرچ کو پکا کر اس کا ماتھے پہ لیپ کیا جائے تو سردی کا نزلہ دور ہو جاتا ہے۔

☆ ناخنوں پر دھبے پڑ جائیں تو عرق گلاب میں لیموں کے چند قطرے برابر ڈال کر ناخن دھو لینے سے دھبے اتر جاتے ہیں اور ناخنوں کی قدرتی چمک اور افزائش برقرار رہتی ہے۔

